خزاں ۱۹۹۶

آج

ترتیب: اجمل کمال

فروغ فرخ زاد | اسد محمد خاں | محمد انور خالد

اکرام اللہ | تھامس پالاکیل | اوستاد گھوش

نجیب محفوظ

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

کتب خانہ

پیپربیک سیریز

مطبوعات کے اس نئے سلسلے کا مقصد اردو میں معیاری ادب کے
کم قیمت پیپربیک ایڈیشنوں کے رواج کو زندہ کرنا ہے۔
کتب خانہ سیریز کے تحت کتابیں سیٹ کی صورت میں شائع کی جائیں گی۔
آٹھ کتابوں پر مشتمل پہلا سیٹ جون ۱۹۹۷ میں شائع ہوگا۔ پورا سیٹ
براہِ راست خرید نے والوں کو یہ آٹھ کتابیں صرف چار سو روپے میں دستیاب ہوں گی۔
ان کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

اردو فکشن

محمد خالد اختر

لالٹین اور دوسری کہانیاں

نیر مسعود

طاؤس چمن کی مینا

اسد محمد خاں

غصے کی نئی فصل

حسن منظر

سوئی بھوک

اردو شاعری

ثروت حسین

کاندھے پہ دھرے ساز

سعید الدین

رات

فکشن (ترجمہ)

صادق ہدایت

بوفِ کور

یادداشتیں

نسیم انصاری

جوابِ دوست

آج کی کتابیں
اے ۱۲۔، سفاری بالٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر۔ کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

ترجمے:
فہمیدہ ریاض
اجمل کمال

شمارہ ۲۳ خزاں ۱۹۹۶

ترتیب: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

خزاں ۱۹۹۶
اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۶

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:
اے ۱۶، سفاری پلازہ، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: ۸۱۳۴۷۴
ای میل: aaj@biruni.enum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:
محمد عمر میمن
۵۴۱۷، ریسنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

Scanned with CamScanner

ترتیب

فروغ فرخ زاد

۷

اے ستارو اے ستارو بوسہ یادِ گزشتہ

گنہ کیا میں نے جواب گزراں رُوے خاک

پائیز عاشقانہ جنون اندوہ پرست

اندوہِ تنہائی کوئی آرہا ہے

دوسرا جنم سبزواہمہ آیہ ہاے زمینی

اسد محمد خاں

۴۹

ایک سنجیدہ ڈیٹیکٹو اسٹوری

محمد انور خالد

۷۹

میں نے تحریر کیا

بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ ہرا جنگل ہے

اکرام اللہ

۸۱

ایک جنم اور

تھامس پالاکیل

۱۴۴

چاکلیٹ کی جنگ

***

امیتاو گھوش

۱۳۷

کمبوڈیا میں رقص

***

نجیب محفوظ

۱۵۳

شادیانے

(پہلا حصہ)

Scanned with CamScanner

فروغ فرّخ زاد

کلاسیکی اور جدید فارسی ادب سے گہری شناسائی رکھنے والے لوگ فروغ فرخ زاد کو حافظ شیرازی کے بعد فارسی شعر کی اہم ترین شخصیات میں شمار کرتے ہیں۔ فروغ فرخ زاد نے ۵ جنوری ۱۹۳۵ کو تہران میں جنم لیا۔ یہ زمانہ ایرانی معاشرے میں گہری اور دوررس تبدیلیوں کا تھا، اور فارسی ادب میں بھی تبدیلیوں کی ایک متوازی رَو جاری تھی۔ قاجار خاندان کی بادشاہی ختم ہو چکی تھی اور رضا شاہ نے تخت پر قبضہ کر کے ایران کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ ایرانی شعر کی کلاسیکی روایت حافظ کے کلام میں اپنے درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی اور اس کے بعد اس روایت کے مزید پھلنے پھولنے کے امکانات نہیں ملتے۔ علاوہ ازیں، ایران کی مغرب سے شناسائی معاشرے کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کر رہی تھی۔ ان تبدیلیوں کا اوّلیں اظہار نثری ادب میں محمد علی جمال زادہ کی کہانیوں، اور شاعری میں نیما یوشیج (۱۸۹۵ - ۱۹۶۰) کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان نظموں سے فارسی شعر میں ایک نئے طرزِ احساس کی بنیاد پڑی۔ یوشیج کو فارسی میں "شعرِ نو" کی تحریک کا بانی اور بنیادی نظریہ ساز بھی سمجھا جاتا ہے۔ نیما یوشیج سے متاثر ہونے والی اگلی نسل میں فروغ فرخ زاد کے علاوہ احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث اور سہراب سپہری بھی شامل تھے۔

تاہم، فروغ فرخ زاد کی اہمیت صرف شعرِ نو کی تحریک کا حصہ ہونے کے باعث نہیں۔ ان کی شاعری کی بے اندازہ قوت اور بے پناہ حُسن میں ان کی حساس، باشعور، خلّاق اور باغی شخصیت کو بہت دخل ہے۔ ایران کے روایتی پدرپرست معاشرے کے غیر منصفانہ پہلوؤں نے فروغ کی زندگی کو پُردرد بنایا لیکن ان پر شاعر کے جرأت مندانہ اور تخلیقی ردِ عمل نے ان نظموں کو زندہ اور متاثر کن خصوصیت بخشی۔ فروغ نے صرف ۳۲ برس کی عمر پائی اور ۱۳ فروری ۱۹۶۷ کو کار کے ایک حادثے میں جان دے دی۔ اس مختصر تخلیقی زندگی میں ان کی نظموں کے چار مجموعے شائع ہوئے: "اسیر" (۱۹۵۵)، "دیوار" (۱۹۵۶)، "عصیان" [بغاوت] (۱۹۵۸)، "توندی دیگر" [ایک اور جنم] (۱۹۶۴)۔ فروغ کی نظموں کا آخری مجموعہ "ایمان بیاوریم بہ آغازِ فصلِ سرد" [چلو آغازِ فصلِ سرد پر ایمان لے آئیں] ۱۹۷۴ میں شائع ہوا۔ اپنی موت سے کچھ پہلے فروغ فرخ زاد نے جدید فارسی شاعری کا ایک انتخاب بھی تیار کیا جو ۱۹۶۸ میں "از نیما تا بعد" کے عنوان سے چھپا اور جس میں نیما یوشیج، احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث، نادر نادرپور، سہراب سپہری اور سات دوسرے شاعروں کی نظمیں شامل تھیں۔

Scanned with CamScanner

فروغ فرخ زاد کی نظمیں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اردو میں بھی فروغ کی نظموں کے ترجمے مختلف رسالوں اور انتخابوں میں شامل ہوئے ہیں۔ تاہم، اگلے صفحات میں اردو کی ممتاز شاعرہ فہمیدہ ریاض کے کیے ہوئے ترجموں کا ایک مختصر انتخاب پیش کیا جا رہا ہے جو کئی اعتبار سے منفرد ہیں۔ فہمیدہ ریاض خود جدید اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں اور یہ ترجمے اردو میں فروغ فرخ زاد کے ایک نمائندہ انتخاب کا جُز ہیں جس کا مقصد اردو پڑھنے والوں کو فارسی زبان کی اس بے مثال شاعرہ کے کلام سے بھرپور طور پر متعارف کرانا ہے۔ یہ ترجمے نہ صرف فہمیدہ ریاض کی ترجمے کے فن پر دسترس اور نامانوس افکار کے اردو زبان میں خوب صورت اظہار کی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں بلکہ، ان خصوصیات سے بھی زیادہ، طرزِ احساس کی اس یک جہتی کے بھی شاہد ہیں جس کے بغیر فروغ فرخ زاد کی نظموں کو اس قدر کامیابی اور اصل سے وفاداری کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا ناممکن ہوتا۔ ان ترجموں پر مشتمل کتاب "زنِ تنہا"، عورتوں کے اشاعتی ادارے "وعدہ کتاب گھر" کے اہتمام سے شائع ہو گی۔

Scanned with CamScanner

فروغ فرّخ زاد

فارسی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

اے ستارو، اے ستارو

اے ستارو تم فرازِ آسمان سے
یوں نشیب کی طرف نگاہ سے اشارہ گر
اے ستارو ابر کے پرے سے یوں نظارہ گر

ہاں یہ مَیں ہوں مَیں کہ اِس سکوتِ شب کے درمیاں
نامے عاشقانہ پارہ پارہ کر رہی ہوں آج
اے ستارو تم اگر کرو ذرا مری مدد
دامن اُس کے غم میں پُرستارہ کر رہی ہوں آج

اُس کے دل میں جب وفا کی بُو ذرا رہی نہ ہو
جورِ بے کرانہ و بہانہ کیوں کروں نہ مَیں
اِن مصاحبانِ خود پسند کے کنار میں
نازو عشوہ ہائے زیرکانہ کیوں کروں نہ مَیں

Scanned with CamScanner

اے ستارو کیا ہوا، کیوں مری نگاہ میں
وہ نشاط و نغمہ و ترانہ ختم ہو گیا؟
اے ستارو کیا ہوا، اُن لبوں پہ کس طرح
اُس کا راگ، گرم و عاشقانہ ختم ہو گیا؟

بستر آب مرا تھی ہے، جام بادہ سرنگوں
سر رکھا ہوا ہے اُس کے عشقیہ خطوط پر
سر رکھا ہوا ہے درمیان ان سطور کے
جستجو کروں کہ کچھ نشان بھی وفا کا ہے

اے ستارو تم تو جانتے ہو، تم ہو آشنا
کتنے دور نے میں، پُر جفا ہیں ساکنانِ خاک
جا چھپے ہو کیا اسی لیے تم آسمان میں
اے ستارو، اے ستارو، اے ستارو خوب و پاک

میں کہ میری ٹھوکروں میں سارا ہست و بود تھا
تا کہ اُس کے ہونٹ اپنے عشق پر رو، کروں
مجھ پہ لعنتِ خدا ہو اس کے بعد اگر کبھی
عاشقانِ باوفا سے کچھ بجز جفا کروں

اے ستارو تم بھی گویا قطرے آنسوؤں کے ہو
دامنِ سیاہِ شب پہ اپنا سر دھرے ہوئے
اے ستارو اُس جہانِ جاودانی و پاک سے
اک دریچہ اس جہاں کی سمت کھولتے ہوئے

وہ چلا گیا، پہ عشق دل سے جا نہیں رہا
اے ستارو کیوں نہ اُس نے پھر سے میری چاہ کی؟
اے ستارو، اے ستارو، اے ستارو دو خبر
کچھ دیارِ عاشقانِ جاوداں کی راہ کی

بوسہ

اس نظر میں گناہ ہنستا تھا
چہرے پر گوریاہ ہنستا تھا
ان لبانِ خموش کی رہ میں
شعلۂ بے پناہ ہنستا تھا
شرم اور شدّتِ نیاز سے تنگ
ان نگاہوں سے جن میں مستی تھی
میں نے آنکھوں میں جھانک کر یہ کہا
عشق کا کچھ ثمر ملے گا کبھی؟

شب کی اس رازدار خلوت میں
ایک سائے پہ خم ہوا سایہ
سانس لرزی کسی کے چہرے پر
دو لبوں میں بھڑک اٹھا بوسہ

یادِ گزشتہ

شہر ایک رودِ پُر خروش کے کنار میں
اپنے باغ ورغ و نور بار شب سے پُر خروش
اور اس میں میرا دل
ہے اسیرِ دام ایک مردِ پُر غرور کا

رود کا کنار، جس نے اُس کے اور مرے لیے
اپنے بازوؤں کو کھول کر رکھا تھا سال ہا
جس کے ساحلوں پہ، جس کے کنج کنج کے تلے
اس نے میرے بوسہ ہائے لب چُرائے بارہا

ماہتاب ہے گواہ
میں نے اُس کے سنگِ دل کو اپنے سحرِ عشق سے
کیسے نرم کر دیا
ماہتاب جانتا ہے، اُس نگہ کی بے رُخی میں
اشکِ شوق کس طرح
جھلملا اٹھا

بے کراں سمندروں میں
ہم نے اک سفینے پر سفر کیا
نیم شب کی خامشی کو توڑ کر
اور ہماری بزم پر
کی نجوم نے نظر

طفل کی طرح مرے کنار میں جو سو گیا
میں نے اپنے لب رکھے تھے اُس کی بند آنکھ پر
طرق ہو گیا جو پیرہن مرا
اُس نے مہک کے دستِ آب سے سے چھڑا لیا

آہ آج میں وہی ہوں اور یہ خلوت و سکوت
شہرِ پُرخروش، تجھ کو یاد کر رہی ہوں میں
جس سے بستہ دل مرا ہے گو اُسے عزیز کہ
اُس کی یاد سے دل اپنا شاد کر رہی ہوں میں

گنہ کیا میں نے

گنہ کیا میں نے
گناہِ پُرلذت
اک اُس کنار میں جو گرم و آتشیں تھی بہت
اور ایسے بازوؤں میں
سلگ رہے تھے جو ظالم تھے، آہنیں تھے بہت

اندھیری خلوت میں
اندھیری اور خموش...
نظر ملی اس سے
نگاہ راز سے پُر
عجب نیاز سے پُر

اور ایسی خواہش سے
کہ بے قراری سے سینے میں دل مرا لرزا

میں اس کے پہلو میں بیٹھی رہی پریشاں سی
لبوں نے اُس کے لبوں پر مرے
ہوس چھڑکی
تو کیا ہوا مجھ کو
کہ میرے دل سے پریشانیِ زمانہ گئی

نہایت آہستہ
میں اس کے کان میں کہنے لگی فسانۂ عشق
تری تمنا ہے جاناں، تری تمنا ہے
تری تمنا ہے، آغوشِ جاں فزا تیری
تری تمنا ہے
اے مرے دیوانۂ عشق

ہوس سے اُس کی نظر میں بھڑک اٹھے شعلے
شرابِ سُرخ پیالوں میں رقص کرنے لگی
تھا نرم اک بستر
اور اُس کے سینے پر
افو کھی مستی سے میرا بدن لرزتا رہا

گنہ کیا میں نے
گناہِ پُرلذت

کبار پیکر لرزاں...
پیکر مدہوش
ربِ خدا! مجھے کیا علم کیا کیا میں نے
اندھیری خلوت میں
اندھیری اور خموش

جواب

ہم پر خدا نے کی ہے تبسم بھری نگاہ
ہر چند ہم نے اس کی نہ کی اختیار راہ
لیکن فریب و مکر سے مانندِ زاہداں
چھپ کر خدا کی آنکھ سے کرتے نہیں گناہ

پیشانی اپنی داغِ گنہ سے سیہ سہی
لیکن نمازِ مکر کے داغوں سے ہے رہا
نامِ خدا کبھی بھی نہ لیں، بہتر اس سے ہے
بہرِ فریبِ خلق رٹیں گر "خدا خدا"

کیا غم ہمیں کہ شیخ نے کل شب بصد خوشی
ہم پر درِ بہشت اگر بند کر دیا
وہ کھول دے گا، وہ، کہ بصد لطف اور صفا
غم جس نے اپنی خاک کی طینت میں بھر دیا

طوفانِ طعنہ اپنے ترنم سے تھم گیا
ہم کوہ ہیں، میانۂ دریا نشستہ ہیں
دل میں چھپا ہے گوہرِ یکتائے راستی
ہم موجِ حادثات میں تنہا نشستہ ہیں

وہ آگ جس کے شعلے ہمارے دلوں میں ہیں
چنگاری اس کی شیخ کے دامن پہ گر گرے
ہم کو، کہ سوختہ ہیں شرارانِ عشق کے،
تاہم گناہ گار و رُسوا کبھی نہ دے

جانے دو گر ہمارے لیے طعنہ زن ہے خلق
سنتے رہو فسانۂ عشقِ مدامِ ما
"ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

گزراں

کب تلک چلے کوئی
کب تلک کرے تلاش
اک دیار دوسرا
پھر دیار دوسرا

میں نہ ڈھونڈ پاؤں گی

بار بار، ہر دفعہ
کوئی عشق دوسرا
کوئی یار دوسرا

کاش ہوتے ہم پرند
اور اپنی منزلیں
ساری عمر، ساری عمر
ایک مرغزار سے
مرغزار دوسرا

جانے کب سے تیرگی
برس رہی ہے ابر سے
گھل رہی ہے ہر خیال و خواب میں
میرے لب پہ تیرے بوسے
اس طرح، اس طرح
دھیرے دھیرے جیسے جل ہو لٹا

عشق غم زدہ مرا
کانپتا ہے خوف سے زوال کے کچھ اس طرح
کانپتی ہے میری ساری زندگی
دیکھتی ہوں جب تجھے
دیکھتی ہوں گویا کہ دریچے سے
اک درخت پُربہار
جو خزاں کی زد میں ہے

روے آب پر رواں کوئی نقش جس طرح
روز و شب
روز و شب
روز و شب

ٹھہر، بھول جاؤں میں
کیا ہے تُو
صرف ایک لمحہ، جو مری نظر
بسطِ آگہی کی سمت کھول دے؟
ٹھہر، بھول جاؤں میں

روے خاک

آرزو نہ میں نے کی
اک ستارہ بن سکوں سرابِ آسمان میں
برگزیدگاں کی روح کی طرح
ہم نشیں بنوں فرشتگان کی
ہر کرن اس زمین سے جدا نہیں ہوئی کبھی
میں ستاروں کی تو آشنا نہیں ہوئی کبھی

خاک پر بکھری ہوئی ہوں
سبز گھاس کی طرح
چوستا ہے میرا تن

بادو آفتاب و آب
زندگی کے واسطے

بارور ہوں آرزو سے
بارور ہوں عشق سے
خاک پر کھڑی ہوں میں
تا کہ تارے آسمان پر کریں ستائشیں
مجھ پہ ہوں نسیم کی نوازشیں

کھول کر دریچہ دیکھتی ہوں جب
جانتی ہوں
جُز صدائے یک ترانہ میں نہیں
جاودانہ میں نہیں

جُز صدائے یک ترانہ آرزو بھی کی نہیں
لذتِ سکوتِ غم سے پاک تر ہے یہ فغاں
میں بناؤں آشیانہ، جستجو بھی کی نہیں
میرے جسم کے تنے پہ
ایک تن ہے شبنمیں

میرے گھر کی اِس جُدار* پر جو میری زندگی ہے
عشق کے سیاہ خط سے
نقش کر چکے ہیں اپنے یادگار

---

*جُدار: دیوار

رہروانِ رہگزار
تیر کھائے قلب، شبِ وارثگون
حرفِ دربہم جسوں
اور ان پہ نکتہ ہائے ساکت و پریدہ رنگ

میرے لب تک آئے جب کسی کے لب
نطفہ اک ستارے کا
ان سے بارور ہوا
میری رات میں چمک رہا ہے جو
رودِ یادگار پر
پس تو کس لیے ستاروں کی میں آرزو کروں

یہ ترانہ ہے مرا
دل پذیر، دل نشیں
اس سے قبل، اس سے بڑھ کے کچھ ہوا نہیں

پائیز *

سوندی میں میں نے غم سے بھری آنکھیں
افسوں شعار چہرۂ فطرت پر
دیکھوں نہ جلوہ حسرت و ماتم کا
آئے نظر نہ مجھ کو تری صورت

---

* پائیز: خزاں

Scanned with CamScanner

پائیز، اے مسافرِ خاک آلود
دامن میں چیز کیا ہے نہاں تیرے
کچھ برگِ خشک و مُردہ تری ثروت
سرمایہ اور پاس کہاں تیرے

جز غم دیا ہے کیا دلِ شاعر کو
تیرے غروبِ تیرہ و ساکت نے
جز سردی و ملال نہیں بخشا
اس جانِ دردمند کو کچھ گو نے

تیرا سکوت غم کو بڑھاتا ہے
آزار دے رہا ہے غمِ خفتہ
اُلجھے ہوئے خیالوں میں رقصاں ہے
وہ آرزو کہ اب ہوئی گم گشتہ

پائیز، اے سرودِ خیال انگیز
پائیز، اے ترانۂ محزن پرور
پائیز، اے تبسمِ افسردہ
افسوں شعار چہرۂ فطرت پر

عاشقانہ

اے کہ شب رُخ سے ترے رنگین ہے
سینہ تیرے دَم سے عطر آگین ہے
اے کہ تُو ہے، تُو، مری نظروں کے پیش
کم دیے غم، مجھ کو خوشیاں دی ہیں بیش
جس طرح دھوتی ہے بارش جسمِ خاک
کر دیا آلودگی سے مجھ کو پاک

تُو تپش بن کر تنِ سوزاں میں ہے
بن کے آتش سایۂ مژگاں میں ہے
آہ، گندم زار سے سرشار تر
شاخِ زرّیں سے کہیں پُربار تر
اے کھلے در چہرۂ خورشید پر
اے ہلاکت ظلمت و تردید پر
ساتھ تیرے درد کی سختی نہیں
ہے اگر، جز دردِ خوش بختی نہیں

یہ مرا تاریک دل اور اتنا نور؟
زندگی کے بیچ اور قعرِ گور؟

آہ آنکھیں تیری میرا باغ ہیں
بن کے تیری مُہر مجھ پر داغ ہیں
پہلے ہوتا تُو اگر اس سینے میں

غیر کو میں "تُو" سمجھتی کس لیے

ہے اذیّت خاک در در چھانکنا
پیش کرنا خود کو، ہر در جھانکنا
تیرہ دل سوتوں پہ رکھنا اپنا سر
کر رہا ہو جب کہ کینہ دل میں گھر
ہر نوازش میں چھپا ہو قہرِ یار
مسکراہٹ میں ملا ہو زہرِ مار
اپنا زر رکھنا کفِ طرار میں
اور بھٹکنا وسعتِ بازار میں

آہ تو جو ہے مری جاں کی مثال
قبر سے میری مجھے لایا نکال
تو ستارہ ہے، ترے پَر زرفشاں
تجھ کو لایا گویا دستِ آسماں
میری تنہائی کو خاموشی ملی
جسم کو بوسے ہم آغوشی ملی
جُوئے خشکِ سینہ میں ہے آب تو
ہے رگوں کی پیچ پر سیلاب تو
اب چلوں گی اس جہاں میں دم بہ دم
تیرے قدموں سے ملا کر میں قدم

آہ، زیرِ جلد یوں پنہاں ہے تو
خون بن کر جلد میں جوشاں ہے تو

بال سلگائے ہیں اپنے لمس سے
گال دہکائے ہیں خواہش سے مرے
پیرہن سے میرے اے نا آشنا
صرف اِس شاداب تن سے آشنا
آہ، اے روشن طلوعِ بے غروب
آفتابِ سرزمینِ بامِ جنوب
آہ، تُو ہے صبح سے شاداب تر
بارشوں سے تازہ تر، سیراب تر
عشقِ تازہ پہ نہیں، ہے غیر گی
یہ چراغاں! کیا ہوئی وہ تیرگی؟
عشق جب سے سینے میں بیدار ہے
میری ہستی سر بہ سر ایثار ہے

نہیں نہیں، یہ نہیں نہیں، کچھ اَور ہے
حیف اُن برسوں پہ جو تنہا کٹے
میرے لب منزل گہِ بوسہ ترے
دیدہ و دل جن کے فرشِ راہ ہیں
اے تشنج لذتوں کے جسم میں
خط ترے تن کے مرا ملبوس ہیں
جاگتی ہوں مثلِ غنچہ پُھوٹتا
یک بہ یک دل پر یہ کیا سایہ پڑا
جی میں آتا ہے کہ یک دم اٹھ کے جاؤں
اور بادل کی طرح آنسو بہاؤں

یہ مرا دلِ تنگ اور یہ دودِ عُود
یہ خموشی اور شورِ چنگ و رُود

ہے نگہ تیری وہ لوری سحر بار
سو گئے گہوارے میں طفلِ بے قرار
ہیں نفس تیرے نسیمِ نیم خواب
دھو دیا ہستی سے سارا اضطراب
سو رہا ہے مسکراہٹ میں تری
میرا فردا اور کل دُنیا مری
عشق کی بھڑکے جو آتش اس طرح
ہو نہ جائیں شعر شعلے کس طرح

جنون

دلِ گُم راہ کیا کرے گا مرا
اُس بہاراں سے جو کہ راہ میں ہے
اُس شگوفے سے، لے رہا ہے جو رنگ
اور ابھی شاخِ سیاہ میں ہے

دلِ گُم راہ کیا کرے گا مرا
ان ہواؤں سے جن میں ہیں رقصاں
بُوئے عشقِ کبوترِ وحشی
نفسِ عطرہائے سرگرداں

Scanned with CamScanner

میرے لب پر ترانہ جلتا ہے
اور دلِ عاشقانہ جلتا ہے
جلد میں پڑ گئے نمو سے شگاف
سارا تن والہانہ جلتا ہے

میں مچلتی ہوں موج کی مانند
جا رہی ہوں کہیں، یہاں سے دور
کہیں شاخوں میں گر چھپا خورشید
سرِ رہ آ گئی کرن بن نور

جوں شگوفے کی شرم سے لبریز
ہے کہیں یارِ سی، بہارِ سپید؟
بوسہ گر اس بہار میں بھی نہ دے
وہ نہیں یارِ سی، بہارِ سپید!

وحشتِ بے تاب، شبنم آلودہ
میرا محبوب کس کو مانتا ہے؟
سبزہ ہے کس لیے خوش خوش
جو مرا یار ہے وہ جانتا ہے!

آسماں اپنے آپ میں نہ رہا
اب جہاں میں سما نہیں سکتا
آہ، گویا کہ اتنا سارا نیل
آسماں میں سما نہیں سکتا

Scanned with CamScanner

اے بہار، اے بہارِ افسوں گر
میں سراپا خیال ہوں اُس کا
شعر و فریاد و آرزو ہوں مَیں
اور یہ تیرے جنوں میں حال ہوا

سبزۂ سرد و تازہ و نم پر
میرا تن کس طرح ہے بل کھاتا
آہ، ایسا خروش، اتنا جوش
دلِ گم راہ کیا کرے گا را

اندوہ پرست

کاش مَیں پائیز ہوتی، کاش مَیں پائیز ہوتی
کاش مَیں پائیز سی خاموش و غم آمیز ہوتی
آرزو کے برگ میرے
ہو گئے ہیں زرد
اور مری آنکھوں کے سورج، سرد

آسمانِ سینہ ہے پُر درد
ناگہاں، اندوہ کے طوفاں نے جاں میں چنگ چھیڑا
آنسوؤں نے مثلِ باراں
رنگ چھیڑا
آہ، گر پائیز ہوتی

وحشی وپرشور و رنگ سبز ہوتی
پڑھ رہی ہے شاعری آنکھوں میں شعرِ آسمانی
میرے پہلو میں دلِ عاشق کے شعلے
اور شرارِ آتشِ دردِ نہانی

میرا نغمہ:
جیسے آوازِ نسیمِ پَر شکستہ
عطرِ غم جیسے چھڑکتا ہو دلوں پر جو ہیں خستہ
سامنے ہے:
چہرۂ تلخِ زمستانِ جوانی
عقب میں:
آشوبِ تابستانِ عشقِ ناگہانی
سینہ ہے:
منزل گہِ اندوہ و درد و بدگمانی

کاش میں پائیز ہوتی...
کاش میں پائیز ہوتی...

اندوہِ تنہائی

برف باری ہو رہی ہے
برف باری ہو رہی ہے
پار شیشے کے —

Scanned with CamScanner

اس خموشی میں، مرے دل میں
بو رہا ہے ہاتھ کوئی
درد کے دانے

موسمِ سرد آخر ہوئی اے برف!
تا کہ میرا دیکھ لے الہام
گر رہی ہے کیوں فقط دل پر
قبر پر میری نہیں کیوں کر رہی آرام

روح لرزاں ہے مری مثلِ نہال
آہ یہ سرمائے تنہائی
دل کی تاریکی سے اُبھری آ رہی ہے
وحشتِ دنیائے تنہائی

تو بھی اب گرمی نہیں دیتا
عشق، اے خورشیدِ یخ بستہ!
سینہ ہے صحرائے نومیدی
خستہ ہوں میں
عشق سے بھی ہو چکی خستہ

خشک تیرا بھی ہوا خنجر
شعر، اے شیطانِ افسوں کار
آخرش اس خوابِ درد آلود سے
جان من، بیدار ہو بیدار

بعد اُس کے جس طرف دیکھا
صرف پایا ایک افسونِ سراب
کیوں کیا اُس کا تعاقب آہ
وہ کہ نکلا نقشِ خواب

اے خدا اب بخش دے مجھ کو
لمحہ بھر آسائشِ دوزخ
تا بہ کے دل میں چھپا رکھوں
حسرتِ گرمائشِ دوزخ

بعد اُس کے اَور کیا ڈھونڈوں
بعد اُس کے اَور کیا پاؤں
تا بہ کے برساؤں اشکِ سرد
تا بہ کے بس قبر کو چاہوں

برف باری ہو رہی ہے
برف باری ہو رہی ہے
پار شیشے کے ــــ
اس خموشی میں، مرے دل میں
ہو رہا ہے ماتم کوئی
درد کے دانے

کوئی آرہا ہے

میں نے خواب دیکھا ہے کہ کوئی آرہا ہے
میں نے خواب میں ایک قرمزی ستارہ دیکھا ہے
اور میری پلک پھڑکتی رہتی ہے
اور میرے جوتے پر جوتا چڑھ جاتا ہے
میں اندھی ہو جاؤں
اگر جھوٹ بولوں

اس قرمزی ستارے کا خواب
میں نے اُس وقت دیکھا ہے جب میں سو نہیں رہی تھی
کوئی آرہا ہے
کوئی آرہا ہے
کوئی دوسرا
کوئی بہتر
کوئی جو کسی جیسا بھی نہیں
الٰہی جیسا نہیں
یحییٰ جیسا نہیں
ماں جیسا نہیں
وہ ویسا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا
اور اس کا قد معمار کے گھر کے درختوں سے بلند تر ہے
اور اس کی صورت
امام زماں کی صورت سے روشن تر
اور سید جواد کے بھائی سے بھی وہ نہیں ڈرتا

جس نے جا کر
پولیس کی وردی پہن لی ہے
اور سیّد جواد تک سے، کہ ہمارے گھر کے تمام گھر سے
جس کا مال ہیں، نہیں ڈرتا
اور اس کا نام ایسا ہے جیسا میری ماں
نماز کے آغاز میں لیتی ہے
اور انجام میں
یا وہ قاضی القضات ہے
یا وہ حاجی الحاجات ہے
اور وہ پڑھ سکتا ہے
تیسری جماعت کی کتاب کے
سارے مشکل مشکل لفظ
آنکھیں بند کر کے
اور لغی کر سکتا ہے بیس ملین سے ہزار کی
کمی پڑے بغیر
اور اُدھار خرید سکتا ہے جتنا چاہے
سیّد جواد کی دکان سے
اور وہ ایسا کام کر سکتا ہے
کہ "اللہ" کا لیمپ،
جو سبز تھا، مانند صبحِ سرسبز تھا
مسجدِ مفتاحیان کے آسمان پر
دوبارہ روشن ہو جائے
اُف...
روشنی کس قدر اچھی ہے

روشنی کس قدر اچھی ہے
اور میں کس قدر چاہتی ہوں کہ
یحییٰ کے پاس ایک چھکڑا ہوتا
اور ایک چھوٹی سی لالٹین
اور میرا دل کتنا چاہتا ہے
یحییٰ کے چھکڑے پر تربوز اور خربوزوں
کے ڈھیر پر بیٹھ کر
میدانِ محمدیہ میں سواری کروں
اُف...
میدانِ محمدیہ میں چکر لگانا کتنا بھلا ہے
اور چھت پر سونا کتنا بھلا ہے
اور باغِ ملی میں سیر کرنا کتنا بھلا ہے
اور پیپسی کا مزہ کتنا بھلا ہے
اور فردین کے سنیما کتنے بھلے ہیں
اور ان سب اچھی چیزوں سے میں کس قدر خوش ہوتی ہوں
اور میرا دل کتنا چاہتا ہے
کہ سید جواد کی بیٹی کے بال پکڑ کر کھینچوں

میں اتنی چھوٹی کیوں ہوں
کہ سڑکوں پر کھو جاؤں؟
اور ابا اتنے چھوٹے کیوں نہیں
کہ سڑکوں پر کبھی نہ کھوئیں؟
اور وہ ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے
کہ وہ، جسے میں نے خواب میں دیکھا ہے،

ذرا جلد آ جائے
اور قصاب خانے کے پڑوس میں لوگ ــــ
جن کے باغیچوں کی خاک خونم خون ہے
اور حوضوں کا پانی بھی خونم خون ہے
اور جوتوں کے تلے بھی خونم خوں ہیں ــــ
ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟
ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟
سرما کا آفتاب کس قدر کاہل ہے
میں نے چھت کی سیڑھیوں پر جھاڑو دی ہے
اور کھڑکیوں کے شیشوں کو بھی دھویا ہے
ابا کیوں صرف سوتے میں خواب دیکھ سکتے ہیں؟
میں نے چھت کی سیڑھیوں پر جھاڑو دی ہے
اور کھڑکیوں کے شیشوں کو بھی دھویا ہے

کوئی آ رہا ہے
کوئی آ رہا ہے
کوئی، جو اپنے دل میں ہمارے ساتھ ہے، اپنے سانسوں میں
ہمارے ساتھ ہے، اپنی صداؤں میں ہمارے ساتھ ہے
کوئی ــــ جس کی آمد کو روکا نہیں جا سکتا
جسے ہاتھ باندھ کر زنداں میں نہیں پھینکا جا سکتا
کوئی، جو یخبی کے پھٹے پرانے کپڑوں کے نیچے
پیدا ہوا ہے
اور روز بہ روز
بڑا ہوتا جا رہا ہے،

آور بھی پڑا...

کوئی، بارش میں سے، بارش کی جھر جھر میں سے،
اور اطلسی پھولوں کی سرگوشیوں میں سے،
توپ خانے کے آسمان میں سے
آتش بازی کی رات کو آرہا ہے

اور دستر خوان بچھا رہا ہے
اور روٹی کو تقسیم کر رہا ہے
اور پیپسی کو تقسیم کر رہا ہے
اور باغِ ملی کو تقسیم کر رہا ہے
اور کالی کھانسی کے شربت کو تقسیم کر رہا ہے
اور ناموں کے اندراج کو تقسیم کر رہا ہے
اور اسپتال کے بستروں کے نمبروں کو تقسیم کر رہا ہے
اور ربڑ کے بوٹوں کو تقسیم کر رہا ہے
اور فردین کی فلموں کو تقسیم کر رہا ہے
اور سید جواد کے بیٹی کے درختوں کو تقسیم کر رہا ہے
اور جو کچھ نہ بِک سکا اُسے تقسیم کر رہا ہے
اور ہمیں بھی ہمارا حصہ دے رہا ہے

میں نے خواب دیکھا ہے...

دوسرا جنم

میری کل ہستی ایک آیۂ تاریک ہے
جو اپنے اندر تمھاری تکرار کرتی ہوئی
تمھیں اس ابدی سحرگاہ تک لے جائے گی
جہاں غنچے شگفتہ ہوتے رہتے ہیں
اور کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں
میں نے اس گیت میں تمھیں آہ میں کھینچا ہے، آہ
میں نے اس گیت میں تمھیں
درخت و آب و آتش سے پیوند کیا ہے

زندگی شاید
ایک طویل سڑک ہے
جس پر کوئی عورت ہر روز
ایک ٹوکری اٹھائے گزرتی ہے
زندگی شاید ایک رسی ہے
جس سے کوئی شخص خود کو لٹکا لیتا ہے
زندگی شاید کوئی بچہ ہے
جو مدرسے سے واپس آرہا ہے
زندگی شاید
دو ہم آغوشیوں کے درمیان
سست فاصلوں میں
سگریٹ کا سلگانا ہے
یا کسی حواس باختہ راہ رو کا راستا پار کرنا

Scanned with CamScanner

جو سر سے کلاہ اُٹھا کر، بے معنی ہنسی کے ساتھ
کسی دوسرے راہ رو کو
"صبح بخیر" کہہ رہا ہے

زندگی شاید وہ لمحۂ مسدود ہے
جس میں میری نگاہیں
تیری پُتلیوں میں خود کو ویران کرتی ہیں
اور اس میں یہ احساس
کہ میں چاند کے ادراک
اور ظلمت کی دریافت کی
ان میں آمیزش کر دوں گی

اس کمرے میں جو ایک تنہائی بھرے ہے
میرا دل،
جو ایک عشق بھرے ہے،
اپنی خوش بختی کے سادہ سانے ڈھونڈتا ہے
گل دان میں پھولوں کے مُرجھانے کے حُسن میں
اس پودے میں جو تم نے ہمارے گھر کے باغ میں لگایا تھا
اور ان زرد بلبلوں کی آواز میں
جو ایک دریچہ بھر گیت گا رہی ہیں

آہ،
میرا حصہ بس اتنا ہے
میرا حصہ بس اتنا ہے

میرا حصہ

آسماں ہے جب، ایک پردے کا آویزاں کرنا ہی مجھ سے چھین لیتا ہے
میرا حصہ ایک متروک زینے سے نیچے اترنا ہے
اور کسی شے کی بوسیدگی اور بے کسی سے وصل کرنا
میرا حصہ یادوں کے باغ میں اُداس پھرنا ہے
اور اس صدا کے اندوہ میں جان دینا جو سنتی ہے:

"میں تمہارے ہاتھوں سے پیار کرتا ہوں"
میں اپنے ہاتھوں کو باغیچے میں بو رہی ہوں
میں سیر ہو جاؤں گی، میں جانتی ہوں، جانتی ہوں، جانتی ہوں
اور بابیلیں میری روشنائی بھری انگلیوں کے گڑھوں میں
تخم ڈال جائیں گی
میں اپنے دونوں کانوں میں
چیری کے دو ہم زاد شگوفوں کے آویزے پہن رہی ہوں
اور اپنے ناخنوں پر
گلِ کوکب کی پتیاں چسپاں کر رہی ہوں

ایک کوچہ ہے، کہ جس میں
لڑکے، جو مجھ پر عاشق تھے، اب بھی
ویسے ہی پریشاں بال، پتلی ٹانگیں اور گردنیں لیے
ایک لڑکی کا معصوم تبسم یاد کرتے ہیں
جسے ایک شب
ہوا اپنے ساتھ اُڑا لے گئی

وہ کوچہ اب بھی ہے، جسے میرا دل
بچپن کے محلوں سے چُرا لایا ہے

وقت کی لکیر پر مادّے کا سفر
وقت کی خشک لکیر کو مادّے سے حامل کرنا
مادّہ اس تصویر سے آگاہ
جو ایک آئینے کا مہمان رہ کر ٹوٹ رہا ہے

اور اسی طرح ہوتا ہے
کہ کوئی مر جاتا ہے
اور کوئی رہ جاتا ہے

کوئی صیاد ایسی جُوئے حقیر سے
جو کسی گڑھے میں جا گرتی ہو،
مروارید نہیں پکڑ سکتا

میں ایک چھوٹی سی غمگین پری کو جانتی ہوں
جو ایک سمندر میں رہتی ہے
اور اپنے دل کو ایک چوبی نے پر
آہستہ آہستہ گاتی رہتی ہے
وہ چھوٹی سی غمگین پری
ہر رات ایک بوسے سے مر جاتی ہے
اور صبح دم
ایک بوسے سے زندہ ہو جائے گی

سبز واہمہ

دن بھر میں آئینے میں روتی رہی ہوں
بہار نے میرے دریچے کو
درختوں کے سبز واہمے کے سپرد کر دیا تھا
میرا بدن اس تنہائی کے خول میں نہیں سماتا
میرے کاغذی تاج کی بُو نے
اس بے آفتاب قلمرو کی فضا کو
آلودہ کر دیا ہے

مجھ میں سکت نہیں، اب دوبارہ سکت نہیں
گلی کی آوازیں، پرندوں کی آوازیں
اُون کے گولوں کے کھو جانے کی آوازیں
بچوں کا گریزپا شور
اور غباروں کا رقص
اپنے دھاگوں کے سروں سے بلند ہوتے ہوئے
صابن کے جھاگ کے بلبلوں جیسے
اور ہوا، ہوا گویا
ہم بستری کے باریک ترین لمسوں کی گہرائی میں ہانپتی ہوئی
میرے اعتماد کا خاموش قلعہ
اس کے حصار پر
دباؤ بڑھایا جا رہا ہے
اور کہنہ شگافوں سے
میرے دل کو نام لے لے کر پکارا جا رہا ہے

تمام دن مری نگاہ
اپنی زندگی کی آنکھوں میں گڑی رہی
ان دو مضطرب، خوف زدہ آنکھوں میں
جو میری لگاتار گھورتی نظروں سے فرار ہونا چاہتی تھیں
کسی دروغ گو کی مانند
میری پلکوں کے محفوظ گوشوں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
کیا یہ تمام بل کھاتے راستے
اس ایک سرد، چوستے دہن میں
ختم نہیں ہو جاتے؟
اے فریبی لفظو ___ تم نے مجھے کیا دیا؟
اے تپسیا، بدن کی اور خواہش کی،
اگر میں نے اپنے گیسوؤں میں ایک پھول لگا لیا ہوتا
تو کیا وہ اس جعل سے، اس کاغذی تاج سے
جو میرے سر پر بُو دینے لگا ہے،
زیادہ دلفریب نہ ہوتا؟

کیوں کر بیابان کی روح نے مجھے آلیا
اور چاند کے طلسم نے مجھے گلے کے ایمان سے دور کر دیا
کیوں کر میرے دل کا ادھورا پن بڑھتا چلا گیا
اور کسی نصف نے اس نصف کی تکمیل نہیں کی
میں کیسے کھڑی دیکھتی رہ گئی
کہ زمین میرے دو پیروں کے نیچے

سہاروں سے تہی ہوتی جا رہی ہے
اور میرے جُفت کے بدن کی گرمی
میرے بدن کے بے سود انتظار تک چل کر نہیں پہنچتی

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
مجھے پناہ دو، اے دھند لے چراغو!
اے خشکی روشن گھرو!
جن کی آفتابی چھتوں پر
کپڑے سوکھتے رہتے ہیں

مجھے پناہ دو، اے سادہ اور مکمل عورتو!
جن کی نازک انگلیوں کی پوریں
جلد کے اوپر، حمل کی کیفیت اور جنبش پر
پھرتی رہتی ہیں
اور گریبانوں کے شگافوں کی ہوا میں ہمیشہ
تازہ دودھ کی مہک شامل ہوتی ہے

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
مجھے پناہ دو، اے جلتے ہوئے چولہو!
اے خوش بختی کی نعلو!
اے باورچی خانے کی جھلاہٹ میں تانبے کے برتنو!
اے سلائی کی مشین کے دلگیر ترنم!
اے فرش اور جھاڑو کی روزانہ تکرار!
مجھے پناہ دو، اے تمام حریص جستجو!

Scanned with CamScanner

کہ بقا کی الم ناک آرزو
تمہارے تصرّف میں آنے والے بستر کو
جادو کے پانی سے
اور تازہ خون کے قطروں سے آراستہ کرتی ہے

تمام دن، تمام دن
سب کی چھوڑی ہوئی، چھوڑی ہوئی
جیسے پانی پر لاشہ
میں مہیب ترین چٹانوں کی جانب بڑھتی رہی ہوں
عمیق ترین سمندری غاروں
اور خوں خوار ترین آبی درندوں کی جانب
میری پُشت کے نازک مُہروں میں
احساسِ مرگ سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں

مجھ میں سکت نہیں، اب دوبارہ سکت نہیں
میرے قدموں کی چاپ، راستے کے کنارے سے بلند ہوئی
اور میری پیاس، میری روح کے صبر سے وسیع تر ہو گئی
اور وہ بہار، اور وہ واہمۂ سبز رنگ
جو میرے دریچے سے گزرا کرتا تھا
میرے دل سے کہہ رہا تھا
"دیکھ لے، تُو ذرا بھی آگے کی طرف نہیں بڑھی
تو نیچے کی طرف بڑھی ہے"

آیه‌های زمینی

اُس دم
خورشید سرد ہو گیا
اور زمین سے برکت اُٹھ گئی

اور صحرا میں ہریالی خشک ہو گئی
دریا میں مچھلیاں خشک ہو گئیں
اور اپنے مُردوں کی خاک کو
زمین نے دوبارہ قبول نہیں کیا

رات
تمام پدیدہ رنگ دریچوں میں
کسی مشکوک تصوّر کی مانند
شاخیں مارتی رہی
راستوں نے اپنی روانی کو
تیرگی میں ترک کر دیا

پھر سے کسی نے عشق کو یاد نہیں کیا
پھر سے کسی نے قتح کو یاد نہیں کیا
اور کسی نے
پھر سے کسی چیز کو یاد نہیں کیا
تنہائی کے غاروں میں
لغویت نے جنم لیا

خون سے بھنگ اور افیون کی بُو آنے لگی
حاملہ عورتیں
بے سر کے بچے پیدا کرنے لگیں
اور گھوارے شرم سے
قبروں میں پناہ ڈھونڈنے لگے

کیسا تلخ و سیاہ زمانہ...
نان نے شگفتِ رسالت کی کامرانی کو مغلوب کر لیا تھا
پیغمبر، گرسنہ و مفلوک،
خدا کی وعدہ گاہوں سے گریزاں تھے
اور گم شدہ بھیڑوں کے بچے
اس بار گڈریوں کی "ہُش ہُش" کو
صحراؤں کے تحیر میں نہیں سُن رہے تھے

آئینوں کی آنکھوں میں گویا
حرکات اور رنگ اور تصاویر
اُلٹے منعکس ہو رہے تھے
اور پست منبروں کے سروں کے اوپر
اور فاحشاؤں کے بے حیا چہروں کے گرد
ایک مقدس نورانی ہالہ
ایک چترِ مشتعل کی مانند جل رہا تھا
الکحل کے جوہڑ
اپنی سموم گیس کے بخارات سے
بے حرکت دانشوروں کے انبوہ کو

اپنی گہرائیوں کی سمت کھینچے لیے جاتے تھے
اور موذی چوہے
کتابوں کے زرنگار اوراق کو
قدیم الماریوں میں کتر رہے تھے

سورج مر چکا تھا
سورج مر چکا تھا، اور مستقبل
بچوں کے ذہن میں
ایک گم شدہ، گونگا مفہوم تھا

اس کہنہ لفظ کی اجنبیت کو
وہ مشق کی کاپیوں میں
درشت سیاہی کے دھبوں سے
تصویروں میں اتار رہے تھے

لوگ
اسقاط شدہ لوگوں کا ایک گروہ
دل مُردہ، پژمردہ، مبہوت
اپنے بدبخت جسموں کے بوجھ تلے دبا
ایک اجنبی مقام سے دوسرے اجنبی مقام کی جانب سفر کر رہا تھا
گناہ کی دردناک آرزو سے
اُن کے ہاتھ متورّم ہو گئے تھے
گاہے کوئی چنگاری، کوئی ناچیز چنگاری
اس ساکت و بے جان انبوہ کو

اندر سے پراگندہ کر دیتی
اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے
لوگ ایک دوسرے کے گلے
چھریوں سے کاٹنے لگتے
اور خون کی چادر پر
نابالغ لڑکیوں کے ساتھ ہم بستر ہو جاتے
وہ اپنی دہشت میں غرق تھے
اور گناہ کاری کے خوفناک احساس نے
ان کی اندھی اور احمق روحوں کو
مفلوج کر دیا تھا

ہر سزائے موت کی تقریب پر
جب پھانسی پانے والوں کی پُرخشم آنکھیں
کاسوں سے اُبل پڑتیں
تو یہ اپنے اندر غرق ہو جاتے
اور ایک شہوت ناک تصور سے
ان کے بوڑھے اور خستہ اعصاب میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں
لیکن، میدانوں کے کنارے ہمیشہ
آئندہ کے ان حقیر مجرموں کو دیکھیے
کہ کھڑے ہیں
اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں
پانی کے فواروں کی مسلسل بوچھاڑ سے

شاید ابھی تک

ان کی پایاں آنکھوں کے پیچھے
جمود کی گہرائیوں میں
ایک نیم مُردہ، مبہم سی شے باقی ہے
جو اپنی کم زور تلاش میں
چاہتی ہے کہ پانی کی آواز کی پاکیزگی پر ایمان لے آئے

شاید... لیکن کیسا بے پایاں خلا...
سورج مر چکا تھا
اور کوئی نہیں جانتا تھا
کہ اس غمگین کبوتر کا نام
جو دلوں سے اُڑ گیا،
ایمان تھا

آہ، اے صدائے زندانی!
تیری مایوسی کا شکوہ
کیا کبھی اس لعنت زدہ رات میں
نور کی سمت نقب نہ لگائے گا؟
آہ، اے صدائے زندانی،
اے صداؤں کی آخری صدا!

Scanned with CamScanner

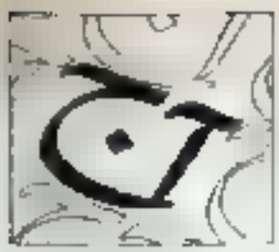

کراچی کی کہانی (۱)

ناؤں مل ہوت چند　　جان برنٹن　　کیول رام رتن مل ملکانی　　پیر علی محمد راشدی
نگوندر ناتھ گپتا　　لوک رام ڈوڈیجا　　سہراب کٹرک　　فیروز احمد
گوپال داس کھوسلا　　موہن کلپنا　　شیخ ایاز　　سوبھو گیانچندانی　　کیول موٹوانی
حاتم علوی　　حسن حبیب　　اے کے بروہی　　انوار شیخ
میر امداد علی　　عبدالحمید شیخ　　حسن منظر　　اسد محمد خاں
سیگریڈ کاسبلے　　انیتا غلام علی　　عارف حسن

۳۱۵ صفحات، کراچی کے مختلف ادوار کے ۱۲ قصّے
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض　　اختر حمید خاں　　آصف فرخی
محمد حنیف　　زینت حسام　　بیجمن انتھونی　　شریف سوز
لیاقت منور　　بیکسٹر جمٹی　　نسرین اسٹیفن　　آصف شہباز
محبوب جان　　تسنیم صدیقی　　کینتھ فرنانڈیز
یان فانڈر لنڈن　　اکبر زیدی　　مارک ٹلی　　عارف حسن

۳۰۸ صفحات، کراچی کے بارے میں اہم اعداد و شمار، کتابیات
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

علمی و ادبی کتابی سلسلہ

تحریر

ترتیب: رفیق احمد نقش

زیر اہتمام: ادارۂ تحریر، ۳۸۰-ڈی، سیٹلائٹ ٹاؤن، میرپور خاص ۶۹۰۰۰

رابطے کے لیے: اے-۸۷، بلاک این، شمالی ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰

ترقی پسند فکر کا ترجمان

علمی اور ادبی کتابی سلسلہ

ارتقا

ادارہ: حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید

۸، الاحمد مینشن، بلاک ۱۳ بی، گلشن اقبال، یونیورسٹی روڈ، کراچی

سہ ماہی

بادبان

مدیر اعزازی: ناصر بغدادی

E-2, 8/14 معمار اسکوائر، بلاک ۱۳، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

سہ ماہی

رجحانات

مدیر: طاہر اسلم گورا

۲۵ سی، لوئر مال، لاہور

سہ ماہی

تشکیل

مدیر: احمد ہمیش

2-J, 8/6 عروج کلوننگ بلڈنگ، ناظم آباد، کراچی

اسد محمد خاں

ایک سنجیدہ ڈِٹیکٹو اسٹوری

مغلوں سے پہلے ـــــ اور اُن کے بعد بھی ـــــ ناپسندیدہ سلطان یا ناپسندیدہ سلطانہ سے پیچھا چھڑانے کی راست صورت یہی سمجھی گئی کہ ایک سو ایک مروج طریقوں میں سے کوئی ایک استعمال کرتے ہوئے اُسے ہلاک کر دیا جائے ـــــ تلوار سے یا پھانسی دے کے، وِش کنیا سے ہم بستری کرا کے یا مور کے پَر سے تلووں میں گدگدی کرتے ہوئے ـــــ جیسے بھی بن پڑے۔

ذاتی طور پر مصنّف اِن تمام ایک سو ایک طریقوں کے حق میں ہے مگر کیوں کہ یہ کہانی مزاحمت کرنے والے کے نقطۂ نظر سے سوچی گئی ہے، اِس لیے فی الحال یہ مصنف رسمی معذرت پیش کرتے ہوئے کہانی سنانا شروع کرتا ہے۔

دریا خاں حُجاب دار پرانے وفاداروں میں سے تھا۔ وہ اقامت گاہِ سلطانی کے قریب کہیں رہتا تھا۔ ایک بار راستا طے کرتے ہوئے دریا خاں بازار کے سبزی ہٹے میں پھنس گیا۔
اجناس کی منڈی کے اِس ہجوم میں پھنس کے دریا خاں حجاب دار نے عجب طرح کی بے بسی

Scanned with CamScanner

اور اُلجھن محسوس کی۔ اُسے دیر پر دیر ہو رہی تھی۔ یہ الجھن ایک آہستہ سلگنے والے غصّے کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اُس نے دوسری طرح سے یہ بات سوچی۔ اُس نے غور کیا کہ ناج منڈی کے حمّال، گاڑیاں، بہلیاں اور گدّا اُس کے راستے میں نہیں آ رہے، وہ خود اُن کی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ "یہ اِن کا علاقہ ہے اور میں یہاں اجنبی ہوں۔" یہ سوچتے ہوئے اُس کے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔ غصّہ ٹل گیا۔

دریاخان کے لباس، اُس کی تلوار کے مرصّع نیام یا دستار کے جواہر نگار جیغے پر جس بھی رہ گیر کی نظر پڑتی یا جو بھی گاڑی بان اُس کی پُرتکلف چال، سرخ و سپید رنگت اور بارُعب چہرے کی جھلک دیکھ لیتا، وہ حیران اور مرعوب ہو کر راہ دے دیتا، گاڑی کی رفتار کم کر کے اُسے گزرنے کا موقع دیتا تھا۔

روزمرّہ کے مفید کاموں میں مصروف اِن سادہ، محنتی لوگوں کو اپنی موجودگی سے اس طرح ٹوکنا دریاخان کو اچھا نہ لگا۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر دستار کا زیور اتار لیا، اُسے اپنی جیب کے حوالے کیا۔ کمر کا دوپٹا کھول اُسے سر اور شانوں کے گرد اس طرح لپیٹ لیا کہ زردوزی کی جھلملاتی دستار اور گردن اور شانوں پر چھپے درباری نشان چھپ گئے۔ چہرے کا کچھ حصّہ بھی بازار کے گرد و غبار سے اور سرسری دیکھنے والوں کی نظروں سے محفوظ ہو گیا۔ اُس نے آستین سے رُومال کھینچ کر اُسے اپنی تلوار کے مرصّع نیام پر لپیٹ لیا۔ اب چلتے پھرتے، قریب و دُور کا کوئی بھی دیکھنے والا دریاخان کو دیکھ کے ٹھٹکتا نہیں تھا۔ وہ خریداروں، بیوپاریوں، حمّالوں کے ہجوم میں اب ایک عام سا رہ گیر تھا جو اجناس کی منڈی میں اعتماد کے ساتھ راستا طے کر رہا تھا۔

لوگوں نے اُسے دیکھنا بند کر دیا تھا مگر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالتے ہوئے خود دریاخان نے ایک ایسا شخص دیکھا جو اگرچہ عامیانہ پوشاک پہنے تھا مگر عامیوں میں سے نہ تھا۔ وہ اپنے نکلتے قد کے ساتھ کوبڑ نکال کے چل رہا تھا۔ دریاخان کو یوں لگا جیسے وہ بھی ہجوم میں گم ہونا چاہتا ہے اور یہ احساس ہوا کہ میں نے اسے کہیں بار بار دیکھا ہے ـــ مگر کہاں؟ دارالحکومت میں؟ دربار میں؟ دریاخان نے اِس کشیدہ قامت آدمی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ دربار میں پیش بھی کیا تھا۔ ہاں! یہ پُرتگالی طبیب زادہ ہے ـــ بھلا سا نام ہے، الفانس؟ نہیں ـــ الفانزو۔ مگر یہ اِس وقت یہاں؟ اجناس کی منڈی میں؟

ایک حبشی حمّال بڑا سا تھیلا اٹھائے الفانزو کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔

دریاخان نے سوچا، عجیب بات ہے، جو شخص دیسی درباریوں کو خاطر میں نہ لاتا ہو وہ اس وقت اس حبشی حمّال کے ساتھ خوب باتیں کرتا کہیں جا رہا ہے! ___ تو یہ کہاں جا رہا ہے؟

کہیں بھی جانے سے پہلے دریاخاں اپنے تجسس کی تسکین چاہتا تھا۔ وہ دس قدم کے فاصلے سے الانزو اور حمّال کے پیچھے چلنے لگا۔

جس شہر میں سلطان یا سلطانہ موجود ہوں، وہاں دیوانِ خبر طلی کی ذمے داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات مملکت کے میرِ توزک اور دربار کے حجاب دار (یہ دونوں عہدے دریاخان کے پاس تھے) سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔ دریاخان جانتا تھا کہ کتنے ہی مخبر اور پرچہ نویس ولایتِ "الف" کی سرکار "با" میں اس وقت زندگی کے ہر شعبے کی ہر جاہی اور سرکاری سرگرمی کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے اور ڈاک چوکی کے تیز رَو نظام کو لیاقت سے استعمال کرتے ہوئے آس پاس کے احوال سمیت اپنے مشاہدات وَروغہ ڈاک چوکی کی وساطت سے خود سلطانِ والاجاہ یا سلطانہ معظّمہ تک پہنچاتے ہوں گے۔ مگر دریا نے یاد کیا کہ سلطان کچھ عرصے سے علیل ہیں، اس لیے بے شمار پرچہ نویسوں کی بھیجی ہوئی بے حساب خبریں خود اُن کے ملاحظے میں نہیں آ رہیں۔ پھر بھی دیوانِ وزارت آٹھوں پہر بیدار رہنے والا محکمہ تھا تو اس کے ہوتے دریاخان کو ڈاک چوکی کے فرائض ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تاہم ایک غیر معمولی بات مشاہدے میں آ گئی ہے، اس لیے جاننا ضروری ہے کہ یہ شخص الانزو آخر اس وقت جا تا کہاں ہے۔ تجسس دور کر کے دریاخان اپنی راہ لے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی بات اس بارے میں اس کے مشاہدے میں آئی تو شحنہ کو بُلوا کے اس کے علم میں لائے گا، ورنہ سمجھے گا کہ یہ نصف ساعت بازار میں ضائع ہوئی۔

الانزو اور وہ حبشی نارجیل فروشوں کے کوچے کی طرف مڑ گئے۔ یہاں دکانوں پر تازہ سبز کھال کے نارجیل لٹکے تھے۔ کہیں پختہ کتھئی رنگ اور گھنی جٹا والے نارجیل کسی شیطانی جنگ و جدال کے بعد بنائے گئے سروں کے میناروں جیسے سجائے گئے تھے تو کہیں مُونجھ نوچ لیے جانے کے بعد وہ لکڑی کی بیضوی گیندوں کی طرح پڑے لڑھکتے تھے۔ کسی دکان دار نے نارجیل کا کاسہ توڑ کے ور سازہ کھوپرے کو قاشوں میں تراش کے یہ دکھانے کے لیے انھیں طشتوں میں سجا دیا تھا کہ اُس کے پھل تازہ اور فربہ ہیں۔

دریاخان یہی سب دیکھتا اور دکان داروں کے آوازے سنتا آ رہا تھا کہ اچانک سامنے کوئی

کش مکش اور ہیجان سا سنائی اور دکھائی دیا۔

ہوا یہ تھا کہ بے ڈھنگے پن سے چلتے ہوئے افانزو کے ساتھی حبشی نے اپنا تھیلا سبز نارجیلوں کی ایک سجاوٹ سے ٹکرا دیا تھا۔ تھیلا اُس کی گرفت سے چھوٹ کے زمین پر آواز کے ساتھ گرا تھا اور کھڑبڑ کرتی بہت سی چیزیں تھیلے سے باہر جا پڑی تھی۔ تانبے کے قلعی کیے ہوئے کٹورے، بادیے، طشتریاں، قاشق، چمچے سب طرف بکھر گئے تھے۔ دریاخان ٹھہر گیا۔ افانزو سخت پریشان اور برہم ہوا، اُس نے طیش میں حبشی کی کمر پہ لات ماری اور اپنی زبان میں بک جھک کرتا اکڑوں بیٹھ کے برتن سمیٹنے میں حبشی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

تھیلے کا ٹکرانا، برتنوں کا بکھر جانا، ایک اعتبار سے غیبی امداد تھی۔ یوں لگا جیسے قدرت خود دریاخان کی مدد کر رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ حبشی کے تھیلے میں کیا ہے اور اب اس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کسی باحیثیت گھر کے برتن تھے۔ تاہم ایک بات طے تھی کہ یہ افانزو کے گھر کے برتن نہیں تھے۔ نہ ہی یہ عرقیات اور سفوفوں، معجونوں کے ظروف یا طبیبوں کی دواسازی میں کام آنے والے قرابے اور بادیے تھے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا افانزو انھیں قلعی کرا لے لیے جاتا ہے؟ مگر یہ تو تازہ قلعی سے چمچما رہے ہیں اور دستور یہ ہے کہ قلعی گروں کے پاس برتن بھانڈے نہیں لے جائے جاتے، وہ خود مکانوں پر پہنچ کر قلعی کرتے ہیں۔ یہ برتن نئے خریدے ہوئے بھی نہیں تھے ـــــ یہ اگر ابھی خریدے گئے ہیں تو اجناس کی منڈی میں ان کا کیا کام؟ ٹھٹھیروں، کسیروں کا بازار تو کسی اور ہی طرف ہے۔ دریاخان پہلے سے زیادہ الجھ گیا۔ بھلا الجھنے کی بات نہیں تھی؟ افانزو کا ٹھکانا اقامت گاہِ سلطانی کے قریب دریائے ترنو کے رُخ پر ہے تو پھر راہ سے بے راہ یہ برتن اٹھوائے کہاں جا رہا ہے؟

حبشی نے برتن سمیٹ کے دوبارہ تھیلے میں بھر لیے تھے اور اب وہ زیادہ احتیاط اور مستعدی سے افانزو کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دریاخان نے ان دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے برتنوں کی اقسام اور اُن کی تعداد پر پھر غور کیا۔ سب برتن وہ تھے جو کھانا نکالنے، پیش کرنے میں استعمال ہوتے ہیں، ان میں ایسا کوئی برتن نہ تھا جو کھانا پکانے میں کام آتا ہو۔ دریاخان نے سوچا، سبحان اللہ! یہ میں کوتوال کے محبروں، دیوانِ فسطرہ کے دانش مندوں کی طرح برتنوں کی گتھی کیوں سلجھا رہا ہوں؟ راستے کی تھکن اور بھوک کا تو واللہ مجھے خیال ہی نہ رہا۔ اس پرتگالی طبیب بچے سے فراغت ہو

تو کچھ زہر بار کروں۔

نارجیل فروشوں کا کوچہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دیوانِ شُرطہ کے دو اہل کار پٹکے باندھے، کمر کے سامنے کوچے میں داخل ہو گئے۔ الانزو نے اپنے حبشی سے زیرِ لب کچھ کہا اور خود اُس نے ایک محراب کی اوٹ لے لی۔ دیوانِ شُرطہ کے اہل کار دریاخان کو توجّہ سے دیکھتے ہوئے اُس کے برابر سے نکل گئے۔ اُن کے ہجوم میں غائب ہوتے ہی الانزو نے محراب سے سر نکال کے جھانکا اور دُور تک نظر ڈالی۔ دریاخان مڑ کے ایک نارجیل فروش سے سَودے کے دام پوچھنے لگا تھا مگر اُس کا دھیان دکان دار کے جواب پر نہ تھا، جس نے کچھ کہا تھا۔ دریاخان انکار میں سر ہلاتا الانزو کے پیچھے چل پڑا۔ پرتگالی طبیب زادے نے قدم بڑھا کے حبشی حمّال کو جا لیا تھا۔ "طبیب زادہ قانون کے خلاف کسی کام میں پڑا ہے جبھی دیوانِ قانون کے اہل کاروں سے چُھپتا ہے۔ اب مَیں اِس کا پیچھا نہیں چھوڑنے کا۔"

نارجیل فروشوں کے کوچے سے نکل کر حبشی اور الانزو روغن فروشوں اور نانبائیوں کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایک حقیر سے قہوہ خانے کے پاس وہ دونوں ٹھہر گئے۔ حبشی قہوہ خانے کے مالک سے کچھ کہتا رہا، وہ سر ہلا کے انکار کرتا تھا، مگر جب الانزو نے اپنی پہنی ہوئی انگشتری اتار کے اُسے دی تو قہوہ خانے کا مالک پہلے تو الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا، پھر دونوں کو اندر دکان میں بلا لیا اور خود وہ انگشتری جیب میں ڈال ایک طرف کو روانہ ہوا۔

الانزو نے قہوہ خانے کی یکدری میں جا بیٹھنے سے پہلے دُور تک کوچے میں نظر ڈال کے اپنا اطمینان کیا تھا۔ دریاخان اُس کا ارادہ بھانپ کے پہلے ہی ایک روغن ساز کے کارخانے میں داخل ہو گیا تھا جہاں روغنوں کے بھاؤ پوچھتا اور عدم اطمینان ظاہر کرتا وہ گھومتا رہا۔

کچھ وقت گزر گیا۔ آخر قہوہ فروش اپنی دکان میں واپس آیا اور الانزو کو وہ انگشتری لوٹا کر اُسے اور حبشی کو اپنے ساتھ لیے چل پڑا۔ دریاخان نے روغن فروش سے پیچھا چھڑانے کو یہ کہا کہ میں دام سے خوش نہیں ہوا، مال بہرحال اچھا ہے، کیوں نہ ایک دو دکانیں اور دیکھ لوں؛ یہ کہہ کے وہ الانزو اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دریا نے دیکھا، وہ لوگ کچھ دُور ایک چھوٹی گلی میں داخل ہو گئے ہیں۔ دو چار بڑے پھاٹکوں والے مکان چھوڑ وہ ایک غیر معمولی بلند دروازے تک پہنچے۔ یہ کسی بااختیار معزز کا مکان ہوگا، کس

لیے کہ تنا بلند دروازہ فصیل نشین ہی بنواتے ہیں۔ تاہم مکان پر ایک عام خستہ حالی چھائی ہوئی تھی۔ قہوے فروش نے دروازے پر خفیہ دستک دی ہو گی یا شاید روزن سے انھیں کوئی دیکھتا ہو گا، جو خاموشی سے دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر لیا گیا۔

دریاخاں کے لیے یہ وقت بڑے اضطراب کا تھا۔ وہ بہ زور اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شور شرابا سن کے اقازنو کسی اَور راستے سے نکل جاتا اور ساری محنت اکارت ہوتی۔ خاں نے آس پاس کے مکانوں اور گلیوں کا جائزہ لیا۔ بازار کی معمولی سرگرمی جاری تھی۔ کسی نے دریا کو یا اقازنو اور اس کے ساتھیوں کو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ اُس نے سوچا، وہ کیا کرے؟ کیا دیوانِ شہرطہ سے مدد لے؟ مگر دریاخاں اپنے مستقر سے دُور تھا اور وہ دربارِ سلطانی میں اپنے ہم چشموں، ہم رُتبہ امیروں کے تمسخر کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے پوری بات اور کوئی واضح الزام تو ہونا چاہیے۔ صرف شک شبے پر تو کام نہیں چلتا۔"

دریاخاں نے کوچے پر نظر ڈالتے ہوئے اِس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ اِس بڑے رستے اور متصل گلیاروں میں نان بائی، شیر فروش، باورچی بہت سے تھے مگر قہوہ فروشوں کی صرف دو ہی دکانیں تھیں۔ ایک دکان تو وہی تھی جس کا مالک اقازنو کو ساتھ لے گیا تھا۔ دوسری ایک درخت کی اوٹ لیے جیسے بازار میں جھانکتی دکھائی پڑتی تھی اور بہت حقیر اور خستہ حال تھی۔ اِس وقت اُس پر گاہک کوئی نہیں تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ کچھ دیر سے اِدھر کوئی آیا بھی نہیں۔ ایک بوڑھی عورت کوئلے کی انگیٹھی پر کوتلیاں جمائے اور تختے پر فنجان اوندھائے حقارت کے ساتھ ہر آتے جاتے کو دیکھتی تھی۔

دریاخاں نے اندازہ لگایا کہ اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے تو یہی عورت کر سکتی ہے۔ اُسے قیافہ شناسی میں دعویٰ تو نہیں تھا تاہم انتظامی امور میں ایک تجربہ ضرور تھا، جس نے آگاہ کیا تھا کہ ایک کوچے میں ایک ہی طرح کا کاروبار کرنے والے دو دکان داروں میں رقابت تو ہو گی۔ دیگر یہ کہ بُڑھیا کا دھندا بہت مندا چل رہا ہے، اِسے عام گاہکوں سے شکوہ بھی ہو گا اور سامنے یک دَرے میں دکان سجائے جو ملعون رقیب بیٹھا ہے، اُس سے تو وہ باقاعدہ نفرت کرتی ہو گی۔

دریاخاں نے خود پر جھنجھلاہٹ طاری کی، بڑبڑاتا ہوا بڑھیا کی خالی دکان میں داخل ہوا، پاپوشیں اتار گاہکوں کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ عورت نے پیروں سے شروع کر کے دستار کے

Scanned with CamScanner

طرح سے تک دریاخان کا جائزہ لیا۔ وہ پاپوش سے بندھی قیمتی مہمیز اور پوشاک کی عام نفاست دیکھ کے متاثر ہوئی تھی مگر عادتاً اتنی تلخ مزاج تھی کہ لگتا تھا دریاخان جیسے معزز گاہک کو بھی خاطر میں نہ لائے گی۔ خاموشی سے خان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دریاخان نے سوچے سمجھے طریق پر عمل کرتے ہوئے کہا، "مجھے بھی کہیں جانا ہو تو چلی جا۔ میں انتظار کر لوں گا۔" اُس نے یہ ظاہر کیا تھا جیسے وہ سامنے والے قہوہ فروش سے ناراض ہو کے یہاں آیا ہے۔ عورت گاہک کے جھنجھلانے پر حیران ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی جھنجھلانے کا حق اسی کا ہے۔ حیرت سے اپنے اِس گاہک کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی، "مجھے کہیں نہیں جانا — کہو کیا چاہیے؟"

"قہوے اور چار طرف بھنبھناتی مکھیوں کے سو تیرے پاس ہے کیا؟"

بات درست تھی۔ عورت نے مصالحت کے انداز میں چھوٹی سی کیتلی کو انگاروں پر اِدھر اُدھر جمانے کی کوشش کی۔ بولی، "یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے اگر کچھ کھانا چاہو گے تو مشہدی قاسم کی دکان سے تازہ پنیر لادوں گی مگر اُسے دینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمھیں پہلے پیسے دینے ہوں گے۔"

دریاخان بھوکا تھا۔ اُس نے سوچا، کیا حرج ہے، پنیر اچھا ہوا تو کھا لوں گا ورنہ غریب بڑھیا خود بھوکی لگتی ہے، وہ کھا لے گی۔ اُس نے جیب سے چمڑے کی تھیلی نکالی اور دو دام لے کے بڑھیا کی طرف بڑھا دیے، جب کہ پنیر، قہوے اور بہت سی چیزوں کے لیے ایک ہی دام کافی ہوتا۔ بڑھیا حیرت اور جھنجھلاہٹ میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکی۔ ملی جلی کیفیت میں بولی، "ایک ہی بہت ہے۔"

"رکھ لو،" دریاخان نے ہلکے غصے میں کہا۔ "بددیانت قہوہ فروشوں کے کوچے میں خود کو زیادہ اعتبار کا ثابت نہ کرو۔ رکھ لو!"

عورت پہلی بار گاہک سے خوش ہو کے بولی، "آہا! مجھے مرنے کے بعد خدا کو منہ دکھانا ہے۔ کوچے کے شیاطین سے مجھے کیا سروکار!" اور وہ تیزی کے ساتھ قہوے خانے سے نکل گئی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ واپس آ کے اِس اپنے منحوس رقیب قہوہ فروش کے خلاف ضرور کچھ کہے گی۔ یہ گاہک اُس کے مزاج کا آدمی لگتا ہے۔

وہ کوئی تو کیلے کے دُھلے ہوئے تروتازہ پتے میں لپٹا پنیر کا بڑا سا ٹکڑا اور ایک صاف ستھرے

نے کوزے میں پانی لائی تھی۔ کہنے لگی، "تم جیسے سردار، ملک اشتہار کے لائق پانی کا برتن نہ تھا، تو مشہدی قاسم سے کورا کوزہ مانگ لائی۔ لو کھاؤ، میں ابھی قہوہ بناتی ہوں۔"

دریاخان نے ابھی کھانا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ بڑھیا نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیے۔ بولی، "میں تو کہتی ہوں اُس منحوس قزاق سے ہم غریبوں کا مقابلہ نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔ کوئی ایک کاروبار تو ہے نہیں اُس کا۔" بڑھیا فقرہ پھونک کے گاہک کا تجسس اُبھارنا چاہتی تھی — مگر دریاخان کو صحیح وقت کا انتظار تھا۔ کہنے لگا، "معلوم ہے، معلوم ہے — میں اُس کے کرتوت خوب جانتا ہوں، مگر مجھے کیا۔ اب تو چھ ماہ بعد اِدھر آنا ہوگا، وہ جانے اور اُس کے اعمال۔"

بوڑھی عورت نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ یہ سوچ کے پریشان ہو گئی کہ گاہک کو معلومات کے اس ذخیرے سے کوئی دل چسپی کیوں نہیں جو اُس کے سینے میں محفوظ ہے۔

"خیر اچھا ہے — میں سمجھتا ہوں تو قہوہ بھی اچھا دے گی۔ کم سے کم سامنے والے اُس۔ اُس لاپروا آدمی سے تو اچھا قہوہ بناتی ہو گی۔"

"میں بازار کی سب سے اچھی دکان پہ نہیں بیٹھی، مگر قہوہ تمھیں اچھا پلاؤں گی۔"

قہوہ سامنے آیا تو دریاخان پوری طرح تیار تھا۔ بولا، "میں اِسے توجہ اور یکسوئی سے تیار کیا ہوا قہوہ کہوں گا۔ تو نے اپنے کام پر دھیان دیا ہے اور دیکھ لے کیسا اچھا قہوہ بنایا ہے۔ بے شک تو انعام کی حق دار ہے۔" دریاخان نے چاندی کا ایک سکہ نکال بڑی بی کی طرف اُچھال دیا۔

بڑھیا غریب نے کب، کس اچھے موسم میں چاندی کا سکہ دیکھا ہو گا! وہ حیرت اور شکر گزاری میں ہکلانے لگی اور بے رُکے دریاخان کو دعائیں دینے لگی کہ آغا خدا تجھے یوں رکھے اور یہ عطا کرے اور وہ دے۔ دریاخان اٹھ کھڑا ہوا، پاپوشیں پہنتے ہوئے بولا، "جانتا ہوں اور اگر وہ سامنے والا خبیث اپنی دلالی سے لوٹتا مجھے مل گیا تو کہیں سے تازیانہ لے کے اُسے اتنا پیٹوں گا کہ..."

"آغا! تم نے دلال اچھا کہا — وہ ملعون اس حبشی جادوگر کا دلال ہی تو ہے۔ گاہک لاتا ہے اس کے پاس۔"

دریاخان نے پاپوشیں پہننے میں دیر کر دی۔ چاندی کا سکہ نتائج لا رہا تھا۔ اُس نے بڑھیا کو دیکھا، اِثبات میں سر ہلایا، بولا، "جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ یہ تو مجھ سے کہہ رہی ہے؟ اُس بدانجام

سامری کے چکر میں تو اُسی نے مجھے پھنسایا تھا۔ کہتا تھا آغا! کنیز تمہاری مطیع فرماں بردار ہو جائے گی۔ ایسا عمل کرا دوں گا اُس بدقماش سے کہ...'

"عمل؟" عورت حیران ہوئی تھی، "آہ یہ مُردہ عملیات کب سے کرنے لگا؟ اسے شیطانی دوائیں تیار کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے جو عملیات اور حاضرات کرے گا۔'

دریاخان کو مایوسی ہوئی۔ افانزو اور اُس کا حبشی دو دن کے لیے اس مکان میں گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پُرتگالی علمِ طب کی تعلیم کے لیے یہاں آیا ہے، مددگار طبیب ہے۔ افسوس دریاخان نے پوری ایک ساعت کسی ایسے ناتجربہ کار نوجوان کی طرح گزار دی جس کا ذہن اوہام سے اور خیالی داستانوں سے خوب مشتعل ہو۔

وہ مایوسی اور خفت میں دکان سے چلنے کو ہوا کہ بڑھیا نے، جو کچھ نہ کچھ بولے جا رہی تھی، کہا، "تم شاید اس قطامہ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو ــــ اپنی کنیز سے؟"

"ہاں ہاں،" دریا نے یوں ہی سر ہلا دیا۔

"یہ خبیث سب طرح کے زہر تیار کرتا ہے۔ کام میں فرد ہے اپنے۔"

"زہر!" دریاخان رک گیا۔

شاید وہ ٹھیک جگہ آیا ہے۔ شاید صحیح طور پہ کلام کر رہا ہے۔ اُس نے محتاط انداز میں گول مول بات کی، بولا، 'ہاں، یہی عمل کرایا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔"

عورت رازدارانہ دریا کے قریب پہنچی اور دھیرے سے کہنے لگی، "ایک بات آغا، میں خدا لگتی کہوں گی! اِس منحوس کے تیار کیے زہر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ آج نہیں تو ایک ماہ بعد، چھ ماہ بعد، وہ مُردی ختم ضرور ہو جائے گی۔ کنیز تمہاری بچے گی نہیں۔' پھر وہ فوراً ہی پوچھنے لگی، "کس طرح کا دیا تھا اِس نے؟ کھانے کا؟ سونگھنے کا؟"

"سونگھنے کا؟" دریاخان نے بناوٹ کی حیرت ظاہر کی۔

"کیا سمجھتے ہو؟ یہ ایسا زہر بھی تیار کر سکتا ہے جو رنگ کے ساتھ لباس میں سرایت کر جائے اور پہننے والے کو آٹھ دس روز میں ختم کر دے۔"

دریاخان کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ "کیا ایسا زہر بھی جو برتنوں میں پیوست کیا گیا ہو؟ اور پھر جب ان برتنوں میں کھایا پیا جائے تو.. ؟

"کیوں نہیں آغا! یہ منحوس سب طرح کے کام ہاتھ میں لیتا ہے۔ طاق ہے اپنے ہنر میں۔"

مسندِ عالی دریا خان حُجاب دار نے چاندی کا ایک سکّہ بخش کے بڑھیا کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ وہ ساری منحوس کے بارے میں تفصیلات بتانے پر آمادہ تھی۔ ہر چند کہ اُس کا کاروبار بڑھیا کے کاروبار سے جدا تھا، دونوں میں براہِ راست کوئی ٹکراو نہ تھا۔ بڑھیا کو تو اِس بات کا غصّہ تھا کہ وہ اُس کے رقیب قہوہ فروش سے دلّال کا کام لیتا ہے، اُسے اپنی جیب سے حقِ محنت دیتا ہے۔ بڑھیا کو یقین تھا کہ قہوہ فروش گاہکوں سے بھی کچھ نہ کچھ ہتھیا لیتا ہوگا۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا کھینچ رہا ہے نافرجام۔ قہوہ فروش کو خود کیا محنت پڑتی ہوگی۔ اُس نے شہر بھر کے آوارہ گرد نکّموں سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ایسوں کو پہچان کے خبر کر دیں جنھیں دشمنوں کو چُپ چُپاتے ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے۔ آوارہ گرد نکّمے ایسے لوگوں کا پتا نشان قہوہ فروش کو بتا کے آدھی رات کو بھی اپنا انعام لے سکتے تھے۔ قہوہ فروش ضرورت مندوں کے بارے میں کچھ دوسروں سے مدد لے کے اطمینان کر لیتا کہ سودا طے ہو سکتا ہے، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ پھر وہ ضرورت مندوں سے مل کے تفصیل سمجھتا اور زہر فروش سے پوچھ کے رقم بتا دیتا۔ بڑھیا کا خیال تھا، مردود اس رقم میں بھی الٹ پھیر کرتا ہوگا۔

دریا خان بڑھیا سے یہ سُن کے بہت پریشان ہوا کہ ساری وہ زہر بھی تیار کرتا ہے جو کھانے کے برتنوں میں سرایت کر جائے اور جب اُن برتنوں میں کھانا اُتارا جائے تو زہر اپنا کام دکھا دے ــــ کھانے والا ہلاک ہو جائے۔ دریا نے اقا نزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ خدایا! اگر یہ برتن سلطانِ والاجاہ کے استعمال کے ہوے؟ اللہ رحم کرے!

دریا خان دل کی پریشانی میں دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دستار کے پیچ ڈھیلے کر کے پھر سے باندھنے لگا۔ "سلطان کو اور سلطانہ کو مالک سلامت رکھے۔ کیسی اُلجھن کی بات سامنے آئی ہے۔"

دریا نے اقا نزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ یہ طبیب زادہ اقامت گاہِ سلطانی کے پڑوس میں رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سلطان اور سلطانہ کے استعمال کے برتن ہوں جنھیں یہ حرام خور اُس ساری نابکار سے مسموم کرانے لے جا رہا ہو۔ اَللّٰھُمَّ احفظنا! فوری طور پر کچھ کرنا از بس ضروری ہے۔

دریاخان نے سوچا، اگر زہر ساز کے مکان کا یہی ایک دروازہ ہے (جس کا کہ امکان کم ہی ہے) تو، فاتزوس کے علم کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوئی اور دروازہ بھی ہے اور طبیب زادہ یہاں سے نکل کے اپنے شیطانی سامان کے ساتھ سلطانی اقامت گاہ تک پہنچ جاتا ہے تو دریاخان کو کچھ اور کرنا ہوگا ـــ وقت بالکل نہیں ہے۔

تاہم عورت کو مدد دینے پر آمادہ کرنے میں کوئی زیادہ محنت نہ لگی۔ دریاخان نے کہا، "میں تجھے انعام دوں گا۔ اتنا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

بڑھیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کا نصیبا پلٹنے میں اب دیر کوئی نہیں۔ بولی، "آغا! حکم کرو، میں حاضر ہوں۔"

دریا بولا "مجھے اِس مکان کے بارے میں بتا اور زہر ساز کے بارے میں بھی، اور یہ بھی سمجھا دے کہ مکان میں جلد اور خاموشی سے کیوں کر داخل ہوا جائے۔"

لالچ اپنی جگہ، مگر بڑھی بی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ یہ آغا کہیں دیوانِ قانون کا کوئی عہدے دار تو نہیں ہے۔ کہنے لگی، "عالی جاہ! میں بہت غریب مسکین بدحال عورت ہوں۔ کوئی بیٹا نہیں جو اِس عمر میں میری کفالت کرے۔ آپ بے شک انعام اکرام دو گے، سخی معتبر ہو، لیکن ایک بات قرآن کو بیچ میں لا کے کہو کہ دیوانِ شرطہ کے الجھیڑے میں تو مجھے نہیں ڈالو گے؟"

دریا نے کہا، "بالفعل دیوانِ شرطہ بیچ میں آیا بھی تو میں قسم کھاتا ہوں، تجھے گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ وہ لوگ سبھی تجھے انعام ہی دیویں گے۔ تو بے خدشے میرا ساتھ دے۔"

بڑھیا کہنے لگی، "یہ تو کہو تم دیوانِ قانون کے عہدے دار، قاضی عسر، شحنہ وار تو نہیں ہو؟"

دریاخان کو اُلجھن ہونے لگی، "اگر ہو بھی تو تیرا کیا نقصان؟"

بڑھیا بولی، "میرے دس دشمن، دس دوست ہیں۔ گڑے مُردے اکھڑنا شروع ہو گئے تو مجھ غریب کا اللہ ہی والی ہے۔"

دریاخان سمجھ گیا تھا کہ خود بڑھیا کے ہاتھ صاف نہیں ہیں اسی لیے ڈرتی ہے۔ کہنے لگا، "میں سمجھ گیا۔ لے، میں قسم کھاتا ہوں کہ دیوانِ قانون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور آج سے پہلے چاہے تُو کچھ بھی کرتی رہی ہو، میں تیری گردن کہیں پھنسنے نہیں دوں گا۔ بے فکر رہ ـــ پہنچ میری

دُور تک ہے۔"

"آغا سردار! تمہاری شوکت اور دبدبے کو خدا دس گنا بڑھائے۔ مجھے یقین آ گیا۔ لو اب سنو،" پھر کے بڑھیا ڈھڈو نے اُس مکان کا احوال بتایا جس میں قہوہ فروش رقیب اس ولایتی جوان اور حبشی حمال کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ کہنے لگی، مکان کا ایک پچھلا دروازہ بھی تھا جہاں سے وہ دریاخان کو داخل ہونے میں مدد دے گی۔ اندر کہاں کہاں خطرات ہیں، زہر ساز کے آدمی کہاں کہاں پہرہ دیتے ہیں، کس ڈھب کے لوگوں سے اندر واسطہ پڑ سکتا ہے، یہ بڑھیا نے خوب سمجھا دیا۔ وہ زہر ساز کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھی۔ بولی، "جنھوں نے اُسے دیکھا ہے وہ بتانا نہیں چاہتے، یا بتا نہیں سکتے۔ اور وہ نحوست مارا خود کبھی باہر نہیں نکلتا۔"

دریاخان نے چاندی کے بیس بائیس سکّے دکان کے تختے پر رکھ کے کہا، "سن، یہ رقم تیرے لیے نہیں ہے ـــ تجھے تو میں اشرفیوں میں انعام دوں گا۔ یہ سکّے رکھ۔ مجھے مکان میں داخل کرنے سے پہلے چار پانچ نکّے شہدے کہیں سے پکڑ لا، انھیں پیسے دے کے یہاں اپنے چبوترے پر بٹھا دے، میری طرف سے قہوہ پلا اور خود بھی سامنے دروازے پر نظر رکھ۔ پرتگالی افازو اور اس کا حمال یا تیرا حریف قہوہ فروش مکان سے نکلیں تو شہدوں نکّموں کو سمجھا دے کہ وہ کوئی فساد کھڑا کر دیں۔ انھیں روک رکھیں، جانے نہ دیں۔ آگے مَیں سنبھال لوں گا۔"

اتنے بہت سے روپے دیکھ کے بڑھیا تو سمجھو غش کھا گئی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا، اس لیے کہ آغا نے اسے طلائی سکّے انعام میں دینے کو کہا تھا۔

واللہ اشرفیاں! سونے کی مقدّس ٹکیاں! اب تو وہ سامنے والے خبیث کو بندھوا کے ڈلوا دے گی۔ تختے پر جو چاندی پڑی ہے، اس سے دس درجے کم رقموں پر تو بڑھیا نے اپنے بھتّوں ستیّوں سے کیسے اُلٹے سیدھے کام کرائے ہوں گے۔ اس آغا کا دکان پہ آنا کیا ہوا کہ سمجھو نصیبے کا بند دروازہ کھل گیا۔

اُس نے دریاخان کی قزلِ کا دامن چھوا اور اپنا ہاتھ چوم لیا، "آغا ملک! تمہیں تو کہیں کا حاکم ہونا تھا۔ یہ خدا، یہ کریم، کیا حکمت سوچی ہے! میں پلک جھپکتے بازار کے بکھرے شہدوں میں سے دو چار کو پکڑ لاتی ہوں۔ اسی رقم میں تو وہ اس مردود قہوہ فروش کے ٹکڑے کر دیں گے۔"

دریاخان کا منہ بن گیا۔ الجھ کر بولا، "او تیرہ بخت! مجھے کسی کے ٹکڑے نہیں کرانا۔ ان

شہدوں نکھٹوں کو سمجھا رکھنا کہ کھینچا تانی اور فضول گوئی سے زیادہ کچھ نہ کریں۔ اور سن لے! مجھے گتا دیکھے تو تُو ان شہدوں کو چلتا کر دیجو۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجرم اگر اِس راہ سے نکل بھاگنا چاہیں تو تیرے نکھّے انھیں جانے نہ دیں۔"

بڑھیا مسندِ عالی دریاخان کو گاہکوں کے چبوترے پہ بٹھا کے چلی گئی اور ذرا دیر میں چار مُشٹنڈوں کو گھیر لائی؛ ان میں دو تو اس کے اپنے ہی بیٹے تھے۔ کہنے کو یہ چاروں بازار میں حمالی کرتے تھے مگر بازار والے جانتے تھے کہ انھیں حمالی سے زیادہ پتھر پہ کھڑیا سے لکیریں بنا کے کوڑیوں، ٹھیکروں سے کھیلنا اور بطیوں، بوروں، ٹوکریوں سے گرا پڑا سامان سمیٹ کے چل دینا ہی آتا تھا۔ کسی باحیثیت رہ گیر کو تک لیتے تو دائیں بائیں دیکھ کے دستِ سوال بھی دراز کر دیتے تھے۔ ایک بار دیوانِ قانون کے اہل کار اُس کے اِن بیٹوں بھتیجوں کو جرمِ گداگری میں کھینچ کے لے جا بھی چکے تھے۔ مختصر یہ کہ چاروں اس قابل تھے کہ ثبوت، شہادت، گواہوں، استغاثوں کے بغیر ہی سلطانی جلادوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو انسب تھا۔

خیر، شہدوں نے صدر دروازے کی نگرانی شروع کر دی اور بڑھیا دریاخان کو مکان کا عقبی راستا سمجھانے لے چلی۔

پچھواڑے گلی کا عجب حال تھا۔ مکان دار کی بے توجہی سے یا شاید جان بوجھ کے چھوڑی گئی خودرُو گھاس اور اونٹ کٹارا جھاڑیوں کی وجہ سے گلیارا جیسے جنگل بیابان ہو رہا تھا۔ خودرُو درخت قدِ آدم سے زیادہ بلند تھے اور بہت گھنے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پتّوں شاخوں کے پیچھے مسلسل دیوار ہے کہ کوئی دریچہ، روشن دان یا موکھا ہے۔ گلیارے میں سنّاٹا تھا۔ دریاخان اور بڑھیا کسی خرخشے کے بغیر مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران دیوار کے برابر آگے پیپل کے ایک آدھ کچرے درخت کے پاس بڑھیا جا کھڑی ہوئی اور اشارے سے بتانے لگی تو دریاخان کو پتّوں کے جھگڑے اور جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ میں ایک بڑا سا دریچہ نظر آیا۔ بڑھیا اگر اشارہ نہ کرتی تو دریاخان نکلا چلا جاتا؛ دریچہ اسے ہرگز نظر نہ آتا۔ اس جگہ فرشِ زمین پر گھاس بھی جیسے تہ در تہ اگی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اشارے سے بانس کی ایک سیڑھی بھی دکھائی جو گھاس میں چھپی پڑی تھی۔ کہنے لگی، "دریچہ اندر باہر سے کھلا رہتا ہے۔ کیا خبر کب ان نصیب جلوں کو بھاگنا پڑے۔ آقا! تم بلا تامل مکان میں اُتر جاؤ۔

Scanned with CamScanner

دریا نے سیڑھی لگا کے دیکھا، دریچہ پرانی مگر مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ پٹوں کی سائکل کاری لوہے کی موٹی پھڑیوں، سانکلوں سے ہوئی تھی۔ بند کرنے کو ایک کنڈا سانکل باہر کو ایک اندر کو لگا تھا۔

دریا نے بڑھیا سے کہا، "سن، میں جاتا ہوں۔ تو صدر دروازے کا خیال رکھنا۔"

وہ خوش ہو کے بولی، "جی آغا!" اور جانے کو ہوئی۔

دریاخاں بولا، "شمیر تو نیک بخت! میں اندر اُتر جاؤں تو باہر سے تو دریچے کے پٹ بند کر کے کنڈا چڑھا دینا۔"

وہ بولی، "کیا فرماتے ہو؟" بڑھیا کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے، وہ وہی ہے جو آغا چاہتا ہے ــ ایسے پُرخطر مکان میں خود کو اس طور بند کر لینا کہ صدر دروازہ مسدود ہو تو ان قاتلوں سے بچ نکلنے کی کوئی اور صورت نہ رہے۔ یقیناً بڑھیا کے سننے سمجھنے میں فرق ہے۔ کون ایسا پاگل ہو گا جو اس مکان میں بند ہونا چاہے گا۔ پوچھنے لگی، "کیا فرمایا؟ پھر کہو آغا۔ تمھارا حکم کس طرح ہے؟"

دریاخاں جو چاہتا تھا اس نے پھر بتا دیا۔ عورت کو شک سا ہوا کہ یہ حاکم آسیب مارا یا سِڑی دیوانہ ہے۔ یہ اگر بند ہو گیا اور مارا گیا تو بڑھیا کے انعام کی اشرفیاں تو سمجھو گئیں۔ وہ دریاخاں سے حجت کرنے پہ تُل گئی۔ خان چڑ گیا۔ کہنے لگا، "نیک بخت! بے کار باتیں نہ بنا۔ میں ملک التجار نہیں، سپاہی ہوں۔ غلط کاروں کی گرفت کرنے کا فوری اور سادہ طریقہ اختیار کرتا ہوں، یعنی شمشیر کے اور تلوار کے ذریعے۔" پھر اس نے کمر سے تلوار کھینچ ہاتھ میں لے لی۔ بڑھیا کو اشارہ کیا اور سیڑھی چڑھ کے مکان میں اتر گیا۔

قہوہ فروش بڑھیا کیا کرتی ــ اُس نے اِس مضبوط الحواس آغا کو اِس خطرناک مکان میں، سمجھو سانپوں بچھوؤں بھری بانبی میں، بند کر دیا۔

مسندِ عالی دریاخاں حجاب کوئی لڑکا بالا نہیں تھا جو اِس نحوست آثار مکان کی ویرانی، بے رونقی سے وحشت زدہ ہو جاتا۔ وہ ایک پختہ کار سپاہی، درجنوں معرکے، سیکڑوں لڑائیاں جھیلا ہوا سردار تھا، جس نے دربار دیکھے تھے، انھیں برتا تھا۔ کتنے ہی دریاؤں، ندی نالوں کو کبھی تیر کے کبھی کشتی ناؤ سے کبھی اصیلوں کی پشت پر عبور کیا تھا۔ جنگل بیلے راتیں گزاری تھیں۔ لاشوں کے انبار دیکھے اور

خود بھی کشتوں کے پُشتے لگائے تھے۔ اس نے عالی مرتبت سرداروں سے لے کے آدھے دام کی چادر چُرانے والوں تک کے معاملات فیصل کیے تھے۔ تاہم عجیب بات تھی کہ اِس وقت اِس مکان میں وہ بے کیف ہو رہا تھا۔

دریچے سے مکان میں پہنچنے کے بعد ہی سے دریا نے خود کو نفرین کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ مَیں خود کو کہاں لے آیا۔ وہ ایک اچھا منتظم تھا اور اِس بات پر برہم تھا کہ اُس نے اِس قصبے میں کوڑی بھر فراست کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ جوں ہی اُس نے دیکھا تھا کہ الانزو دیوانِ قانون کے اہل کاروں سے چھپ رہا ہے، اُسے بڑھ کے الانزو کی گدّی ناپ دینی چاہیے تھی۔ بہرحال، جو ہوا۔

جس نحوست نشان کمرے میں اِس وقت کھڑا دریاخان باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا، اُس میں چوکور پتھروں کا شطرنجی فرش بنا تھا جس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑی تھیں۔ مہینوں برسوں کا میل کچیل اِن دراڑوں میں بھر گیا تھا۔ فرش پر گرد کی تہہ جمی تھی اور اِدھر اُدھر سے اُڑ کے آنے والے سوکھے پتّوں کے ڈھیر لگے تھے۔ تعلیم کا کوئی قابلِ ذکر انتظام نہیں تھا۔ عامیوں میں سے اکثر کو ناخواندہ اور محتاج رکھا گیا تھا۔

باہر دالان کی طرف سے کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو دریا دبے قدموں دالان میں نکل آیا جو خاصا چوڑا تھا۔ یہاں بھی فرش پتھر کی سِلوں سے بنا تھا۔ صحن کے رُخ پتھر کی جالیوں سے بنائی گئی ایک نیم قد دیوار تھی۔ جالیاں وقت کے ساتھ ٹوٹ گئی تھیں تو اِن پر بھی زمانے کی گرد جمی تھی اور جالے لگے تھے۔ صحن کا حال اُس گلیارے سے کچھ بہتر نہ تھا جسے دریاخان مکان کے پچھواڑے بھٹکتا آیا تھا۔ صحن میں اُگے جامن، پیپل اور نیم کے پیڑوں پر گرگٹوں اور کیڑے مکوڑوں کی اجارہ داری تھی۔ شوریٰ کی مجلسوں میں بھی وہی سب بھرے تھے۔ وہاں کہیں پتھر کا فرش نظر آتا تھا، کہیں کمر کمر گھاس اُگی تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ آنگن کی جھاڑیاں اور گھاس پھونس سانپوں بچھوؤں سے پٹے پڑے ہوں گے۔ اُس نے گِھن اور نفرت کی پھریری لی۔ وہ حملہ کرتے شیر کا سامنا کرنے کو ہر وقت تیار تھا مگر رینگتی ہوئی چیزیں اور سرد خون والے سرسراتے ہوئے لجلجے جانور اور سازشی ٹولے ___ خدا محفوظ رکھے!

اچانک سامنے دالان میں آواز کے ساتھ دھات کی کوئی چیز آ گری۔ دریاخان کو اگلے کمرے سے کسی کے غصے سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اُس کمرے میں چلا گیا جس سے ہو کر صحن میں

Scanned with CamScanner

آیا تھا۔

دروازے کی اوٹ سے اُس نے دیکھا کہ بکری سے بڑا ایک جانور اُچھل کے دالان میں آ گیا ہے۔ دریاخان نے ایسا چوپایہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اِس کے بدن پر بکری جیسے بال تھے جن کا رنگ گدلا سفید اور بادامی تھا۔ پچھلی ٹانگوں کے مقابلے میں اس کی اگلی ٹانگیں بڑی تھیں اور چلتے وقت یوں لگتا تھا کہ اِس کی کمر یا پچھلی ٹانگیں کبھی توڑ دی گئی تھیں جو پھر صحیح طریق پر جڑ نہیں پائیں۔

یہ جانور جو کتّے اور سیار کی نسل کا تھا، ایک بار غصّے سے کھنکھارا ـــــ یا شاید یہ اِس کی ہنسی کی آواز تھی۔ دریاخان کو یقین تھا کہ یہ شیطانی جانور اندر کمرے میں کوئی شیطانی کام کر کے آیا ہوگا جس پر آدمی نے پھونک کے اِسے کچھ مارا ہے اور اب یہ اُس پر ہنستا ہے۔ دریاخان محتاب دار نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور تلوار کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اگر یہ منحوس چوپایہ ہنستا ہوا اِس طرف آیا اور اِس نے کمرے میں دریاخان کی بُو سونگھ لی یا اُسے دیکھ کے حملہ آور ہوا، تو دریا نے حساب لگایا کہ پہلا وار اِس کے سر پر کیا جائے گا تاکہ یہ ختم ہو جائے اور دوسرا وار اس کی ٹوٹی ہوئی کمر یا پچھلی ٹانگوں پر کیا جائے گا تاکہ بعد میں بھی یہ بلیس آثار چلتا ہوا قریب نہ آ سکے۔ اِس کی منحوس ساخت ـــــ بالوں کا گھناؤنا رنگ اور اِس کی نفرت انگیز ہنسی بتا رہی تھی کہ اِس طرح کی چیزیں مرنے کے بعد بھی آگے بڑھ کے اپنے مارنے والے پر حملہ کر سکتی ہیں۔

دریاخان پھر ایک بار بڑبڑایا کہ "پناہ بہ خدا! یہ میں کس شیطانی طلسم میں آ گیا ہوں۔"

جانور کی ہنسی ابھی جاری تھی کہ ایک آدمی جھپٹ کے کمرے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی لمبی سی لکڑی تھی جو اُس نے چوپائے کی کمر پر ماری۔ اُچٹتی سی چوٹ لگی ہوگی جو جانور ہنستا ہوا بھاگا اور دالان کی ٹوٹی ہوئی جالی سے نکل کر صحن کے جھاڑ جھنکاڑ میں غائب ہو گیا۔ دریا نے سنا، وہاں وہ اپنے کسی بھٹ میں چھپا ہوا ابھی تک دبی ہوئی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔

عجیب الخلقت چوپائے کا پیچھا کرنے والے نے بڑبڑاتے ہوئے جھک کر فرش سے دھات کی وہ چیز اٹھائی جو اُس نے چوپائے پر پھینکی تھی۔ یہ بڑا سا کف گیر تھا۔ کف گیر اور جلتی ہوئی لکڑی اٹھائے وہ شخص بڑبڑاتا ہوا لوٹ گیا۔

بڑھیا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ باورچی ہوگا اور باورچی خانے میں گیا ہوگا۔ دریاخان

کے ذہن میں مکان کا نقشہ بنتا جا رہا تھا۔ آگے خادموں کے کمرے ہوں گے، جس کے بعد زینہ ہوگا جو اوپر مہمان خانے کو جاتا ہے۔ بڑھیا کے خیال میں الانزو کو مہمان خانے میں ہونا چاہیے۔

دریا خان کو جب اطمینان ہو گیا کہ باورچی اب واپس نہیں آئے گا تو وہ نکلا اور دبے قدموں دالان میں چلتا اُس کمرے کے آگے پہنچا اور اُس در کے سامنے سے گزرا جس سے وہ جشی چوپایہ کھنکارتا تمسخر کرتا برآمد ہوا تھا۔ یہاں خادموں کے کمرے تھے جن میں سے بعض مقفل نظر آئے۔ ایک سے اس نے کسی مرد کے کھانسنے کی آواز سنی۔ جھانک کے دیکھا کہ جو کھانستا تھا، گودڑ بستر پہ چادر لپیٹے پڑا تھا۔ سانس لینے کے ہموار انداز سے پتہ چلتا تھا کہ سو رہا ہے۔ دریا خان رسانیت سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا، قدرت نہیں چاہتی کہ یہ جل گرفتہ بدمعاش میرے ہاتھ سے مارے جائیں۔ ویسے بھی اِس قبیل کے لوگوں کے خون سے اپنی تلوار ناپاک کرنا مناسب نہیں۔ ایسے غلط کار تو جلادوں کے لیے ہوتے ہیں۔

وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا تھا۔ اوپر فرش پر لکڑی جڑی تھی اور فرش اور سیڑھیوں پر سستے بچہ مزدوروں کے ہاتھوں بنوائے ہوئے کھردرے بھدے قالین پڑے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کے دریا خان نے سب طرف نظر دوڑائی۔ دُور تک کوئی نہیں تھا مگر وہ ٹھٹک گیا۔ اگر یہ وہم نہیں ہے تو اُسے ایک جوان عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ وہم نہیں تھا ــــ کچھ دیر بعد اُسے پکھاوج کی گمک اور تان پورے کی ترنگ سنائی دی۔ عورت پھر ایک بار ہنسی۔ وہ ابھی ہنستی تھی کہ سارنگی کی دل گداز آواز جیسے بین کرتی ہوئی چلی۔ بجانے والوں نے کوئی حزنیہ دُھن شروع کر دی تھی۔ عورت کی ہنسی ڈوب گئی۔

ربّ العالمین! یہ اُس منحوس سامری کا کارخانہ ہے کہ کسی گانے بجانے والی کا مکان؟ یہ تو موت کے سوداگر ہیں، یہاں گانا بجانا یعنی چہ؟ سازوں کی آواز ہلکی ہوئی تو عورت نے بھرپور قہقہہ مارا۔ بڑی کھل کھیلتی ہوئی آواز تھی ــــ طے شدہ طور پر بازار کی آواز۔ اب ایک مرد نے گھوں گھوں کرتے ہوئے کچھ کہا۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے، تاہم بولنے والا شہر کے بوتا یا کلنٹ کرتا معلوم ہوتا تھا۔ عورت مرد دونوں نے قہقہہ لگایا۔ بڑھیا کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق یہ آوازیں مہمان خانے سے آ رہی تھیں۔ ''اگر مہمان خانے میں الانزو ہے تو مجھے پہلے اسے قابو میں کرنا ہوگا۔''

دریاخاں ابھی کوئی معقول حکمتِ عملی تیار نہ کر سکا تھا کہ مہمان خانے سے زور و شور سے ساز بجنے کی اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اِس بار کوئی طربیہ دُھن بجائی جا رہی تھی۔ گانے والی کسی اجنبی زبان میں گاتی تھی۔ حیرت ہے، بڑھیا نے ایسا تو کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ یہاں گانے بجانے والے بھی رہتے ہیں۔ خیر، ہو سکتا ہے صاحبِ خانہ مہمانوں کی تواضع اِس طرح کرتا ہو۔

دریاخاں کمرے کے ٹوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازے سے کمرے کا خالی حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک بے حیثیت قالین جگہ جگہ سے پھٹا اُدھڑا ہوا کمرے کے فرش کو چھپائے تھا۔ دریا کو چھپر کھٹ کا ایک پایہ بھی دکھائی دیا۔ ابھی تک سوچا آدمی کوئی نظر نہ آیا تھا۔ ایک پرانے چوبی تخت کا سرہانا ضرور دکھائی دے رہا تھا جس پر میلے چیکٹ گاؤ تکیے رکھے تھے اور تکیوں سے ٹیک لگائے ایک عورت بیٹھی سارنگی بجاتی تھی۔ اُس کی صرف پشت دکھائی دیتی تھی۔ عورت کسی طرح کا جھر جھرا، جھینا لباس پہنے تھی، جس کے پار سے نیچے پہنے حرم کا رنگ، ساخت اور ڈوریاں تک نظر آ رہی تھیں۔ برابر ہی پکھاوج بجانے والی تھی جس کا آدھا چوتھائی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اُجلی رنگت کی جوان عورتیں تھیں۔

دریاخاں ابھی ساز بجانے والیوں کا جزوی منظر دیکھتا تھا کہ اندر کمرے کی دیوار پر اُسے چمک سی دکھائی دی۔ پردہ ہلا تھا۔ اُس نے کجلایا ہوا سا قدِ آدم آئینہ دیکھا۔ آئینے پر دو عکس واضح تھے۔ چھپر کھٹ کے تکیے سے ٹیک لگائے افانزو پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور اُس سے بالکل بھڑی ہوئی اُجلی رنگت کی ایک جوان عورت بیٹھی تھی جس کی آنکھیں سبز اور بڑی بڑی اور سُرمے سے سنواری ہوئی لگتی تھیں۔ یہی عورت تان پورا اٹھائے گا رہی تھی۔ افانزو کی توجہ اس کے گانے پر نہیں تھی۔ وہ اُس کے لباس کی سلوٹوں میں جیسے کچھ ڈھونڈتا تھا — حرام الدّہر، بدمعاش!

اس نے — دریاخاں نے — یہ سب دیکھا اور سوچا، یہاں دارالحکومت میں، اقامت گاہِ سلطانی کے بہر حال نزدیک ہی، یہ کیا ہو رہا ہے؟

اُس نے سوچا، دیوانِ شرطہ کو کیا ہوا؟ کیا سب پرچہ نویس اور مخبر نااہل ہو گئے؟ یا وہ بددیانت ہیں؟

مگر سوچنے کی بات ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ پرتگالی افانزو اپنے مزاج کے مطابق لطف و تفریح کے لیے یہاں آتا رہتا ہو اور میں ایک غیر ضروری محتسب اور مداخلت کار کی طرح اس

کی تفریح اور خلوت میں کھنڈت ڈالنے یہاں گھس آیا ہوں؟ مجھے کیا! بہت کروں گا تو ایک تحریری بیان دیوانِ قانون کو ارسال کر دوں گا کہ فلاں فلاں جگہ شراب نوشی کا اہتمام شاید کسی صاحبلے، اجازت نامے کے بغیر کیا جاتا ہے، اور ایسی ایسی سرگرمیاں جاری ہیں۔ باقی وہ جانیں، اُن کا کام۔

دریاخان مجاب وار ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اُس نے ایک بہت ہی بھیانک دھماکا سنا مگر نہیں یہ دھماکا اُس کے سر میں ہوا تھا۔ اُس نے گھوم کے دیکھنا چاہا، گھوم نہ سکا۔ کوئی کند چیز پھر اس کی کنپٹی پر آ لگی، اور کوشش کے باوجود دریا خود کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے میں ناکام ہوا۔

وہ تیور کر گرنے لگا تو دائیں بائیں سے نکل کے آگے آنے والے پانچ سات شہدوں نے اُس بلند قامت سردار کو سنبھالا اور اُسے اٹھائے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ افانزو کی مے نوشی، اُس کا بے محابا تجسس اور گدگدائی گئی عورت کے فحش قہقہے جاری رہے ۔۔۔ ساز وغیرہ بھی بجتے رہے۔

آنکھ کھلی تو دریا نے دیکھا کہ اُسے پلنگ پر لٹا کر مضبوط رسّوں کی مدد سے اِس طرح باندھا گیا ہے کہ اُس کے لیے ہلنا بھی ممکن نہیں۔ سر اُس کا بہت بُری طرح درد کرتا تھا اور بھوک کسی درندے کی طرح بدن کے بیچ بیٹھی اُسے بھنبھوڑے ڈالتی تھی۔

"معاذاللہ! کیا تباہی ہے! خدا کے سوا دماغ کچھ بھی سوچنے سے انکاری ہے۔" پھر بھی غصّے کی ایک لہر نے دریاخان کے بدن میں غیر معمولی طاقت بھر دی۔ اُس نے زور لگا کے رسّیاں تڑانا چاہیں۔ "اگر ابھی اس بندش سے آزاد ہو جاؤں تو اِن حرام خور غلط کاروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ وہ تعداد میں بیس ہوں یا پچاس، مجھ پر ان بے ادب ناطرجاسوں کو سزا دینا لازم ہے۔ غضب خدا کا! رہزنوں، حرام خوروں نے مجھے اپنی لاٹھیوں سے زدوکوب کیا؟ مجھے؟ دریاخان کو؟"

مگر فوراً ہی اُسے یاد آیا کہ یہ رہزنی کی واردات نہیں۔ دریاخان آپ ہی اِس گھر میں چوری سے داخل ہوا ہے۔ مملکت کے قانون کے مطابق اجازت کے بغیر گھر میں اِس طرح داخل ہونا جرم اور قابلِ مواخذہ ہے۔ "پھر بھی... پھر بھی غور طلب بات یہ ہے کہ ان بدقماشوں نے مجھے زدوکوب ... مگر نہیں مجھے اصل بات یاد رکھنی چاہیے... اصل بات یہ ہے کہ پرتگالی طبیب زادے کی مدد سے یہاں کوئی سازش تیار ہو رہی ہے۔ شاید میرے سلطان یا سلطانہ کے خلاف۔ ایسی صورت میں اپنے

مرتبے اور عہدے کی رُو سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اِس گھر میں ـــ یا کسی بھی گھر میں جہاں سازش ہو رہی ہو، بہ زور یا بہ حکمت داخل ہو جاؤں اور مجرموں سازشیوں کا حساب لوں۔ مگر ناں ناں ناں، یہ بات تو مجھے کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ جہاں سلطان یا سلطانہ کے نام آ جاتے ہیں، ہر درباری عہدے دار کو وہاں بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ یہ سازش والی بات تو کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کہا جائے؟ ہاں! مجھے کہنا چاہیے کہ اصل میں تیں ملک اشتہار ہوں۔ مشرق، جنوب یا شمال سے آیا ہوں۔ کسی سے سنا تھا کہ یہ ساری موثر زہر تیار کرتا ہے۔ بس آ گھسا۔ آگے پھر وہی کہانی نافرمان کنیز والی، جو میں نے قہوہ فروش بڑھیا کے لیے تیار کی تھی۔'

دریاخاں ابھی تک اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ لوہا چڑھی جریب اٹھائے ایک کریہہ صورت غلام کمرے میں آ گیا۔ کمرہ کیا تھا، یہ جگہ کسی تہہ خانے کا خالی ڈھنڈار حصہ لگتی تھی۔ اِدھر اُدھر بے کار سامان پھیلا پڑا تھا۔ غلام نے آتے ہی پُرشور انداز میں ایک پرانا صندوق کھینچ لیا اور صندوق پر بیٹھ کر وہ سکون سے لاٹھی ٹیک، فرش کو ایسے دیکھنے لگا جیسے خاص اِسی کام کے لیے آیا ہے۔

دریاخاں نے غلام کو مخاطب کیا، "او نامراد! مجھے کھول۔ ایسے کیوں بیٹھ گیا؟ مجھے کھول، اپنے مالک کے پاس لے چل۔"

جریب والے غلام نے جیسے اَن سنی کر دی، بے تعلق بیٹھا رہا۔

"خبیث غلام زادے! مجھے کھول دے۔ سنتا ہے؟ مجھے کھول، ورنہ تیرے ساتھ بہت بُری ہو گی۔"

غلام نے پلک تک نہ جھپکائی۔

"تیرا مالک کہاں ہے؟ اُسے بلا اور مجھے آزاد کر۔ کیا کہہ رہا ہوں، سنتا کہ نہیں؟"

غلام نے جماہی لی اور نیم وا آنکھوں سے دریاخاں کو دیکھا، بے تعلقی سے مسکرایا اور پھر لاٹھی کی ٹیک لگائے فرش کو تکنے لگا۔

دریاخاں غصے کی بے بسی میں چیخ کے بولا، "او بدانجام! لعنت ہو تجھ پر! ایسا بیٹھا ہے جیسے بہرا ہو، خبیث۔"

عقب سے ایک نرم مردانہ آواز نے شُستہ سے لہجے میں کہا، "آپ نے ٹھیک فرمایا، وہ بہرہ ہے اور گونگا بھی۔"

Scanned with CamScanner

دریا نے سر گھما کے دیکھنا چاہا، مگر بالکل عقب میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔ جھنجلا کے اُس نے مطالبہ کیا، "سامنے آؤ۔ کون ہو تم؟"

"آغا پہلے اپنا تعارف کرائیں گے۔ صاحبِ خانہ سے متعلق ہونے کے سبب یہ حق میرا ہے کہ میں آپ سے سوال کروں ـــــ بتائیے، کون ہیں آپ؟" بولنے والے کا تپاک واضح طور پر مصنوعی تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی دریا خان مشتعل ہو گیا۔ "ذلیل غلام زادے کی بے ضابطہ اولاد! مجھے کھول دے ـــــ پھر میں بتاؤں گا کہ کون ہوں۔"

"چچ چچ، چچ چچ ـــــ آغا! آغا!" بولنے والے نے بہت نرمی سے ملامت کی۔ کہنے لگا، "آغا! یہ بدکلامی آپ کی شان کے شایان نہیں۔"

"تُو کون ہے۔ سامنے آ۔"

"ناں ناں۔ پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں گے۔"

جیسا کہ سوچ کے بیٹھا تھا، دریا خان نے بتایا کہ وہ شمال سے آیا ہے، مسالوں کا تاجر ہے اور اُس "ملعون" سے ملنا چاہتا ہے جو گھر میں بیٹھا ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کیا کرتا ہے۔

عقب سے بولنے والا ہنسا، "اُس ملعون سے ملنے کیوں آئے ہو؟"

"یہ میں اُسی کو بتاؤں گا۔"

"مجھے بتا دو۔ میں تمہاری بات اُس تک پہنچا دوں گا۔"

بس یہ دریا خان حجاب دار نے وہی کنیز سے نجات حاصل کرنے والی بات کہہ دی اور جب اُس نے پوچھا کہ مکان میں اِس طرح داخلے کی ضرورت کیوں پیش آئی تو کہہ دیا کہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ زہر ساز ساحری کے سبھی خادم رشوت خور بے دین ہیں، پیسے لے کر بھی مجھے اُس سے نہیں ملنے دیں گے۔ اِس لیے مکان میں پوشیدہ طور پر داخل ہوا ہوں۔ جب اُس نے سوال کیا کہ داخلے کا یہ رستا اُسے کس طرح معلوم ہوا تو دریا کو بوڑھی قہوہ فروش کا ذکر کرنا پڑا۔ پوچھنے لگا، بوڑھی کو تم کب سے جانتے ہو، تو بولا، "آج پہلی بار اُس کی منحوس شکل دیکھی ہے۔"

"یعنی پہلے اس بوڑھی سے معاملت نہیں رہی؟"

دریا نے کہا، "نہ۔"

"تو پہلے کس سے معاملت رہی تھی؟ ــــ اُس دوسرے قہوہ فروش سے؟"

"ہاں۔"

"اُس سے کس نے ملوایا تھا؟"

"ایک تاجر نے۔"

"نام؟"

"تُو تاجر کا نام پوچھتا ہے یا اس حرام زادے قہوہ فروش کا؟"

عقب سے بولنے والا ہنسا، "اُس حرام زادے کا نام ہی بتا دو۔"

دریاخان نے منہ پر کف لا کر تھوکنے کی آواز نکالی۔ اِس طرح کے سوال جواب اُسے مشتعل کر دیتے تھے۔ تاہم پوچھنے والے نے اپنے نرم مصنوعی لہجے میں پوچھا، "اگر اُسے ــــ قہوہ فروش کو یہاں بلوائیں تو وہ تمہیں پہچان لے گا؟"

"کیوں نہیں،" دریاخان نے درشتی سے کہا۔ "کیسے نہیں پہچانے گا۔ اُس نابنجار کو بھی تو پیسے کھلائے ہیں۔"

وہ ہنستا ہوا سامنے آ گیا۔ شائستہ لہجے میں بولا، "تم اپنے سردار کو جھوٹ پہ جھوٹ بولتے دیکھ کے مجھے خفت ہو رہی ہے آغا!" دریا نے دیکھا، یہ وہی قہوہ فروش تھا جو اُسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر مکان میں لایا تھا۔

دریا نے پھر تھوکنے کی آواز نکالی۔ کہا کچھ نہیں۔

قہوہ فروش نرمی سے بولا، "ہم تو سبھی کے خادم ہیں ــــ اب کہو، حکم کرو۔"

دریاخان کا اصرار تھا کہ اُسے کھول دیا جائے اور فی الفور صاحبِ خانہ سے ملوا دیا جائے۔ قہوہ فروش پوچھتا تھا، اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دریاخان اشتعال میں آ کر خود اُسے یا صاحبِ خانہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟

اسی حیص بیص میں بہت وقت گزر گیا۔

بالآخر طے پایا کہ دریاخان کلام اللہ کو گواہ کر کے اور اپنی تلوار کی قسم کھا کے اقرار کرے گا کہ گھر والوں کے پُرامن رہتے خود پُرامن رہے گا اور نہ قہوہ فروش پر اور نہ صاحبِ خانہ پر حملہ کرے گا، سکون کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرے گا، پھر مہمانوں کی طرح رخصت ہو جائے گا۔

اب جب کہ باہمی سلامتی کا معاہدہ طے پا گیا تھا تو قہوہ فروش کا انداز یکسر بدل گیا، گڑگڑیا کر

Scanned with CamScanner

بولا، "عالی جاہ! یہ غلام اپنے اہل کاروں کی جانب سے معافی کا خواستگار ہے اور خود اپنی طرف سے بھی سو ہزار دفعے معافی مانگتا ہے۔ کیا کریں عالی مرتبت! ہمارا کام ہی سسرا بُرا ہے۔ پھر حضور جو اچانک عقبی راستے سے تشریف لے آئے تو..."

دریاخان نے کہا، "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

مگر قہوہ فروش بے رُکے بولے جا رہا تھا کہ حضور اُس بڑھیا ڈھڈو ہی کو پابند کر دیتے ـــــ وہ دستک دے کے کسی کو بلا لیتی۔ میری تو کیا اوقات ہے عالی جاہ! واللہ باللہ خود صاحبِ خانہ پیشوائی کو آتا۔ اور یہ کہ توبہ توبہ کیسی تقصیر ہوئی ہے ہم غلاموں سے۔ ۔

دریاخاں مُجاب دار جھنجھلا گیا۔ بولا "چل چل، آور باتیں نہ بنا بے غیرت، اب ہمیں کھول بھی دے۔"

"حاضر حاضر،" کہتے ہوئے قہوہ فروش رسّیاں کھولنے لگا۔ گونگے بہرے جریب بردار نے بھی اُس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ پلنگ سے کھول دینے کے بعد دونوں بدمعاشوں نے مستعدی سے دریاخان کے ہاتھ پیر سونت کر دورانِ خون بحال کیا۔ دریاخان کی پاپوشیں، کمر سے باندھنے کا دوپٹا، دستار کا جیغہ، رقم والی چمڑے کی تھیلی ـــــ غرض ہتھیاروں کے سوا تمام سامان سامنے لا رکھا۔ قہوہ فروش نے دریا کو اپنے ہاتھ سے پاپوشیں پہنائیں، دوپٹا باندھا، دونوں ہاتھوں پر رکھ رکھ کے سب چیزیں دیتا رہا، مگر جب اُس نے ہتھیار طلب کیے تو کھیسیں نکال کے بولا کہ عالی مرتبت ہم تو بڑے کم زور بے حیثیت لوگ ہیں؛ حضور کے ہتھیاروں کو ایک بار ہاتھ لگانے کی جسارت تو جیسے تیسے کر گزرے تھے، اب ہمت نہیں کہ دوبارہ ہاتھ لگاویں۔ عالی مرتبت جب مکان سے تشریف لے جاویں گے تو وہیں ڈیوڑھی میں تخت پوش کے گدیلوں پہ دونوں ہتھیار رکھے ملیں گے؛ سرکار اپنے دستِ مبارک سے ہی لیجیے گا۔

دریاخان اِس حرام الدہر چاپلوس کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے جب تک دریا اِس مکان میں ہے وہ لوگ اسے غیر مسلّح ہی رکھیں گے۔ برا سا منہ بنا کر بولا، "چل ـــــ اِس منحوس تہ خانے سے تو نکل۔"

الغرض آگے آگے قہوہ فروش چراغ اٹھائے ہوئے راستا دکھاتا، پھر دریاخاں، اور آخر میں گونگا بہرا غلام، یہ چھوٹا سا جلوس ناہموار سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہ خانے سے نکلا اور ایک کچے صحن میں

Scanned with CamScanner

پہنچ گیا۔ یہاں کہیں ہاتھ ہاتھ بھر اونچی گھاس تھی اور کہیں بے ترتیب قطعوں میں گھناؤنے رنگوں اور نامانوس شکلوں کے پھولوں اور پتوں سے ڈھکی جھاڑیاں تھیں جن کی شکل وصورت اور بدبو ہی سے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ زہریلی جڑی بُوٹیاں ساری منسوں کی زہرسازی میں کام آنے والی چیزیں ہیں۔

دریاخان نے اوپر کہیں ساز بجنے کی آواز سنی۔ پرتگالی اٹازنو ابھی تک اپنی سے خوشی اور جشن میں مصروف تھا۔ دریا نے قہوہ فروش کی طرف دیکھا۔ "یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے دن کے اوقات میں رات کی مصروفیات جاری رکھی ہیں؟"

قہوہ فروش نے کوئی جواب نہ دیا، خوشامد سے ہنسنے لگا۔

دریا بولا "میں انھی نافہم لوگوں کو دیکھنے بڑھا تھا جو تیرے آدمیوں نے عقب سے حملہ کر دیا۔"

قہوہ فروش بولا، "غلام کو اور شرمندہ نہ کیجیے عالی جاہ!"

دریاخان نے منہ بگاڑ کے کہا، "تیری شرمندگی میرے سر کا درد دور نہیں کرسکتی۔"

وہ بولا "یہ حقیر اپنے استاد سے سردرد کی کوئی زُود اثر مجرب دوا لے کر حضور کو پیش کر دے گا۔"

دریاخان نے پریشان ہوکر ہاتھ بلند کیے، "پناہ بہ خدا! تیرے استاد کی مجرب دواؤں سے خدا بچائے رکھے۔"

قہوہ فروش خوش دلی سے ہنسا، بولا کچھ نہیں۔

جڑی بوٹیوں والے صحن سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے یہ تینوں ایک اور ویران دالان میں پہنچے۔ ہرچند یہ جگہ صاف ستھری تھی مگر بے رونق اُتنی ہی تھی جتنا گھر کا کوئی بھی حصہ۔ دالان سے ایک سنگی زینہ اوپر گیا تھا۔ زینے پر موٹی بانات کی دری بچھی تھی۔ ایک اور لٹھ بند زینے کی شروعات پر اپنی جریب سے ٹیک لگائے ڈھیلا ڈھالا کھڑا تھا ــــ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ دونوں لٹھ بند زینے کی شروعات پر رکے رہے۔ دریا اور قہوہ فروش چڑھتے چلے گئے۔

کئی طرح کے دروازوں سے گزرتے، دالانوں کو پار کرتے یہ دونوں ایک ڈہرے کمرے میں پہنچے اور ایک بھاری بھرکم دروازے کے سامنے جارکے۔ قہوہ فروش نے دستک دی۔ جواب میں

Scanned with CamScanner

اندر سے کسی نے کچھ پوچھا۔ قہوہ فروش نے کچھ کہا جس پہ دروازہ کھول دیا گیا اور قہوہ فروش کو اندر بلا لیا گیا۔

دریاخان کو انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار قہوہ فروش اور ایک بلند قامت چوب دار کمرے سے برآمد ہوئے۔ چوب دار باہر رہ گیا، قہوہ فروش دریا کو لے تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر مکمل تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو دریاخان کو کمرے کے صدر میں بچھی ایک بھاری بھرکم کرسی میں ایک ہیولا بیٹھا دکھائی دیا۔ یہ پستہ قد مسخنی آدمی اس بڑی کرسی میں سامنے کے رخ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایسی نشست کے باوجود اس کا پورا سراپا کرسی میں سما گیا تھا۔ کچھ کرسی بڑی ہو گی، کچھ یہ چھوٹا تھا۔ آدمی کے اس ہیولے نے پیروں میں زرکار پاپوشیں بھی رکھی تھیں جن میں شاید یاقوت جڑے تھے۔ دریا نے سوچا، ہو سکتا ہے یہ اصل پتھر نہ ہوں، بے حیثیت نگوں سے سجاوٹ کی گئی ہو۔ جو بھی تھا، دریا کو اس کی جوتیوں کے نگے دیکھنا برا لگا۔

یہ بات ہیولے نے محسوس کر لی۔ آہستہ سے کہنے لگا، "میری معذوری ہے بندہ نواز! کوئی بے ادبی مقصود نہیں۔ میں اپنے گھٹنے نہیں موڑ سکتا۔' پھر کچھ ٹھیر کر بولا 'خوش آمدید! مجھے عزت بخشی۔"

اس کی آواز ایسی تھی جیسے شام پڑے کنجوں میں چڑیاں شور کرتی ہوں۔

دریا نے جواباً کہا، "ہوں۔" پھر بےوجہ پوچھا، 'تم صاحبِ خانہ ہو؟"

ہیولا اپنی چہچہاتی آواز میں بولا، "آپ کا خادم!"

دریا نے کہا، "بھلے آدمی! اپنے ملازم سے روشنی لانے کو کہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل تو دیکھیں۔"

ہیولا اسی چہچہاتی آواز میں ہنسا، "میں بدصورت آدمی ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کے بے کیف ہوں گے اور آپ کا مبارک چہرہ میں صرف انگلیوں کے پوروں سے چھو کر دیکھ سکوں گا ــــ نابینا نہیں ہوں تاہم پوری طرح دیکھ نہیں سکتا۔ چھو کے، چکھ کے، سونگھ کے اور سُن کے پہچان لیتا ہوں۔'

"ہوں،" دریاخان نے ہنکارا بھرا۔

وہ چہچہایا، "بعض معاملات میں بصارت سے زیادہ بصیرت کام آتی ہے۔"

"مثلاً کیسے؟"

"مثلاً حضور کا یہ فرمانا کہ آپ کے تردّد اور ملال کی وجہ کوئی نافرمان کنیز ہے، جی کو نہیں لگا تھا۔ اب آپ کی آواز سن کے یقین آگیا کہ ہو نہ ہو کنیز کا نام مصلحتاً لیا گیا تھا۔ کس لیے کہ آپ تاجر نہیں صاحبِ سیف سردار ہو۔ کنیز سے خفا ہوتے تو اُسے بے تامل کاٹ کے پھینک دیتے ___ میرے پاس آنے کی زحمت کیوں کرتے۔"

دریا نے کہا، "ہُوں ___ اور؟ اور کیا؟"

وہ بولا، "اور یہ کہ حضور لشکروں کی سالاری کرتے رہے ہیں، تاہم اِدھر چند برسوں سے درباروں میں رہنا ملا ہے۔"

دریا خاں حیران ہوا۔ کہنے لگا، "خوب!"

"اور درباروں کا یہ ہے کہ ہم رُتبہ سرداروں میں چشمکیں چلتی ہی رہتی ہیں۔"

ہیولا شاید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پچھلے دنوں دبیرِ دولت شادی خاں سیہ رُو سے دریا کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ ہُنہ! سبلوچہ وہ اس خوف میں رہتا ہے کہ دریا حجاب دار کہیں دبیرِ مملکت کی مسند پہ نہ آن بیٹھے ___ کتنے ہی برس سے بھیڑ کے بچے کی طرح اپنی ٹانگوں پر کھڑا لرز رہا ہے شادی خاں!

ہیولے نے اسے ٹوکا، "حضور کیا سوچنے لگے؟"

"ہوں؟ ___ ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"جی بندہ نواز! اور بڑوں کی چشمکیں کرسیاں ہلانے والی اور تقدیریں بدلنے والی ہوتی ہیں۔ خود عالی جاہ یہاں تشریف لائے، دل نے کہا حضور کا ستارہ اوج پہ ہے ___ حریف آپ کا مُنہ کے بل گرے گا۔"

دریا خاں نے کہا، "چلو ہم پہلے آگئے تو ایسا ایسا ہو رہا ہے اور جو ہم سے پہلے وہ سیہ رُو یہاں پہنچ جاتا تو کسی اَور طرح ہوتا ___ منہ کے بل ہم گر گئے ہوتے۔"

ہیولا چہچہا کر بولا، "ناممکن! یہ پتھر پہ لکھا جاچکا۔ شادی خاں فرتلی کی مسند اُلٹ گئی۔"

"شادی!" دریا خاں کو یوں لگا جیسے اچانک کہیں سے اس پر وار کیا گیا ہے۔

ہیولا کیا ہنسا کہ چڑیوں کی چہکار سے کمرہ بھر گیا۔

دریاخان ہکلا رہا تھا۔ "یہ نام؟ ــــ یہ نام جو تم نے لیا ــــ یعنی یہ کیسے؟"

"غلام غیب داں نہیں ہے۔ عالی جاہ نے بھی خود فرمایا ہے کہ ہم سے پہلے اگر وہ سیہ رُو پہنچ جاتا... دراالحکومت میں کون نہیں جانتا کہ سیہ رُو کون ہے اور سب جانتے ہیں کہ دبیرِ مملکت شادی خان قزلی سب سے زیادہ تشویش کے ساتھ جس عالی مرتبت کے روشن چہرے پر نظریں جمائے رہتا ہے، وہ سردار در۔۔ یا..."

"نام نہیں!" دریاخان نے چمک کے کہا، "نام نہیں! اور اُس سوختہ ساماں کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں ــــ سمجھے؟"

ہیولے نے آہستہ سے کہا، "سمجھا۔" یا شاید یہ دریا کا وہم تھا کہ اُس نے یہ لفظ کہا۔ اندھیرے کمرے میں بہت دیر سے سناٹا تھا۔

یہ کیا وبال ہے؟ میں تو سانپ کی اس بانبی میں داخل ہوا تھا کہ معلوم کروں اور اس مشتبہ ولایتی الانزو کی حرکات سے باخبر رہوں؛ دیکھوں کہ کہیں سلطان یا سلطانہ کے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں تو سب کیفیت ہی بدل گئی۔ شادی سیہ رُو کا قصہ درمیان میں کیوں آگیا؟

سامنے کے اندھیرے سے سیہ کار مرشد کی آواز آئی۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا۔ دریا اپنے ہی خیالوں میں تھا، اس نے غور نہیں کیا یا سُنا نہیں، پوچھنے لگا، "کیا کہتے ہو؟"

ہیولے نے بےوجہ ہلکا قہقہہ لگایا۔ بولا، "عالی منزلت میدان کے شیر ہیں، تاہم مشکل سوالوں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔"

"کیا بکتا ہے؟" دریاخان کو طرارہ آگیا۔

"تو پھر فرمائیے نا کہ حضور کس طرح کی چیز چاہتے ہیں۔ کھانے پینے کے ساتھ دی جانے والی؟ ہتھیار کے چرکے سے اثر کرنے والی؟ عطر یا لباس کے ذریعے بدن میں سرایت کرنے والی؟ آخر کس ڈھب کی دارُو؟"

دریاخان حُجاب دار نے غیظ و غضب کے اظہار میں حلق سے بےمعنی آواز پیدا کی۔ جو ہیولے نے اَن سُنی کر دی۔ وہ اپنی ہی رو میں بولتا رہا، "ایک صورت اور بھی ہے سرکار! کہ اس شخص کو، جس کے بارے میں ہم اس وقت بات نہیں کرنا چاہتے، ایک ناکتخدا عورت ــــ سمجھو 'وِش کنیا'، خاص مقاربت کے لیے تیار کی گئی فراہم کی جائے جس کی ایک بار کی قربت ہی

مذکورہ شخص کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔ تو یہ اور بہت سے طریقے ہیں۔ اب جیسا بھی ارشاد ہو۔"

یہ کس قماش کا آدمی ہے؟ میری بات کیوں نہیں سمجھتا؟ اور سنتا کیوں نہیں؟ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔ اور تو بھلا شادی خان فرملی کے بارے میں یہ کیسی بکواس کرتا ہے۔ وہ میرا حریف مخالف سہی مگر سچ بات کہنے میں کیا جھجکنا۔ شادی آدمی پاک باز ہے۔ "زِش کنیا" کا حربہ اُس پر نہیں چلنے کا۔ منکوحہ عورتوں کے سوا مقاربت کو وہ منحوس جائز نہیں سمجھتا تو پھر یہ فضول بات ذہن سے نکال دی چاہیے کہ...."

"درست ـــــ" ہیولے نے کہا، "تو بندہ نواز! عورت کو خارج از بحث سمجھو۔ یہ کہو ہتھیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

دریاخان دل ہی دل میں ہنسا۔ ہتھیار؟ شادی خان ہتھیار اپنے ہی استعمال کرتا ہے۔ دوسرے کا ہتھیار چھوتا بھی نہیں۔ بے مثال تلوریا ہے۔ کون ہوگا جو اُسے خراش بھی دے سکے!

بجا ارشاد ہوا ـــــ اچھا اگر عطر یا لباس کے تحفے استعمال کرتے ہوے...؟

نہ عطر نہ لباس۔ ایسے تحائف وہ صرف اپنے قرابت داروں اور دوستوں سے لیتا ہے۔

"اور برتن؟"

دریاخان کو اقازو کے لائے ہوے برتن یاد آئے۔ انہی برتنوں کا پیچھا کرتا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سلطان اور سلطانہ کی سلامتی سے متعلق اپنی تشویش کو یاد کیا مگر ساتھ ہی ہیولے کی چھپاتی ہوئی آواز آئی جس نے خیال کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ کہتا تھا، "عالی جاہ! برتنوں کی حکمت میں دیر لگے گی جب کہ شادی خان سوختہ نصیب کو حضور اور یہ مصلحت شاید اتنا وقت دینے پر تیار نہ ہوں۔"

دریا نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ شادی خان سے نجات جس قدر جلد ممکن ہو، بہتر ہے۔ دبیرِ مملکت کی مسند کے لیے اگرچہ اس نے اتنی چاہت سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، تاہم...

آگے کرسی میں بیٹھے ہیولے نے دریاخان سے اس اہم معاملے میں گفتگو جاری رکھی۔

دریا کی آنکھیں کمرے کی تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہ بے چینی جو اس نے آتے ہی محسوس کی تھی، اب نہیں تھی۔ دریا، شادی خان سیہ رُو کے مسئلے کو طے کر کے جانا چاہتا تھا۔ کیا خوب اتفاق ہے کہ اس شخص نے یہ موضوع خود ہی چھیڑ دیا ہے۔ اس لیے بات فیصلہ کن ہو جائے

تو انسب ہے۔

مگر فی الاصل یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ دریاخان ہیولے تک آ پہنچا تھا۔ اس تاریک کمرے کے مماثل ایسا ہی ایک تاریک کمرہ اور تھا جس میں عین مین اس ہیولے کا ہم شکل ایک سایہ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا چہچہا رہا تھا اور اپنے عالی قدر مہمان دبیر دولت شادی خان فرلٹی کو سامنے بٹھائے عرض کرتا تھا کہ بندہ نواز! غور کیا جائے کہ مُجاب دار دریاخان سے (جو شادی خان کی مسند کے درپے ہے) نجات حاصل کرنے کے لیے کیا حکمت وضع کی جاسکتی ہے؟

اور ایسے ہی ایک اور تاریک کمرے میں ایک اور فراخ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ایسا ہی ایک اور ہیولا خوشامد میں چہچہا رہا تھا اور دریا اور شادی سے ایک زیادہ عالی منزلت ایک تر تاج دار (یا شاید وہ مادہ تھی) کو آمادہ کررہا تھا کہ رعایا پر گرفت رکھنے کے لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بعض عمائد مملکت کو عطر اور لباس کے تحائف دیے جائیں؟ یا برتنوں کے تحفے؟ اور مواصلت کے لیے یہ حکمت تیار کی گئی نا کتخدا عورتوں کے تحفے؟ کس لیے کہ ان شیا سے متعلق حکمت اس خانہ زاد کے پاس فی الوقت موجود ہے۔

اور اس خدائی خوار عمارت کے ہزار خدائی خوار کمروں کی تاریکی سے جیسے سمجھو چڑیوں کی آوازیں چلی آرہی تھیں، جب شام پڑے وہ کنجوں میں شور کرتی اور چہچہاتی ہیں۔

اور یہاں یہ کہانی ختم اور شروع ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

فنکار اور قاری کے درمیان ایک پُل

سہ ماہی

نیا ورق

مدیرہ: ساجدہ رشید

36/38, Alooparoo Bldg., 4th Floor, Room 25,
Umer Khadi Cross Lane, Mumbai 9

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمٰن فاروقی

پوسٹ بکس ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

محمد انور خالد

میں نے تحریر کیا

میں نے گرتی ہوئی دیوار پہ تحریر کیا
جس نے آثارِ صنادید لکھی ہو وہی اسبابِ بغاوت لکھے
اس سے پہلے مگر اک رسمِ ملاقات بھی ہے
یہ بڑھاپے کی سزا ہے کہ جوانی کا عذاب
طشت میں پھول ہیں اور سر پہ سفر کا سورج
اور جو باقی ہے وہ عیار کی زنبیل میں ہے
میں محلات و عمارات سے تجرید کیا
جس نے تاریخِ فرشتہ لکھی
وہی دربارِ عزازیل کا قصہ لکھے
خطِ کوفی میں لکھے شام کے بازار کا حال
نسخ میں فلسفہ و فکر کی تنسیخ لکھے
خطِ عارض میں لکھے حلقۂ گردن کی گرفت
اُسی گردن کی جو عیار کی زنبیل میں ہے
میں نے زنبیل پہ تحریر کیا
جس نے آثارِ صنادید لکھی ہو وہی اسبابِ بغاوت لکھے

بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ ہرا جنگل ہے

بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ ہرا جنگل ہے
آسماں گیر درختوں نے نظر کی حد کو
روک رکھا ہے کہ اب آنکھ زمیں پر اُترے
بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ ہوا پاگل ہے
اسی موسم میں کسی شاخِ گرہ دار کے بیچ
بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ کہانی نہ رہی
قصّہ گر ختم ہوئے قصّہ طولانی سے
ہم نے گرتی ہوئی تہذیب کی شکلیں کس دیں
ہم اجل دیدہ، پدر سوختہ، آوارہ نصیب
ہم نکالے ہوئے، بھٹکے ہوئے، جاگے ہوئے لوگ
ہم جسے یاد کریں اُس کی قضا آتی ہے
ہم جسے یاد کریں اُس کی خبر کوئی نہیں
بخت خاں آنکھ اٹھاؤ کہ غنیمت ہے بدن
شاخِ گرہ دار کے بیچ
ورنہ ہم سوختہ جاں، شعلہ نصیب
ہم جسے یاد کریں اُس کی قضا آتی ہے
ہم جسے یاد کریں اُس کی خبر کوئی نہیں

Scanned with CamScanner

اکرام اللہ

ایک جنم اور

۱

صوفیہ کو میں نے دونوں بازوؤں سے پکڑا۔ میرے کندھوں تک اونچی وہ بت کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ شفاف کھلی پیشانی، رس کی بھری دو سیاہ آنکھیں۔ میں ان میں کچھ دیر دیکھتا رہا۔ ندامت، گھبراہٹ اور بے یقینی کے علاوہ مجھے لگا کہ آخر میں کسی نفرت کی چنگاری بھی اڑی اور بجھ گئی۔ جانا وہم ہوگا۔ انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اُن دنوں یہی دیکھنا میری طبیعت کو راس تھا۔ آج جانتا ہوں کہ جسے وہم جانا وہی سچ تھا۔ سچ کو سامنے دیکھتے ہوئے، چاہے وہ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو، اگر انسان سیدھے سبھاؤ اسے مان لے تو مصیبتوں میں کاہے کو پھنسے۔ نفرت محبت سے کہیں بڑھ کر اٹل جذبہ ہے۔ مصلحتیں اسے دبا تو سکتی ہیں شاید مٹا نہیں سکتیں، اور اسے محبت میں تبدیل کرنے کے لیے تو یقیناً معجزے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کے تھرتھراتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس نے عذر نہ کیا۔ اس نے میرے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر وارفتگی کا تاثر دینے کے لیے ذرا سا دبایا تو مجھے اپنے منہ میں مصنوعی دانتوں کی پلیٹ کھسکتی محسوس ہوئی۔ پیچھے ہٹا کہ اگر بتیسی موقعے پر ہی نکل گئی تو شرمندگی ہوگی۔ منہ پھیر کر جھٹ زبان سے اسے استوار کیا۔ بوسہ میرے اپنے ہی مطالبے میں میرا آخری اور حتمی اعترافِ شکست تھا۔ بوسہ میری طرف سے حالات کو جیسے تھے ویسے ہی قبول کرنے کا عندیہ تھا۔ میں نے

دل میں اس کے نفرت اور بے وفائی کے حق کو صرف ایک شرط پر تسلیم کر لیا کہ وہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہے جب تک بھی میں زندہ ہوں۔ صوفیہ سے مجھے محبت سمندر میں کسی ڈوبتے جہاز کی مانند مرحلہ وار، انچ بہ انچ ہوئی۔ ڈوبتا جہاز بالآخر تہہ میں جا بیٹھتا ہے، کسی قسم کا کوئی نشان چھوڑے بغیر۔ دوسرے لمحے پانی کی سطح اس کے اوپر برابر ہو جاتی ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے ضمیر کی تہہ میں کانچ کی سی سبز لاش مختلف رووں کی زد میں آتی ادھر اُدھر کھسکتی رہتی ہو گی۔ کسی عورت سے محبت کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ نہ تھا، لیکن ایک لحاظ سے سفر ضرور تھا۔ پہلے جتنی محبتیں بھی کیں، میں ہر بار سر کے بل ان میں گرا، پھر سنبھلا۔ عشق سے نس کی طرف واپسی ہوئی، پھر ہم دردی رہ گئی، اس کے بعد میں اجنبی بن گیا۔ وہ مجھ میں پرانا شاید ڈھونڈتیں، میں نہ ملتا تو تنگ کر پلٹ جاتیں۔ وہ لڑکپن اور جوانی کی محبتیں تھیں، یہ بڑھاپے کی محبت تھی۔ میں نہ جانتا تھا کہ اس میں چرخی الٹی گھومتی ہے۔ اس میں آئے تو عشق کی منزل سب سے آخر میں آتی ہے لیکن پھر واپسی کی کوئی راہ کھلی نہیں چھوڑتی۔ بوڑھے سفید سر کا ندرانہ ہر صورت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ صوفیہ کے عشق میں آہستہ آہستہ میری کیفیت ایسی مچھلی کی سی ہو گئی تھی جو شکاری کا کانٹا نگل چکی ہو لیکن اس ڈر سے نہ تڑپے نہ اُچھلے کہ کہیں کانٹا حلق سے نکل نہ جائے۔

ڈھلتی عمر کی عورت کی طرح بے ہنگم طور پر پھیلتے ہوئے شہر کے مضافات میں واقع ایک کچی بستی میں آج کل رہتا ہوں اور گزر بسر کا ذریعہ محض خیرات ہے۔ سڑک پر بیٹھ کر بھیک نہیں مانگتا؛ پرانے دوست پوچھتے پاچھتے کبھی کبھار ادھر آ نکلتے ہیں، میری حالت سے عبرت پکڑتے ہیں اور خود اس نوبت کو پہنچنے کے خوف سے لرزتے کانپتے اپنے اپنے انداز میں کچھ دے دلا جاتے ہیں۔ میرے ڈرامے کا آخری سین جوں کہ ضرورت سے زیادہ لمبا کھنچ رہا ہے، اور میں اس کی پروا کیے بغیر ڈھیٹ بنے سے زندہ رہنے پر مصر ہوں، اس باعث میں نے اپنے دیکھنے والوں کی توجہ کھو دی ہے اور ان کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ ویسے بھی محلوں سے نکل کر جھونپڑی میں پہنچنے پر پرانے راجوں مہاراجوں کا ڈراما ختم ہو جاتا تھا، مگر میرا ڈرامہ آہستہ آہستہ اپنے عروج سے گزر کر پھر سپاٹ سطح پر آ پہنچا ہے۔ اب دیکھنے والوں کو اس میں کیا دل چسپی رہ سکتی ہے۔ میرے ڈرامے میں جتنی سنسنی پہنچانے کی سکت تھی وہ تو پہنچا چکا اور ہر لحاظ سے اپنے قدرتی انجام

پر آن پہنچا ہے۔ اب یہ بات کہ میری کایا کی ڈھیری خاک میں مل کر کب خاک ہوتی ہے، کہانی کے لیے، اور دیکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے، بے کار ہے۔ یہ چاہے ابھی ہو یا بیس سال بعد ہو، کہانی پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مرے ہوئے سانپ کی طرح وہیں کی وہیں بیس برس تک پڑی رہے گی۔ بیگم ماہ جبیں کاکل مہینے میں ایک بار تو ضرور آتی ہیں۔ کبھی کبھی عبدالرشید کاکل بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی مسلسل دل چسپی میرے زندہ رہنے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر بات صرف پرانے دوستوں تک محدود ہوتی تو ڈراپ سین کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ ویسے تو عبدالرشید کاکل بھی دوست ہی تھے، پھر رشتے دار بن گئے، ماہ جبیں کے ذریعے سے۔

ماہ جبیں میری سگی خالہ کی بیٹی تھی۔ میں نے ساری عمر نہ تو خالہ کو خالہ جانا اور نہ ان کی بیٹی کو کبھی کزن تسلیم کیا۔ میرے والدین کے گھر میں ان لوگوں کا مرتبہ پرانے، وفادار، محبت کرنے والے ملازموں کا سا تھا، یا ان سے ذرا بہتر کہہ لیجیے کیوں کہ وہ ہمارے ساتھ میز پر کھانا کھا سکتے تھے اور کوٹھی کے کمروں میں رہ سکتے تھے؛ انھیں ملازموں کے کوارٹروں کی جانب دھکیلا نہیں جاتا تھا۔ اتنا تعلق بھی میری والدہ کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ پھر مجھے تقریباً پینتیس برس تک ان لوگوں کا کبھی بھولے سے خیال بھی نہ آیا کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔ البتہ کاکل کا نام کبھی سننے میں آ جاتا کہ وہ لاہور میں بڑے ممتاز اور روشن دماغ وکیل کی حیثیت سے مشہور ہو چکا ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکراہٹ پھیل جاتی۔ مجھے اس سے ملنے کی کبھی تحریک نہیں ہوئی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ وکیل تو خرید کی جانے والی جنس ہے، اگر کبھی اس کی خدمات کی ضرورت ہوئی تو میں منہ مانگے دام ادا کر کے حاصل کر لوں گا۔ مجھے تو اپنے مطلب کے لیے سرکاری دفاتر میں اثر و رسوخ رکھنے والے بااختیار لوگوں کی ضرورت پڑتی تھی، اور وہ بالعموم میرے ملنے والے ہوتے کیوں کہ میں خود سپیریئر سروسز میں بطور افسر لمبے عرصے تک خدمات سرانجام دے چکا تھا۔

میری پوری اولاد، دو بیٹے اور تین بیٹیاں پہلی بیوی کے بطن سے ہیں۔ سبھی زندہ سلامت اور شادی شدہ ہیں۔ بیوی حیات ہے۔ میری صنعتی سلطنت کا بیشتر حصہ انھیں لوگوں کے قبضے میں ہے۔ قابض ہونے کے بعد ان چھوکروں میں سے کسی نے کبھی پلٹ کے میری طرف نہیں دیکھا۔ دوسری بیوی صوفیہ نے طلاق لے لی، لیکن طلاق لینے سے پہلے میری صنعتی سلطنت کا بھاکھا

حصہ جو میں اس کے لیے اور اپنے آخری دنوں کے لیے قانونی جنگیں لڑتے لڑتے بہ مشکل بچا سکا تھا، تریا چلتر سے چھل لے گئی۔ آج جب صنعتی سلطنت کا ذکر کرتا ہوں جو کبھی میری تھی، جہاں میرا حکم چلتا تھا، تو عجیب سا لگتا ہے جیسے کسی خواب کا تذکرہ کر رہا ہوں، وہ بھی اپنے خواب کا نہیں کسی اور کے دیکھے، محسوس کیے اور حقیقی زندگی کے طور پر بسر کیے خواب کا۔ دیکھنے والا میں تو نہیں تھا لیکن ہر لحاظ سے مجھ جیسا تھا۔ میں تو سایہ تھا جو اس کے خوابوں میں گھومتا پھرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میں وہ ہوں۔ خواب جب دیکھ رہے ہوتے ہیں تو کسے پتا ہوتا ہے کہ یہ خواب ہے حقیقت نہیں۔ واقعات چاہے حقیقی نہ ہوں لیکن خوف، خطرہ، خوشی تو سبھی اپنی اپنی جگہ پر حقیقی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک دن یک بارگی آنکھ کھلے، یا بند ہو، تو پتا چلے کہ جسے اب حقیقت مان کر بھوگ رہا ہوں وہ بھی خواب ہی ہے، اور پتا نہیں کس کا۔ رنگا رنگ بیماریوں میں گھرا ہوں ـــــ ذیابیطس ہے، بلڈ پریشر ہے، دل کا عارضہ ہے۔ ڈاکٹر کی فیس نہیں، دوا کے دام نہیں، مگر زندہ ہوں۔ جانتا ہوں جیسے جانا میرے حق میں اچھا نہیں مگر کیا کروں؟ یہ دنیا بھی عجب گورکھ دھندا ہے، آدھے نہ چاہتے ہوئے مر جانے پر، اور بقیہ آدھے زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ بظاہر لگتا ہے ان کو اول بدل کر دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن ہو گا نہیں، خرابی زیادہ گہری ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ جو چین اب ہے وہ پہلے کبھی نہیں پایا۔ موت سے بہت ڈرتا تھا۔ اب تیار ہوں۔ عزرائیل جب چاہے آئے ہاتھ جھاڑ کر ساتھ چل پڑوں گا۔

مجھے ایک عجیب مضحکہ خیز عادت مرض کی حد تک تھی۔ ہر بیس منٹ آدھ گھنٹے بعد آئینہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ چاہے کتنی اہم میٹنگ ہو رہی ہو، میں اٹھ کر واش روم کا چکر لگا آتا۔ اس کوٹھری میں پڑے تین سال ہونے کو آ رہے ہیں، حیرت ہے کہ آئینہ دیکھنے کی طلب تو الگ رہی، کبھی زمین پہ پڑتے اپنے سائے کی طرف نہیں دیکھا۔ ہاں، سامنے آگے آگے چل رہا ہو تو دیکھے بغیر چارہ نہیں۔ اب اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں، یا نظر آنے لگا ہوں، کہ بڑھاپے کے آثار میرے سائے سے بھی ٹپکنے لگے ہیں۔

جس زمانے میں میں اپنی پیدا کردہ انڈسٹریل ایمپائر پہ خود حکمراں تھا اُن دنوں عبدالصمد خاں، جو ریلوے میں ڈویژنل انجینئر تھے، میرے دفتر کوئنز روڈ کراچی تشریف لائے۔ کہنے لگے، "بڑی مشکلوں سے پتا معلوم کرتے کرتے آج آپ تک پہنچ پایا ہوں۔ بہت دنوں سے آپ کی

تلاش میں تھا۔"

میری ان سے پرانی ملاقات تھی۔ پہلے تو بحیثیت سرکاری عہدہ دار تعارف تھا۔ جب ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی تو کچھ عرصہ ریلوے کو بطور ٹھیکیدار بھاری مشینری سپلائی کرتا رہا۔ اُن دنوں وہ لاہور میں تعینات تھے۔ ہر روز کا ان سے واسطہ تھا۔ آہستہ آہستہ تعلقات ذاتی نوعیت اختیار کر گئے۔ نہایت ہی نیک سیرت، دیانت دار ور شریف انسان تھے۔ کہنے لگے، "شاہد صاحب، چند ماہ میں میری ریٹائرمنٹ ہونے والی ہے۔ عمر بھر سرکاری بنگلوں میں رہا۔ کوئی ذاتی مکان نہیں۔ کوئی خاص روپیہ جمع نہیں۔ جو تنخواہ ملی خرچ کر ڈالی۔ دل کا مریض ہو گیا ہوں۔ دو دورے پڑ چکے ہیں۔ زیادہ زندہ رہنے کا امکان نہیں۔ پیچھے دو سادہ لوح عورتیں، ایک بیوی اور ایک بیٹی، ماتم کرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا۔ مہاجر ہوں۔ کچھ رشتےدار ہندوستان میں پڑے ہیں، کچھ یہاں پاکستان کے شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مگر آج کل کس کے پاس اتنا روپیہ اور وقت کہ ان کو سنبھال سکے۔ تقسیم سے پہلے کا زمانہ ہوتا جب پورے خاندان کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا، تو مجھے یہ فکر نہ ہوتی۔ انہیں ان لوگوں کے آسرے چھوڑ کر میں سکون سے مر سکتا تھا۔ مرتے وقت مجھے اتنا یقین تو ہوتا کہ انہیں بالکل ہی بےسہارا چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ یقین کیجیے وہ واقعی انہیں خاندان کی عزت سمجھتے ہوئے اپنے پروں تلے چھپا لیتے۔ اب وہ حالات نہیں رہے۔ کیا ہو سکتا ہے۔ تین سال پہلے دور کے عزیزوں میں ایک لڑکا انجینئر تھا، اس سے بیٹی کی شادی کر دی۔ دیکھنے میں بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ امریکہ پڑھنے کے لیے گیا تو چھ مہینے میں ہم سے بالکل ہی لاتعلق ہو گیا۔ پتا چلا کہ اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔ میں نے خط لکھا کہ اگر تم نے شادی کر ہی لی ہے تو کم از کم صوفیہ کو طلاق تو دے دو۔ اس نالائق نے جھٹ طلاق لکھ کر بھیج دی۔ شکر ہے کہ کوئی بچہ نہ تھا۔ ہم شریف لوگ چپ ہو کر بیٹھ رہے۔ آپ خاندانی آدمی ہیں۔ عرصے سے آپ کو جانتا ہوں، اس لیے چلا آیا۔ بیٹی گریجویٹ ہے۔ اسے اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیں۔ جب میں نہ ہوں گا تو دونوں ماں بیٹی آپ کی پناہ میں آبرو سے گزر بسر کر لیں گی۔" بات ختم کرتے کرتے نیک خان صاحب کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ شرافت اور دیانت داری کا اتنا بھیانک انجام دیکھ کر میں لرز گیا۔

Scanned with CamScanner

۲

شاہد کو میں نے پہلی دفعہ آج سے کم و بیش چالیس سال پہلے ٹرین میں دیکھا تھا۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ میری حد تک یہ ایک اجنبی کا میرے دل میں اتر جانے کا واقعہ تھا۔ ان تین گھنٹوں میں وہ مسلسل میری توجہ کا مرکز رہا۔ اس کے بعد دو سال تک ہم لا کالج لاہور میں کلاس فیلو کی حیثیت سے ملتے رہے۔ ہمارے درمیان دوستی کا رنگ لیے ہوئے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی، یعنی جتنی دوستی یا واقفیت کا وہ اپنے غرور و تمکنت کے باوجود متحمل ہو سکتا تھا۔ ایسا تجزیہ آج کرنا ممکن ہے، لیکن اُس زمانے میں ناتجربہ کاری اور کم عمری کے سبب میں اسے اپنا گہرا یار شمار کرتا تھا۔ اُن دنوں، اور کالج سے فارغ ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک، ایک عجیب احمقانہ سی خواہش نے مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھا کہ کاش میں شاہد ہوتا۔ اس خواہش کی شدت بعض اوقات اتنی بڑھ جاتی کہ اس کے زیرِ اثر مجھے اپنا ذہن بکھرتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ طالبِ علمی کا دور ختم ہونے پر کبھی برسوں بعد اس سے اتفاقاً ملاقات ہو جاتی تو ہو جاتی۔ اس دوران خود مجھ میں اتنی پختگی آ گئی، یا اس کی مجھ میں عدم دلچسپی اور بے توجہی کے احساس نے یہ کیفیت پیدا کر دی، کہ اس مریضانہ خواہش سے مجھے چھٹکارا مل گیا۔ اس میں کچھ حصہ غالباً اس طمانیت کا بھی تھا جو بحیثیت وکیل میری کامیابی نے مجھے عطا کی۔ اس کے گھر کے جھگڑوں نے بڑھتے بڑھتے اس کے کاروباری اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نجی نفرتیں اور تقسیم حصص کی رقابتیں کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر شہر کے چوراہوں تک آ پہنچیں۔ اُس وقت اسے میری پیشہ ورانہ خدمات کی ضرورت پڑی اور اسے خود چل کے میرے پاس آنا پڑا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس بات کی اجازت دی کہ ہم ایک دوسرے سے برابری کی سطح سے ہم کلام ہوں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میں ترحم کے بلند پیڈسٹل پہ کھڑا قدرے نیچے ایک شکستہ اور مضمحل شخص کو دیکھ رہا تھا جس کے لیے اپنی پہلی بیوی اور بالغ بچوں کی جانب سے اس غیر متوقع حملے کے صدمے سے قانونی اور ذاتی طور پر عہدہ برآ ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ اس جنگ کو شروع ہوئے ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ دوسری بیوی نے، جس کی وجہ سے گھر کے اندر اس کے وقار اور احترام کا جنازہ نکلا تھا، اس کی آخری غیر متنازعہ جائیداد (لاہور کے نواح میں واقع ٹیکسٹائل ملز) کے قبضے اور سابقہ تین سال کے حساب کی فہمید کا

Scanned with CamScanner

دعویٰ کر دیا، اور ساتھ دوسرا دعویٰ مزاج کی ناموافقت کی بنیاد پر طلاق کا کر دیا۔ بنکوں میں رقم منجمد کر دی گئی۔ یہ ضرب بہت کاری ثابت ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ امید نے اپنی جگنو جیسی ٹمٹماہٹ بھی اس کے لیے بند کر دی، جو بالعموم نبضوں کے ساتھ بند ہوا کرتی ہے۔ وہ جو کبھی فخر و مباہات کا پیکر تھا، جسے کوئی بھی بلندی سیر نہ کر پاتی تھی، جب پستیوں میں گرا تو ناقابلِ شکست شیشے کی طرح یکبارگی ریزہ ریزہ ہو کر فرش پہ لوگوں کے پاؤں میں دور تک بکھرتا چلا گیا۔

لا کالج کے سال اوّل کے داخلوں کے قریباً پندرہ دن بعد ماہ ستمبر میں کلاسوں کے شروع ہونے کی اطلاع ملی تو میں پرانے زمانے سے ایک ہی وقت پر ملتان سے لاہور کے لیے چلنے والی ٹرین پر ایک بجے بعد دوپہر انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہوا۔ بے پناہ رش، حبس اور گرمی تھی۔ دھول کے بادل چلتی گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے، پھر اس کی رفتار کی تیزی سے مجبور ہو کر فراٹے بھرتے ڈبوں میں موج در موج گھس کر مسافروں پر مٹی کا لیپ کر دیتے۔ چار بجے گاڑی منٹگمری (اب ساہیوال) پہنچی۔ گرمی کی شدت، دھول کے سیلاب اور مسافروں کی بہتات نے نڈھال کر دیا۔ گاڑی وہاں آدھ گھنٹا رکی۔ بہت سے لوگ اترے، بہت سے نئے سوار ہوئے، مگر رش کا وہی عالم رہا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ گرمی کے ماروں کو شام ہونے کی امید پیدا ہونے لگی تھی۔ سورج کی آنکھ بھی گویا اب اپنے کیے پہ کچھ کچھ پشیمان تھی۔ گاڑی روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ شاہد احمد پلیٹ فارم پر لگے شیشم کے درختوں کے ہرے بھرے جھنڈ کے گھنے سائے سے نکلا۔ بغل میں کتاب دابے، وقار سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا میرے ڈبے میں سوار ہوا۔ ایک ترو تازہ نوجوان، شگفتہ شاداب چہرہ ـــــ ڈبے کا بیزار ماحول کھل اٹھا۔ گورے رنگ پر مُنڈی داڑھی کا سبزہ نکھر رہا تھا۔ لمبی پلکیں، باریک محرابی بھنویں اور رس میں ڈوبی مستی بانٹتی سیاہ آنکھیں۔ کالی ساٹن جیسے بال اپنے ہی بوجھ سے پھسلتے ہوئے بار بار کھلی پیشانی پہ آ رہتے۔ اس کے لباس کے رنگوں اور تراش خراش سے، اس کی چال ڈھال سے، ایک شائستگی میں رچا بسا بانکپن نظر آتا۔ حیرت ہے کہ میرے ذہن میں شاہد احمد کے بارے میں چالیس سال پہلے کی معمولی سے معمولی تفصیل بھی آج تک کسی کاغذ پر کھنچی تصویر کی طرح محفوظ ہے۔ اگر شاہد اس کے بعد پھر کبھی زندگی میں مجھے نہ بھی ملتا تو وہ مجھے اسی طرح یاد ہوتیں۔ کاغذ کو یک روز پھٹنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی تصویر بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ جس دن میرا ذہن ختم ہو جائے گا تب سفر کے دن والا میرا ذاتی شاہد

Scanned with CamScanner

احمد بھی، اپنی ساری آب وتاب کے ساتھ میرے ذہن کے تابوت میں بند، میری ہی طرح ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔ پھر نہ وہی کسی کو یاد رہے گا اور نہ میں، حالاں کہ گاڑی بدستور ہر روز، ایک بجے بعد دوپہر ملتان سے لاہور کے لیے چلتی رہے گی۔ پھر ایک دن آئے گا کہ وہ بھی بند ہو جائے گی۔ میں بار بار اسے دیکھنے پر مجبور تھا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں وہ بھانپ نہ جائے کہ کوئی شخص اسے یوں گھورے جا رہا ہے۔ میں نے شاہد احمد کو ٹرین میں پہلی بار دیکھنے کے بارے میں کبھی نہیں بتایا اور اپنے تاثرات کا تو اس سے ذکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس خوب صورت شخص کے چہرے پہ پھیلی ذہانت اور غرور کی حدوں کو چھوتی ہوئی خود اعتمادی اس کی شخصیت میں ہر جہتی پیدا کر رہی تھی۔ اس کے اوصاف کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا تھا کہ میرے احساسات ویسے ہی ہیں جیسے پہلی بار چلتے بجھتے نیون سائن کو دیکھ کر میرے بصری محسوسات کی کیفیت تھی۔ چمکتے تیز رنگوں سے اولاً ایک ایک حرف روشن ہوتا جاتا، میں دل میں اس کی ایک ایک خوبی پر غور کرتا چلا جاتا۔ پھر انتہائی آب وتاب سے پورا نیون سائن یک بارگی دمک اٹھتا۔ میں نظر اٹھا کر دیکھتا تو جگمگ جگمگ کرتی اس کی شخصیت سامنے ہوتی۔ میں سوچنے لگا کہ ان خوبیوں کے پیچھے کتنا گہرا، پھیلا ہوا اور متنوع پس منظر ہو گا جو اسے بنا سنوار کر سامنے لایا ہے۔ پتا نہیں خاندان والوں کی کتنی صدیوں کے عرصے میں تہ در تہ جمع کی ہوئی دولت ہو گی؛ حکومت، اقتدار اور اختیار ہو گا؛ تعلیم ہو گی، تربیت ہو گی؛ خاندان میں بہتا علم و فضل کا دھارا ہو گا؛ ٹوٹتی بنتی تہذیبوں، اونچی حویلیوں اور پھیلے بنگلوں کی معاونت ہو گی؛ نسل در نسل دیا ہوا ماؤں کے حسن اور پیار کا حصہ ہو گا؛ پشت در پشت باپوں کی وجاہت، تحفظ اور نگہداشت کا حصہ ہو گا۔ وہ کمپنگیاں اور رواتیں جو بلند مقام تک پہنچنے کے لیے ہر طور ایک لازمی جزو رہی ہیں، اور وہ بدبخت صورتیں جو ہر شخص کے پرکھوں میں گھسی پیٹھی ہوتی ہیں، کس کس سطح اور کس کس مرحلے پر کیسے کیسے فلٹر ہو کر اس تک پہنچتے پہنچتے خارج ہوتی چلی گئیں، یا نہ ہو ئیں، تو شاہد احمد بنا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی اچرج بات ایسی ہو کہ میں شاہد احمد بن جاؤں۔ ہم جو ذات کے ماچھی ہیں، ہزاروں برس میں اپنے جسموں کا نیلا رنگ دور نہیں کر سکے، مٹی کی تین تہی تہی دیواروں کے تلے سر کنڈوں کی چھت کے نیچے سدا سے بیٹھے چلے آ رہے ہیں، تو میں شاہد احمد کہاں سے بن جاؤں گا۔ مگر خواہشوں کو منطق نہیں آتی۔ ہماری عورتیں زمینداروں کے گھروں میں کام کرتی ہیں، ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں، دودھ

چلاتی ہیں، کسی گائے بھینس کی طرح، تندور میں روٹیاں لگاتی ہیں اور دائی کہلاتی ہیں۔ مرد ان کے ہاں پانی بھرتے ہیں، چولھوں اور تندوروں کے لیے ایندھن کھیتوں اور جنگل سے اکٹھا کر کے لاتے ہیں، موسم میں کھیتوں سے بٹیر اور دریاؤں سے مچھلی پکڑتے ہیں، جاں بنتے ہیں، لڑنے کے قابل بٹیروں کو سنبھالتے ہیں اور لڑائی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ملک کی ہر آواز پر "آیا سائیں" کہتے ہوئے دیوانہ وار دوڑتے ہیں اور "وایا" کہلاتے ہیں۔ میری جھونپڑی کے سامنے گاؤں کے چوک کے کنارے میری پھوپھی، سر پر دوپٹا باندھے، پسینے میں شرابور، گاؤں والوں کے لیے دن بھر تندور میں روٹیاں لگاتی اور پھوپھا تیز دھوپ میں ایندھن کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔ برابر میں پھوپھی کی چودہ پندرہ سالہ اکلوتی بیٹی میلے دوپٹے سے بدن ڈھانپتی، کچھ اپنے آپ پر نادم سی، خاموش سی، کسی قیدی کی طرح مجبور بیٹھی آٹے کے پیڑے بنا بنا کے ماں کو دے رہی ہوتی۔ وہ چار جماعت پڑھی تھی۔ ماں نہیں صرف بیٹی اپنی ماں کی پوری زندگی سے غیر مطمئن اور مایوس تھی۔ وہ اپنا مقدر اس سے مختلف چاہتی تھی۔ مگر کیسے؟ اس کے بارے میں کوئی سوجھ بوجھ نہ رکھتی تھی۔ نیم خواندگی نے بیچاری کو قناعت کی نعمت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ ماں مٹی کے کونڈے میں ہاتھ گیلا کر کے آٹے کا پیڑا بیٹی سے لے کر دونوں ہاتھوں میں دباتی، پھر مشینی انداز میں ہتھیلیوں کے اندر زور زور سے تھپتھپاتی اور روٹی پھیلنا شروع ہو جاتی۔ اسے ذرا خیال نہ ہوتا کہ پسینے سے چپکے کرتے کے اندر اس کی بوجھ چھاتیاں تھل تھل ہلتی سب کو نظر آ رہی ہیں۔ ماچھنوں کی چھاتیاں ویسے بھی بھاری ہوتی ہیں۔ ان کا نیلا رنگ گیلے کرتے سے جھلکتا جن سے اپنے وقتوں میں زمینداروں کے شیر خور بچے دودھ پی پی کر بالغ ہوئے اور بالغ بد نظر ڈالتے رہے۔ پچھلے چار ہزار برس میں مست رو ہندوستان نے اگرچہ کروٹیں بدلیں، آریا آئے، وید نازل ہوئے، لیکن ہم نیچ ذاتوں کی بہتری کے لیے کوئی حکم نازل نہ ہوا بلکہ الٹا سختی بڑھانے کی تاکید آئی۔ آریاؤں کے بعد ایرانی آئے، یونانی آئے، سفید ہُن آئے، ترک آئے، افغان آئے، مغل آئے، انگریز آئے، دنیا کو بدلتا ہوا عہدِ جدید آیا، حتیٰ کہ بیسویں صدی آدھی گزر گئی۔ میری پھر بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو پاس بٹھائے آریاؤں کی آمد کے بعد سے یوں ہی جلتے تندور پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی ہے اور اس کا نیلا رنگ اس کے بھیگے کرتے سے ہمیشہ یوں ہی جھلکتا رہا ہے۔ ہاں اتنا ہوا کہ میرے باپ کے کوکا، ملک کرم علی زمیندار، نے جب وہ ضلع کونسل کا رکن بنا تو اسے آٹھ جماعت پاس ہونے کی بنا پر محکمۂ مال میں پٹواری ملازم

رکھوا دیا جہاں وہ ریٹائر ہونے تک ترقی کی ایک سیڑھی طے کر کے گرداور قانونگو ہو گیا تھا۔ یوں میرا بی اے تک پڑھنے کا انتظام ہو گیا۔ لیکن شاہد احمد بننے میں تو کچھ پشتیں صرف ہوتی ہیں۔ میری تو تعلیم سے متعارف ہوئے ہی ابھی دوسری پشت ہے۔ اب اگرچہ بڑے بننے کا سلسلہ متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹوں نے تیز تر کر دیا ہے، لیکن نیچ ذاتوں کے لیے نہیں۔ میں جو مچھیوں میں سے اپنی ذہانت و محنت کی بدولت اُبھرا تو بڑی ذات والوں نے مجھے جھٹ سے اپنے آپ میں ضم کر لیا، اور میں بخوشی ضم ہو گیا کیوں کہ میرا ذاتی مستقبل اسی طرح سنور سکتا تھا۔ اب ذات باہر کے فاتح قبائل کو کھشتری بنانے کے لیے برامنوں کو کوہ آبو پر جا کر ہون کرنے اور اگنی کنڈ سجانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اونچی ذاتوں کے لوگ اب اس میں خود کفیل ہو گئے ہیں۔ جہاں بھی جوہرِ قابل نظر پڑ جاتا ہے، زر زن زمین کی مقناطیسی قوت سے اسے اپنی طرف کھینچ کر، لوہے کو مقناطیس بناتے ہوئے، اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ جیسے اب میں خود مقناطیس ہو گیا ہوں، لیکن صرف تین ـــــ باقی وہی، مچھی کے مچھی ہیں۔ میری منگیتر، جو میری پھوپھی کی اکلوتی بیٹی تھی، اپنی اداس، آنسو بھری آنکھوں سے مجھے لاہور کے لیے رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔ میری تسلیوں کے باوجود اسے پتا نہیں کیسے یقین تھا کہ میں اب لوٹ کر نہ آسکوں گا۔ آج کل وہ اپنی ماں کی جگہ تندور پر بیٹھتی ہے اور اس کا خاوند دن بھر جنگل اور کھیتوں میں ایندھن اکٹھا کرتا پھرتا ہے۔ میں، جو اس کی پیدائش کے وقت سے اس کا منگیتر تھا، لاہور میں وکالت کرتا ہوں، اپنے نام کے ساتھ 'نمک' لکھتا ہوں۔ اس گستاخی پر مجھے یہاں کون پوچھ سکتا ہے، جب کہ میرے پاس دولت بھی ہے اور شہرت بھی۔

ویسے تو میں شاہد احمد کو دیکھتے ہی اس کے بارے میں سراپا تجسس بن گیا تھا، لیکن دو باتیں فوری جاننا چاہتا تھا۔ یک تو یہ کہ وہ کون سی کتاب پڑھ رہا ہے؟ دوسرے وہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہا ہے، جب کہ ریل میں عام سماجی درجہ بندی کی طرح پانچ درجے موجود ہیں۔ انٹر کلاس میں تو میں بھی سفر کر رہا تھا، ہر چند کہ بہت پس و پیش کے بعد اپنے آپ کو اس عیاشی پر آمادہ کر پایا تھا، لیکن وہ تو صاف امیر آدمی تھا۔ لیکن یہ بہت بعد میں کھلا کہ وہ بڑے بھائی سے، جو جائیداد کا منتظم اور کاروبار کا انچارج تھا، کرایہ کاروباری سفر کے لیے اعلیٰ درجے کا ہی وصول کرتا تھا، لیکن اپنی کنجوس طبیعت سے مجبور گھٹیا درجے میں سفر کرتا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی بچتیں کر کے اسے روپیہ

بینک میں اپنے نام پر جمع کرنے کا جنون تھا۔ وہ کنجوس تھا اور کھچتی کی حد تک کنجوس تھا۔ اسے ہر قسم کے کھیل تماشے کا شوق تھا جسے وہ دوستوں پر بوجھ بن کے پورا کرتا۔ فیشن میگزین البتہ ایک چیز تھی جس پر کبھی کبھار وہ پیسے خرچ کرتا ورنہ وہ تو کورس تک کی کتابیں دوستوں سے مستعار لے کر پڑھتا۔

بلب روشن ہو گیا۔ وہ کتاب میں غرق تھا۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ وہ کتاب "مادام بوواری" تھی۔ ایک ٹانگ تھک جاتی تو بوجھ دوسری ٹانگ پہ لے لیتا۔ اس کے چہرے پر حسرت چھائی تھی۔ آگے کیا ہو گا، یہ جاننے کی طلب تھی۔ مجھے وہ ایسا بچہ لگ رہا تھا جو پڑھتے پڑھتے کہانی میں اتنا ڈوب گیا کہ آخر خود ہی طلسمات کی دنیا میں چلا آیا۔ اٹھتی جوانی کا طلسم تو جنس ہی ہوتی ہے اور وہ ٹھیک طلسم زدہ تھا۔ لاہور کا جگمگاتا اسٹیشن آیا تو ڈبے میں گویا غدر مچ گیا۔ میں اور موٹا بستر اور بوسیدہ ٹرنک، باہم دگر پیوستہ و آویزاں، پتا نہیں کیوں کر پلیٹ فارم پر پہنچے اور وہ پتا نہیں کب غائب ہو گیا۔ اس وقت مجھے یقین تھا کہ میں نے اتفاقاً مل جانے والی سب اچھی چیزوں کی طرح اسے بھی ایک بار پا کر ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

دوسرے دن صبح ہوسٹل سے کالج پہنچا تو وہ اپنے چار پانچ دوستوں کے ساتھ کالج کی عمارت سامنے بڑے کے چھتنار درخت کے نیچے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ مجھے گم شدہ خزانہ مل جانے پر بڑی حیرت ہوئی اور اتنی ہی خوشی بھی۔ اس کے جیسے خوب صورت دانت میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ ان کی مضبوطی اس پر اعتماد کرنے پر مائل کرتی اور قہقہے ملاقی کو اندرونی مدافعتی ہتھیار الگ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیتے۔ وہ اپنی جسمانی حرکات، چال ڈھال اور انداز گفتگو سے ملنے والوں کو انتہائی لاابالی، کھلنڈرا اور لاپروا ہونے کا تاثر دیتا، جو وہ تھا نہیں۔ اس کے تمام دوست سوسائٹی کے اونچے درجے سے تعلق رکھتے تھے۔ سب اس کی کنجوسی کی خصلت سے واقف تھے۔ بعض اوقات زیر لب کچھ شکایت بھی کرتے، لیکن اس کی شخصیت کا جادو ان کی شکایت کو اپنے زور سے بہا کے لے جاتا اور وہ اس کی کمزوری کو معصوم شرارت سمجھتے ہوئے فراموش کر دیتے۔ ان کے وافر وسائل کے پیش نظر سینما کے ٹکٹ یا کافی ہاؤس اور شیزان وغیرہ کے بل معمولی بات تھی۔ وہ بحث میں ایک حد سے زیادہ کبھی سنجیدہ نہ ہوتا اور ہمہ وقت اس ٹوہ میں رہتا کہ بات کو مذاق میں اڑانے کی کوئی صورت ہاتھ آئے تو بہتر ہو۔ میں نے اسے اپنے موقف کی تائید میں کوئی وزنی دلیل دیتے یا حالات

Scanned with CamScanner

وواقعات کا عالمانہ جائزہ لیتے یا تجزیہ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے لطیفے، اقوال اور موقع بے موقع دُہرانے کے لیے مشہور مصنفین کے فقرے بلکہ پیراگراف رٹ رکھے تھے جنھیں اگلنے کے لیے ہر وقت بے قرار ہوتا۔ سوائے اپنے ذاتی حسن کے اس کے پاس ہر مال مستعار تھا اور ہمیشہ رہا۔

میں سدا کا جھینپو اور شرمیلا آدمی ہوں۔ گر بی اے کے امتحان میں یونیورسٹی میں اوّل نہ آتا تو شاید مجھ میں لاہور آ کر لا کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ میں اس سے ملاقات کی جلتی ہوئی خواہش رکھنے کا باوجود مہینا بھر تک اس سے تعارف کی صورت نہ پیدا کر سکا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ وہ کلاس میں دیر سے پہنچا اور دبے پاؤں میرے ساتھ والے خالی ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر، جو ایک نامور وکیل بھی تھا، بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ میں سمجھا اب اس پر برسے گا۔ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا، "شاید! کلاس میں اتنی دیر سے آنا نامناسب ہے۔" اس نے کھڑے ہو کر "سوری سر!" کہا اور بیٹھ کر کاپی کھول لی۔ مجھے تعجب ہوا کہ پروفیسر اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ پروفیسر اس کے بڑے بھائی کا دوست ہے اور جائیداد کے تنازعوں میں اس کا وکیل بھی ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا ہے۔ زندگی میں اور بعد جا کے پتا چلا کہ سب بڑے آدمیوں کا آپس میں ملنا جلنا ہوتا ہے۔ وہ چاہے زمیندار ہوں، صنعتکار ہوں، سرکاری عہدے دار ہوں یا سیاست دان، ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ شرط صرف بڑا ہونے کی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے کام نکلتے اور بنتے ہیں۔ یوں ایک دوسرے کو تھامے ہوئے خواص اور بڑے، اور عوام اور چھوٹے، ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ ایک طرح کی کمپنی ہے، جیسی کسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہوا کرتی تھی۔

اُس روز ہمارا تعارف ہو گیا۔ پہل اس نے کی۔ میں نے اپنا نام بتایا: "عبدالرشید کاکل"۔ اس نے پوچھا، "کاکل آپ کی ذات ہے؟" میں نے کہا، "نہیں۔ تخلص ہے۔" دل میں سوچتا رہ گیا کہ بھائی ہماری ذات تو ماچھی ہے اب وہ تمھیں کیا بتائیں۔

"آپ شاعر ہیں؟"

"نہیں۔ میں شاعر نہیں۔ لفظ اچھا لگا اور میرے رنگ سے نسبت بھی رکھتا تھا، سو تخلص کر لیا۔"

وہ ششدر سا میرا منہ تک رہا تھا۔ پھر بولا، "میں اردو کم جانتا ہوں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"سیاہ زلف جو گھوم کما سکے ماتھے پر آ رہی ہو۔"

وہ قہقہہ لگانا چاہتا تھا، مگر یہ سوچ کے کہ اس میں میری آزردگی کا کوئی پہلو نہ ہو، اسے دبا گیا اور بڑی سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

"آپ ہوسٹل میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کس نمبر کمرے میں؟"

"۲۶۰ میں، دوسری منزل پر۔ وہ کمرے جن کا رخ چنگڑ محلے کو جانے والی سڑک کی طرف ہے، ان میں سے وہ۔"

"اچھا اچھا، اُدھر تو لوگوں کی آمدورفت بھی کم ہوگی۔ میں کسی وقت کمرے میں ملنے آؤں گا۔"

جہاں مجھے اس ملاقات پر خوشی اور فخر تھا، وہاں اس کے میرے کمرے میں آنے کے خیال سے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی کہ میری بے بضاعتی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

ہوسٹل دو منزلہ وسیع و عریض عمارت تھی جس میں سیکڑوں کی تعداد میں کمرے تھے۔ پانچ کچن چلتے تھے۔ پنجاب کے تمام اضلاع کے لڑکے وہاں موجود تھے۔ بیشتر زمینداروں کے بیٹے تھے۔ کئی تو ساتھ خدمتگار بھی لائے ہوئے تھے۔ چند ایک کے پاس سواری کے لیے کاریں تھیں۔ عام ہوسٹلوں والا نظام سرے سے مفقود تھا۔ آمدورفت کے اوقات کی کوئی پابندی نہ تھی۔ کمروں میں شراب اور جوا چلتا تھا۔ کئی دل والے دیر سویر دیکھ کر کرائے کی عورتیں بھی لے آتے تھے۔ طلبا کی سہل پسندی کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب مجھے سو روپیہ ماہوار اس خدمت کا دیتے کہ میں سلیبس کی کتابیں پڑھ کر رات کو، جب وہ حقے کی نے منہ میں لگائے لحاف میں لیٹے ہوں، انھیں اختصار سے ان کا لب لباب سمجھا دیا کروں۔ ان کی طرف سے مجھے قیمت کا خیال کیے بغیر امدادی کتب خریدنے کی آزادی تھی، جس کا میں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے سال کے سالانہ یونیورسٹی امتحان میں میں اول آیا اور وہ فیل ہو گئے۔ اس غیر متوقع نتیجے پر انھیں دل میں غلط طور پر پختہ یقین ہو گیا کہ میں بے ایمانی سے انھیں پوری معلومات بہم نہ پہنچاتا رہا ورنہ فرق اتنا زیادہ نہ ہونا چاہیے تھا۔

Scanned with CamScanner

گیارہ بجے کالج ختم ہونے پر شاہد اپنے دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس چلا جاتا۔ وہاں ادبی، علمی، سیاسی اور دنیا بھر کے موضوعات پر ہر شخص بلند آواز میں رائے زنی کر رہا ہوتا۔ وہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ کافی ہاؤس کا دروازہ کھولتے ہی یوں لگتا کہ بسیرا کرتی چڑیوں کا شور کسی طاقتور لاؤڈ اسپیکر پر نشر کیا جا رہا ہے۔ تعارف کے چند دن بعد شاہد کافی ہاؤس کی نشست میں ناغہ کر کے میرے کمرے میں آ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا، 'میرے کچھ پرائیویٹ خطوط منگوانے کا مسئلہ ہے۔ اگر کہو تو تمہاری معرفت اس کمرے کے پتے پر منگوا لیا کروں؟" میں نے کہا، "ٹھیک ہے۔ اس میں کیا حرج ہے۔" چند دن بعد اس کے نام واقعی خط آ گیا۔ سرنامہ دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ لکھنے والے کا ہاتھ صرف کچا نہیں بلکہ وہ ہے بھی لڑکی۔ ہفتے میں ایک آدھ خط آنے کا معمول تھا، جو میں در پردہ شاہد کو پہنچا دیتا۔

شاہد کا باپ، انگریز کے زمانے میں یونینسٹ پارٹی کا رکن اور پنجاب صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا۔ حکومتِ برطانیہ سے اپنا قابلِ اعتماد دوست اور جاں نثار رعایا شمار کرتی تھی۔ اسے خان بہادری کا خطاب ملا ہوا تھا۔ بیچارا اب گزشتہ کئی برسوں سے مفلوج ہوا بستر پر پڑا تھا۔ اس کی جگہ شاہد کا بڑا بھائی زمینداری سنبھالتا، لاہور اور دیگر شہروں میں املاک اور کاروبار کا انتظام کرتا۔ وہ بھی صوبائی اسمبلی کا رکن تھا اور مسلم لیگ کا حامی تھا ـــــ زمانہ بدل جانے کے باعث ذاتی مفادات کا تحفظ اسی طرح ممکن تھا۔ منجھلا بھائی فوج میں کرنل تھا۔ سب کچھ ابھی تک مشترک تھا لیکن شاہد اس سے دل میں ناراض تھا۔ گھر میں حکمرانی بڑے بھائی کی بیوی کی بجائے شاہد کی ماں کی تھی۔ شاہد کے باغیانہ رجحانات کو ماں، کچھ پیار سے کچھ ڈانٹ ڈپٹ سے، دبائے رکھتی۔

جب شاہد سمجھتا کہ اس کے دوست اس کے ریستورانوں کے بل ادا کرتے کرتے اور سینما کے ٹکٹ خریدتے خریدتے تھک گئے ہوں گے تو ایک شام گھر پر انھیں ڈنر پر بلا لیتا، جس کے اخراجات ظاہر ہے مشترکہ آمدن سے ادا ہوتا ہوتے تھے۔ مجھے بھی بلایا۔ گھر کیا محل تھا، اور اسی طرح سجا ہوا تھا نوکروں کی دولت اور سلیقہ مندی کے ثبوت میں۔ کھانا ختم ہونے پر شاہد کی ماں آ گئی۔ پچپن ساٹھ سال کی، گوری چٹی، نہایت دبدبے والی خاتون تھی۔ میرے سوا شاہد کے سب دوستوں کو اچھی طرح جانتی تھی اور ایک ایک کا نام لے کر اس سے بات کرتی اور ان کی خواتین کا حال احوال پوچھتی۔ مجھے دیکھ کر بولی، "اس لڑکے کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔" میں اٹھ کے کھڑا ہو

گیا۔ "جی میرا نام رشید ہے۔ ملتان سے تعلیم کے لیے آیا ہوں۔ شاہد اور ان کا ہم سبق ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ ملتان کے کس خاندان سے ہو؟"

"میں کسی بڑے خاندان سے نہیں۔ ملتان کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو؟"

شاہد نے کہا "اماں، رشید بی اے میں یونیورسٹی میں اول آیا تھا۔ اب کے یعنی ایل ایل کے امتحان میں پھر یونیورسٹی میں اول آیا ہے۔ اسے اول آنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

یہ سن کر ماں نے حیرت سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "ارے تم تو بڑے لائق آدمی ہو۔ تم لوگوں کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ شاہد کے ساتھ یہاں آیا کرو نا۔" اس کے بعد شاہد کے ساتھ میرا کوٹھی کا ہفتے میں ایک آدھ چکر تو ضرور ہو جاتا۔ اماں کا حکم تھا کہ آؤ تو ضرور مل کے جایا کرو۔

سردیوں کی ایک سہ پہر اتنے گھرے بادل چھائے تھے کہ شام ہو رہی تھی، اور میں اپنے کمرے میں لحاف میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا، "آ جاؤ۔" کالے برقعے میں نقاب اُلٹے ایک سترہ اٹھارہ سال کی خوب صورت لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ ایک سات آٹھ سالہ بچی اس کے بازو سے چمٹی تھی۔ لڑکی گھبرائی ہوئی اور بچی خوف زدہ تھی۔ میں نے کہا، "فرمائیے۔"

"کاکل صاحب آپ ہیں؟"

میں کچھ چونکا ہوا۔ "جی ہاں۔"

"شاہد صاحب کہاں ہوں گے؟ میں نے پچھلے خط میں لکھا بھی تھا کہ آج ایک بجے اسٹیشن پر ملیں۔ بہت ضروری بات کرنا تھی ان سے۔"

"وہ تو کل رات کراچی چلے گئے۔ منٹگمری میں فیکٹری کی الاٹمنٹ کا کوئی مسئلہ تھا۔ ساتھ میں جنیر بھی گیا ہے۔"

"ہم تو بڑی مصیبتوں سے یہاں پہنچے ہیں،" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی مگر وہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ سنبھلی تو کہا، "آپ ہمیں گوجرانوالہ جانے والی کسی بس پر بٹھا دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

چند دن بعد شاہد آیا تو میں اسے کمرے میں لے آیا اور بتایا کہ "گوجرانوالہ سے ایک لڑکی تمہیں ملنے کے لیے آئی تھی۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟" وہ حسبِ سابق میرے چھوٹے سے آئینے کو میز پر رکھے اپنے ہی عکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے انہماک سے گھور رہا تھا، جیسے ان میں سمائی کوئی طاقت اپنے اندر منتقل کر رہا ہو۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور اس نے یہاں رو رو کے برا حال کر لیا اپنا۔"

"تم نہیں جانتے، رونا لڑکیوں کی بابی ہوتی ہے۔"

"تمہارے لیے ملنا ممکن نہ تھا تو اسے بروقت اطلاع کی ہوتی۔"

"میں بالکل بھول گیا اور نہ تمہیں حلیہ سمجھا کر اسٹیشن بھجوا دیتا۔ وہ دراصل چاہتی یہ ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ اب میں ایک پٹھیپر خاندان میں شادی کر کے اپنا مستقبل تو تباہ نہیں کر سکتا۔"

"وہ پٹھیپر تو بالکل بھی نہیں۔ دونوں لڑکیاں اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کی نظر آتی تھیں۔"

"اپنی اپنی رائے ہے۔"

"ایک بات ہے۔ وہ بڑی لڑکی خوبصورت بہت ہے۔"

"چھوڑ خوب صورتی کو۔ ایک سے ایک خوب صورت پڑی ہے دنیا میں۔"

"یار یہ بتاؤ، وہ تمہارا مستقبل کیسے تباہ کر دے گی؟ وکیل بن رہے ہو۔ سی ایس ایس کا امتحان دے رہے ہو۔ وکالت، تجارت، صنعت، ملازمت، کون سی راہ بند کر دے گی تم پر؟"

"مجھے مستقبل کا خوف کھائے جا رہا ہے اور تم باتیں بنا رہے ہو!" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا چھوٹا سا لحاف کھینچ کر اوپر کر لیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ خوف زدہ، تھکا ٹھٹھرا شخص اپنی تنگ دلی سے کس طرح اپنی دنیا کو تنگ کرتا جا رہا ہے۔ میرے ماں باپ، جنہوں نے مصیبتوں سے یہ لحاف مجھے بنا کر دیا جو اب اس کے لیے آرام کا ذریعہ بن رہا ہے، ان پر زمانہ کس کس طرح سے دنیا تنگ کیے ہوئے ہے۔ تو کیا فطرت نے انصاف کرتے ہوئے نتیجہ سب کے لیے آخر میں برابر ہی رکھا ہے؟

۳

ایک عرصے سے یوں لگ رہا ہے جیسے لاتعلقی کے صحرا میں چلا جا رہا ہوں۔ سمت کے تعین کی کہاں ضرورت رہ گئی جب کوئی منزل ہی نہیں۔ جدھر منہ اٹھا اُدھر چل پڑا۔ یہ اور بات کہ عمر بھر اپنے منہ کے سوا دوسری کوئی منزل نظر ہی نہ آ سکی۔ دل کو بار بار ٹٹول چکا ہوں۔ وہاں اگر مرنے کی خواہش نہیں تو زندہ رہنے کی طلب بھی موجود نہیں۔ میں سدا کا خوف زدہ انسان ہوں۔ دشمن تو دشمن تھے، دوستوں سے بھی خود حفاظتی کی تدابیر میں مبتلا رہا۔ میرے ارد گرد مفلسی کا خوف، ناکامی کا ڈر، سماجی حیثیت سے گر جانے کا خطرہ، موت کا سہم، چاروں طرف دھمکی آمیز انداز میں بھالے تانے کھڑے رہے۔ میں انھیں دور رکھنے کے لیے بے جگری سے لڑتا رہا۔ اگرچہ وہ مجھے کبھی زک نہ پہنچا سکے لیکن میں انھیں اپنے سے کبھی زیادہ دور بھی نہ دھکیل سکا۔

پورے بدن میں ایک ایڑی تھی جو امرت میں ڈبانے سے رہ گئی تھی، کیوں کہ ماں نے اسی سے پکڑ کے اسے غوطہ دیا تھا۔ وہیں تیر کو لگنا تھا، اور لگا۔ وہ جوان جس کی بہادری کی عالم میں دھوم تھی ایڑی پر تیر کھاتے ہی میدانِ جنگ میں ڈھیر ہو گیا۔ میں تو عمر کے ساٹھ سال نکال گیا۔ صوفیہ کی دفتر میں آمد کے ایک سال بعد تک بچا پھرتا رہا۔ ایکلیز کی ایڑی کی طرح میرے دل میں نسوانی ہمدردی کا ذرا سا گوشہ غیر محفوظ رہ گیا ہو گا اور کیوپڈ کا تیر اسی رہ سے دل میں لگا، اور میں عبدالصمد خاں مرحوم کے شہر سے دور واقع فلیٹ کے ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ عبدالصمد خاں کی اچانک موت پر جب صوفیہ کو ماں کے گلے سے لپٹ کر بے بسی سے روتے دیکھا تو اُس کے حسن کی لَو سے پہلے ہی موم دل بالکل پگھل گیا۔ اس دنیا میں کروڑوں عورتیں ہیں اور ان میں سے بے شمار صوفیہ کیا اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوب صورت ہوں گی، لیکن مجھے عشق صرف صوفیہ سے ہونا تھا (میرا پہلا عشق، اور آخری بھی کیوں کہ اس کے بعد تو کچھ بچا نہیں، نہ میرے اندر اور نہ باہر۔) اور اسی کو مجھ سے بےوفائی کرنا تھا۔ میں مکمل طور پر عملی آدمی رہا ہوں۔ اپنے مالی تحفظ کے تقاضوں اور ذاتی خواہشوں کی تکمیل میرے اصول رہے۔ کبھی کوئی شخص عشق میں اپنی مجبوریوں کا ذکر سناتا تو میں ہنستا اور دل میں سمجھتا کہ محض بن رہا ہے تاکہ قصوں کہانیوں میں بیان کردہ عشق کی کیفیات پر اپنے واقعات کو منطبق کر کے مسحور کن چمک دمک میں حصہ دار بن جائے۔ وہ واقعی ایسا چاہتا تھا یا

ہیں، لیکن میرے لیے تو عشق صرف دربدری اور خاک بسری لے کر آیا۔

ایک خیال کبھی کبھی گمان کی حد سے گزر کر یقین کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے کہ مجھے صوفیہ سے کوئی عشق وغیرہ نہ تھا، صرف اپنی پہلی بیوی، تین بیٹوں، تین بیٹیوں، تین بہوؤں، تین دامادوں اور دو سالوں کی ضد سے، جو میرے سمدھی بھی تھے، میری ضد چل گئی تھی۔ اس پورے کھیل میں صوفیہ تو محض ایک بہانے کی صورت رکھتی تھی۔ یہ سب میرے رشتہ دار ہونے کے علاوہ تمام کاروباروں میں، جو سب کے سب پرائیویٹ لمیٹڈ تھے، مجموعی طور پر غالب حصے دار بھی تھے۔ سوائے چند ایک اداروں کے جن میں میرے سالوں کا معقول حصہ تھا، سب ادارے قطعی طور پر میری ذاتی ملکیت تھے جو میرے سرمائے سے شروع ہوئے اور میری محنت اور چالاکی سے پنپے لیکن انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، سپر ٹیکس وغیرہ میں بچت کی غرض سے ان لوگوں کو حصے دار ظاہر کیا گیا تھا۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی کہاں تھا کہ ایک وقت آئے گا جب یہی لوگ میرے بدترین دشمن بنے مجھے برباد کرنے پر تل جائیں گے۔

اگرچہ اس وقت صوفیہ میرے دفتر میں ملازم ہو چکی تھی اور مجھے اچھی لگنے لگی تھی (اور وہ میری نظریں بھانپتے ہوئے اور زیادہ اچھی لگنے کی کوشش کرتی ـــــ جہاں مجھ میں صوفیہ کو چاہنے کی خواہش لاانتہا ہے وہاں اس میں چاہے جانے کی ہوس بھی لاانتہا ہے) انھوں نے پہلے اکیلے اکیلے آ کر، پھر دو دو نے مل کر، اس کے بعد سب نے اکٹھے آ کر کہا کہ صوفیہ سے شادی نہ کروں۔ ان میں سے کسی ایک نے، بہ شمول میری بیوی کے، ایک بار بھی مجھے عشق کرنے سے منع نہیں کیا۔ اگر مجھے عشق ہوتا تو کوئی منع کرتا۔ میرا شادی کا عندیہ ظاہر کرنے پر ایک مہینے تک ان لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ابتدائی دنوں میں مجھے سمجھانے کی کوششیں ہوئیں، پھر منت سماجت اور آہ وزاری کی نوبت آئی، آخر میں مجھے برباد کرنے کی دھمکیاں دی گئیں جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ میں کسی دیوتا کی طرح صوفے پر وقار سے بیٹھا اپنے خلاف ان کی فریادیں سنتا رہتا، جیسے خود دیوتاؤں کو سننا پڑتی ہیں، اور مسکراتا رہتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ جو ہمیشہ قدم قدم پر میرے مرہونِ منت رہے ہیں، میرے خلاف کبھی انتہائی قدم نہ اٹھا سکیں گے۔ یہ اگر سانپ ہیں تو ان کے دانت میں نے توڑے ہوئے ہیں۔ یہ اگر شیر ہیں تو میرے سدھائے ہوئے ہیں۔ فقط چابک لہرانے کی دیر ہے فوراً راہ پر آ جائیں گے۔ اس دوران ایک بار میرا دل پسیج گیا۔ سب

Scanned with CamScanner

سے چھوٹی بیٹی سوئٹزرلینڈ سے اپنے ہنی مون سے واپس آئی تو اسے میرے شادی کرنے کے ارادے کی خبر ملی۔ بڑی خوش مزاج، حساس اور ذہین لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ دوسرے سب بچوں سے بڑھ کر وہ صورت شکل میں مجھ سے مشابہ تھی شاید اس لیے میں بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ بیٹھتے ہوئے پوچھا، "ڈیڈی، سنا ہے آپ شادی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا، "ہاں۔"

"جب بھی میں نے آپ کے متعلق سوچا تو مجھے آپ اور ممی دونوں اکٹھے نظر آئے۔ میں ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کر سکتی۔ زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس دن میں آپ کے بارے میں سوچتی نہ رہی ہوں۔ مجھے سدا یقین رہا کہ جب یہ کائنات بنی ہو گی تو آپ اور ممی ساتھ ہوں گے اور اسی طرح سے ہماری ڈیڈی اور ممی تھے۔ جب یہ ختم ہو گی تب بھی ممی اور آپ اکٹھے ہوں گے اور ہمیں اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے۔"

"بیٹی، اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میاں بیوی کے رشتے کا بننا اور بگڑنا تو دو بولوں کی بات ہوتی ہے۔ویسے خدا نخواستہ میں تمہاری ممی سے علیحدگی تو اختیار نہیں کر رہا۔"

"اگر یہی آپ کے خیالات ہیں اور یوں ہی ہٹ پر ڈٹے رہنا ہے تو علیحدگی اختیار کریں نہ کریں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" شمینہ کی کیفیت بھانپتے ہوئے اس موضوع پر مزید بات کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہ رہا اور چپ ہو گیا۔ مسکراہٹ البتہ ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو اولاً اسے ایسا طرزِ تخاطب اختیار کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔ اگر سہواً کر بھی لیتا تو منہ کی کھاتا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سوچتی رہی، پھر اس کی کاجل بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو اس کی زری سے اٹی قمیص کے دامن پر گرنے لگے۔ اس کے سرخی بھرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ میں اس کی دوشیزگی کے زمانے سے اس قدر مانوس تھا کہ وہ مجھے نوبیاہتا دلہن کے روپ میں عورت کا کردار ادا کرتی زیادہ محسوس ہوتی اور ایک بیاہتا عورت کم۔ ویسے بھی اس کی سوچ لڑکیوں والی تھی، کچی اور جذباتی۔ لیکن میرا دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ وہ مجھے روتی ہوئی یوں دکھائی دی جیسے وہ کوئی صوفیہ ہو اور اپنے باپ کی موت پر بلک بلک کر رو رہی ہو۔ جب وہ ذرا سنبھلی تو میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا، "بیٹی! وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ الگ مکان میں رہے گی۔ اس گھر سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو گا۔ تم لوگوں کی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہ ہو گا۔ عملی طور پر تم میں سے کسی کو کبھی پتا بھی نہ

Scanned with CamScanner

چل سکے گا کہ میری کوئی اور بیوی بھی ہے۔

"آپ ہمارے اور صرف ہمارے ڈیڈی تو نہ رہ جائیں گے۔ صرف ہمارے لیے آپ کی مخصوص محبت میں ایک اجنبی عورت حصےدار بن کے آ جائے گی۔"

"یہ میرا وعدہ ہے کہ ہمارا کوئی بچہ نہ ہو گا۔"

باپ کی زبان سے اپنے سوتیلے بچے کا حوالہ سن کر وہ بری طرح جھنجلا گئی۔ اس کے نزدیک شاید یہ جنس کی طرف واشگاف، غیر ضروری اور ایک غلط شخص کی جانب سے غلط اشارہ تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں صوفیہ کی ذہن میں موزوں محل کی شناخت سے محروم ہوتا جا رہا ہوں۔

"آپ شاید میری بات سمجھتے نہیں، یا سمجھنا نہیں چاہتے۔ بچوں کے لیے باپ کی محبت دراصل ماں کے لیے محبت کا ایک رخ ہوتی ہے۔ جب آپ نے ہماری ماں کو ہی پس پشت ڈال دیا تو ہماری کیا بساط رہ گئی۔"

مجھے اس سے اتفاق نہ تھا۔ سچ اگر زبان پر لاتا تو وہ بہت کڑوا تھا، ہم دونوں کی برداشت سے باہر۔ میں خاموش رہا۔ میں اسے کیوں کر بتاتا کہ فطرت کے کارخانے میں بچوں کی پیدائش کے لیے والدین کی محبت کا ہونا نہ ہونا قطعی بے معنی ہے۔ اسے تو اپنے مقصد کے لیے ان کا جسمانی ملاپ درکار ہے جس کے لیے وہ سب کو جنس کی چاٹ لگا کر اپنے کام سے کبھی کی فارغ ہو چکی۔ مجھے اُس کی ماں سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ اب ہے۔ شادی تو میں نے اس کے جاہل نانا کی دولت پر فریفتہ ہو کر کی تھی جو تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے ایک قصبے میں دودھ دہی کی دکان کرتا تھا اور پھجل شیخ کے نام سے معروف تھا۔ کراچی اس کے گھر بر دکھاوے پر گیا تو وہاں جس پھوہڑ پن اور احمقانہ انداز سے دولت کی نمائش کی گئی تھی اسے دیکھ کر مجھے ابکائی آ گئی۔ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ صنعت کار بنا لے گا لیکن وہ جب تک زندہ رہا اس نے مجھے صنعت کاری کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا اور ہر بار یہی کہہ کر ٹالتا رہا کہ سنٹرل سُپیریئر سروسز (جو نام وہ اپنی زبان سے ادا کرنے کا اہل نہ تھا) سے الگ نہ ہونا، پچھتاؤ گے۔ میرے سرکاری اثر و رسوخ کا اس نے جی بھر کے آخر تک مفاد اٹھایا۔ یک بڑی وجہ مجھے بددل کرنے کی یہ بھی ہو گی کہ مستعفی ہونے کے بعد میں اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ کر پاؤں گا۔ میری آخری امید، اپنی وراثت، یوں غارت کی کہ مرنے سے پہلے ایک ایک جائیداد، کاروباری حصص اور تمام ادارے اپنے دونوں بیٹوں کے نام کر

گیا اور مجھے ایک کوڑی نہ مل سکی۔ پہلی صنعت تو میں نے ملازمت کے دوران اسمگلنگ اور رشوت سے کمائے ہوئے روپے اور بڑے بھائی کے جبڑوں سے چھینا باپ کا ترکہ بیچ کر اور سابقہ ساتھیوں کے تعلقات کی بدولت شروع کی۔ مجھ پر کسی کا کیا احسان ہے ـــــ بیوی کا یا اس کے بھائیوں کا یا ان کی اولادوں کا۔ ثمینہ کی بات اور ہے۔ اس کی شادی بھی خاندان سے باہر کی ہے۔ وہ تو میری شبیہ ہے، میرا جوان اور نسوانی بدل ہے جس سے میں پیار کرتا ہوں۔

میں نے کہا، "دیکھو بیٹی، ہر شخص کی بہ حیثیت ایک فرد کے دیگر اہل خانہ سے الگ اپنی زندگی بھی ہوتی ہے، جہاں وہ قطعی ذاتی اور پرائیویٹ خواہشوں، خوفوں، حسرتوں، تمناؤں اور وسوسوں کے جھرمٹوں میں گھرا زندہ ہوتا ہے۔ یہ شادی انھیں تمناؤں میں سے ایک کی تکمیل ہے۔ جب اس میں کسی کا کوئی نقصان نہیں تو تم مجھے زندہ رہنے کا حق کیوں نہیں دینا چاہتیں؟ میری خواہش کی راہ کیوں روکتی ہو؟"

"آپ نے ممی کو دیکھا ہے؟ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ اپنا ڈھانچا رہ گئی ہیں۔ یہی صورت رہی تو وہ آپ کے زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے سے پہلے مر جائیں گی۔"

مجھے ایک دھچکے سے احساس ہوا کہ زرینہ جہاں میری بیوی ہے وہاں اس کی ماں بھی ہے۔ میں اتنی دیر ثمینہ سے یوں بات کرتا رہا تھا جیسے وہ صرف میری بیٹی ہے مجھ اکیلے کی۔ اس کی تو ماں ہے اور زندہ ہے اور وہ میری مخالف ہے۔ عجیب ذہن ہے جو پہلے اس کا پورا شعور اور وقوف نہ رکھ سکا یا رکھنا نہ چاہتا تھا۔

ثمینہ نے پوچھا، "کب ملے تھے آپ ان سے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہنا چاہیے کیوں کہ مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ آخری بار زرینہ کب ملا تھا اور کیا بات ہوئی تھی۔ متذبذب ہوتے ہوئے کہا، "کوئی چار روز ہوئے۔"

یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔ "تو گویا آپ میں ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں۔ نہ کریں یہ شادی ڈیڈی، اپنے پیار کرنے والوں کو دشمنوں میں نہ بدلیں۔"

"اچھا تمھاری خاطر میں دوبارہ سوچوں گا، یہ میں نے دل سے کہا۔

شام میں جب صوفیہ سے ملاقات ہوئی اور اس نے گلے میں بانہیں ڈالیں تو میرے ذہن میں ثمینہ سے کیے وعدے کا دور دور تک کوئی شائبہ نہ تھا۔

جس روز خان صاحب صوفیہ کی ملازمت کا وعدہ لے کر گئے تھے اس کے دوسرے روز وہ اسے ساتھ لیے میرے دفتر میں آ گئے۔ وہ اونچی لمبی، سڈول بدن کی، سرخ و سفید، صحت مند بیس بائیس سالہ عورت تھی۔ سیاہی مائل بالوں میں نمایاں سنہری جھلک اور گہرے شربتی رنگ کی حیران حیران سیال آنکھیں۔ خوب صورت آنکھیں اس کی شخصیت کا حاوی جزو تھیں۔ وہ نازک نہ تھی مگر لگتی تھی۔ اس کی چال میں کوئی ایسی بات تھی، یا اس کے بدن کے خطوط کا آپس میں ربط ضبط کچھ ایسا تھا، کہ نزاکت جھلکتی۔ کوئی زیور نہ پہنے تھی، شاید اس لیے کہ وہ خود یک زیور تھی، سونے میں ڈھلی مورت تھی۔ نئی جگہ اور نئے لوگوں میں پہلی بار نکلنے کے باعث ایک جھجک کی کیفیت ضرور اس کے چہرے سے ہویدا تھی، مگر خان صاحب کی طرح وہ بے یقینی میں ڈوبی یا خوف اور گھبراہٹ کی ماری ہرگز نہ تھی۔ لگتا تھا کہ اسے پورا احساس ہے کہ سامنے دور تک لمبا وقت پھیلا ہے اور ساتھ میں روشن چہرہ ہے، اس لیے حال کی بدحالی کے باوجود مستقبل اسے زیادہ دیر تک ٹال نہ سکے گا۔ وہ بی اے تو تھی مگر کوئی خاص کام نہ جانتی تھی، نہ کسی دفتر میں پہلے ملازمت کا تجربہ تھا۔ اسے رکھنا بھی ضرور تھا کیوں کہ خان صاحب کی آخری امید توڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ پہلے اکاؤنٹس سیکشن میں بھیجنے کا ارادہ کیا کہ بڑا سیکشن ہے وہاں کھپ جائے گی۔ لیکن پورا سیکشن مردوں سے اٹا تھا، دوسری کوئی عورت وہاں نہ تھی۔ سوچا معصوم سی لڑکی ہے، ان گرگوں کی نظروں کی تاب کیوں کر لا سکے گی۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں لڑکیاں تو ہیں لیکن تنخواہ بہت کم ہے۔ آخر میں نے اسے پرسنل اسسٹنٹ متعین کر لیا۔ اپنے کمرے سے ملحق باہر لکڑی کا نیا کیبن بنوایا اور ذاتی ٹیلی فون کی وہاں ایکسٹینشن لگوائی۔ ٹیلی فون سننے اور ملانے کے علاوہ چائے کافی اور لنچ وغیرہ کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ یہ کام پہلے بھی نہایت خوش اسلوبی سے ہو رہے تھے لیکن مقصد تو محض اسے رکھنے کے لیے کوئی جواز پیدا کرنا تھا، بالخصوص دوسروں کے لیے یا اپنوں کے لیے۔ پہلے پہل میں جب بھی اسے دیکھتا تو ذہن میں کوئی بھولی ہوئی بات یاد آنے کے لیے مچلنے لگتی، مگر یاد نہ آ چکتی۔ گمان کرتا کہ شاید پہلے اسے کہیں دیکھا ہو۔ لیکن ایسا کوئی موقع یاد نہ آ سکا، اور اس نے بھی اس مفروضے کی کبھی تصدیق نہ کی۔ وہ جب کمرے میں آ نکلتی تو یوں لگتا کہ سنسیدگی سے سرتاسر بھرے کمرے میں کسی نے دفعتاً رونق کا سوئچ آن کر دیا ہو۔ قالینوں کے چپ رنگ بولنے لگتے، مردہ دیواریں مسکرا دیتیں۔ وہ مہمانوں کی تواضع اور انتظامات میں تیزی سے اندر آتی

جاتی، گھومتی پھرتی تتلی کی طرح سبک، مصروف اور رنگین اڑتی پھرتی مجھے بہت بھلی لگتی۔ جس دن وہ دفتر نہ آتی، مجھے رہ رہ کے خیال آتا رہتا کہ کوئی چیز تھی جو میں کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں یا میں نے کھو دی ہے۔ پھر خیال آتا کہ صوفیہ کی غیر حاضری مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ایک دن وہی بھولی بات چمکی کی طرح چمکتے ہوئے میری یادداشت میں آ کے اندھیرے گوشے کو روشن کر گئی۔ صوفیہ کی ماہ جبیں سے مماثلت ہے ـــــ اگرچہ دور کی ہے لیکن ہے ضرور۔ جب ماہ جبیں سے دوستی ہوئی تو وہ تقریباً اسی عمر کی تھی، لیکن یہ مشابہت صرف جوان عمری تک محدود نہ تھی۔ ان کے رنگ، قد، بدن اور کسی قدر چہروں کی ساخت ایک سی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ ظلم میں بہ آسانی ایک دوسرے کی ڈبل ہو سکتی تھیں۔ مگر ان کی مشابہت بس یہیں تک تھی۔ ماہ جبیں بھولی، سادہ اور سست تھی، کسی کچھوے کی طرح۔ صوفیہ شوخ، تیز اور چست تھی، کسی ہرنی کی طرح۔ ماہ جبیں کی آنکھوں میں جو کچھ لکھا ہوتا، اسے کوئی بچہ بھی غلط نہ پڑھ سکتا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں کی تحریر پر، نئی کھوئی ہوئی تہذیب کے کھنڈروں میں ملنے والے ان کتبوں کی سی ہوتی جنھیں ابھی تک پڑھنے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکا ہو ـــــ ہر اکھر ایک معما، ہر نشان ایک پہیلی۔

میرے پاس کام زیادہ تھا۔ بسا اوقات دفتر بند ہو جانے کے بعد بھی رات تک بیٹھا رہتا اور ساتھ میں ذاتی عملے کو بھی موجود رہنا پڑتا۔ خان صاحب ہر شام پانچ بجے صوفیہ کو اپنی پرانی سی کار میں لینے کے لیے آتے اور وہ اجازت لے کر گھر چلی جاتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اعتماد آتا گیا تھا۔ کسی روز جلد فارغ ہو جاتا تو میں اسے گپ لگانے کے لیے اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ وقت اچھا کٹ جاتا۔ اس وقت میری خواہش ہوتی کہ اس کے حسن کو دفتری آداب کی بندشوں سے آزاد، شگفتگی کے نکھار میں رچا بسا دیکھوں۔ میری بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی دانستہ کوششوں نے اور بلند قہقہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ ذہین تھی اور اپنی حدود کا شعور رکھتی تھی۔ موقع محل کی مناسبت سے بخوبی آگاہ تھی۔ دفتر کے اوقات میں اور دوسروں کی موجودگی میں رکھ رکھاؤ کا پوری طرح خیال رکھتی۔ میں نے دیکھا کہ وہ باتیں دلچسپ کرتی ہے اور شستہ حسِ مزاح رکھتی ہے۔ خاں صاحب کی موت کے بعد تو یہ دستور ہو گیا کہ میں جب تک بیٹھا رہتا وہ میرے میز کے ارد گرد منڈلاتی، چہچہاتی پھرتی رہتی۔ ڈرائیور موجود ہوتا تو وہ پہنچا آتا، نہیں تو میں گھر جاتے اسے راستے میں چھوڑتا جاتا۔ کیوں کہ خاں صاحب کے بعد میں نے انھیں شہر میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ

کرائے پر لے دیا تھا۔ اس سے پہلے ایک شام جوں کہ خان صاحب کو ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا اور صوفیہ کو گھر چھوڑنے کی ڈیوٹی ڈرائیور کی تھی، اس لیے وہ اطمینان سے میرے پاس بیٹھی تھی۔ کہنے لگی، "سر! آپ نے سگریٹ کبھی نہیں پیا؟"

"نہیں۔ ایک دو بار پی کے دیکھا ہے، لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے نہیں پیتا۔"

"ہائے سر، اگر آپ سگریٹ پئیں تو اور بھی manly لگیں گے۔ آج آپ ایک سگریٹ میری خاطر پئیں۔"

ایک بے ضرر سا تقاضا تھا جیسا اپنے اپنوں سے کیا کرتے ہیں۔ چند مہینوں میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اسے یہ فرمائش کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں بھولے شکار کی طرح قدم بہ قدم اس کے دام میں پھنستا چلا جا رہا تھا جو اس نے بچھایا بھی کبھی بے خبری میں دلائی میری شہ پر ہو گا۔ وہ مہمانوں کے لیے رکھے سگریٹ اٹھا کر لے آئی۔ میں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔ اس نے لائٹر جلایا۔ اس کا اتنا قرب، بدن کی مہک، میرے چہرے پر لہراتی لٹ کا لمس ـــــ اس کے جسم کی چاہت میں میرا بدن خشک لکڑی کی طرح جل اٹھا۔ لیکن میرے پیش نظر کچھ تلخ حقیقتیں تھیں ـــــ اپنی عمر کی، خان صاحب سے دوستی کی، بیوی بچوں کی اور سب سے بڑھ کر اپنی عزت و شہرت کی۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی پھلانگنا میرے لیے مشکل تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑنے کے لیے بڑھایا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور تھوتھنک یو کہتے ہوئے اپنی توجہ دوسری طرف لگانے کے لیے منہ سے چھوڑے دھوئیں کو دیکھنے لگا جو کسی زندہ چیز کی مانند بے کل اور مضطرب چھت کی طرف رینگ رہا تھا اور میں اسے گئے وقت کی طرح خاموش بیٹھا بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً ڈرائیور کو بلا کر صوفیہ کو پہنچانے کے لیے کہا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے پیچھے وہی لاینحل تحریر درج تھی اور ان دونوں پر حاوی مجھے فاتحانہ مسکراہٹ کے گزرتے ہوئے سائے کا شک سا پڑا۔ میں اضطرابی حالت میں اپنی ہمیشہ کی عادت کے مطابق آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھا۔ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو جلد کی پژمردگی، تھکن اور جھریوں کے جال کی ابتدا ہوتے دیکھ کر آئینہ دیکھنے کا حوصلہ نہ رہا۔ واپس پلٹا۔ دوسرا ہاتھ اونچا کر کے دیکھا۔ وہ بھی ویسا ہی بوڑھا تھا۔ دائیں ہتھیلی کو خوش قسمتی کے لیے دیکھنا چاہا۔ پھر یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ چاہے خوش قسمتی کا سیلاب ہی کیوں نہ آ جائے میں جوان تو ہو نہیں

سکتا۔ باقی جو کچھ ہے کافی ہے، اور خوش قسمتی کیا کرنی ہے۔ آکر نڈھال سا صوفے پر گر پڑا۔ ساری عمر کی تگ و دو کے بعد اب کامیابی کا لطف اٹھانے کا موقع آیا ہے تو پچپن برس کا بڈھا بنا بیٹھا ہوں۔ جوان تھا تو مستقبل بھیانک بھوت کی طرح ڈراتا تھا۔ جوانی میں یہ مال و دولت میسر ہوتا تو بات تھی۔ عجب تماشا ہے کہ زندگی میں کچھ بھی کبھی ٹھیک وقت پر نہیں ہوتا۔ میں افسردگی میں ڈوبا شیشے کی بند کھڑکی میں جا کے کھڑا ہو گیا۔ شام کی گہری سلیٹی لاش میں جگمگاتی کاروں کے کیڑے کلبلانے لگے تھے۔ دو منزل نیچے عمارت کے احاطے سے ہٹ ہٹ کر سڑک چل رہی تھی اور میں بے خیالی میں سے دیکھے جا رہا تھا۔ شام رات میں بدل گئی۔ رات اور اس کا ٹھہرا ٹھٹھکا خاموش اندھیرا، کسی نئے بھکاری کی طرح سیدھا سادہ، آنکھیں میچے لب بند کھڑا تھا۔ اس کے مقابل دن کی چیختی ہوئی تیز طرار روشنی، حقیقتوں کی طرح دو ٹوک، ہر چیز کو چاقو کی مانند تیز اور ہر زاویے کو کاٹ دار بناتی چلی جاتی ہے۔ رات ازلی اور ابدی ہے۔ دن سورج کا مرہونِ منت ہے اور اس کے مٹتے ہی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ بھاگتی کاروں کی روشن بتیوں کی شعاعیں لپکتے جاتے کھوڑوں کے سروں پر لگے انٹینوں کی طرح پہلے سے سامنے کی راہ ٹٹولتی چلی جاتیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے لگا کہ دائیں بائیں دوڑے جاتے یہ ٹین کے ڈبے تعاقب میں لگے دشمن سے جان بچانے کی خاطر خوفزدگی اور گھبراہٹ میں کہیں بھاگے جا رہے ہیں۔ بھاگ دوڑ تو عارضی ہے، جمود اندھیرے کی طرح مستقل اور ابدی ہے۔ حرکت تو روشنی کی طرح مستعار ہے، جھوٹ ہے۔

کھڑکی میں کھڑے کھڑے کہیں سے مجھے ایک عرصے کے بعد جمیلہ کا خیال آ گیا۔ میں تیز قدموں سے چلتا میز پر آیا اور جمیلہ کے فون نمبر کا پہلا ہندسہ گھمایا اور رک گیا۔ ہاتھ میں رسیور پکڑے پتھر بنا کھڑا رہا اس مخمصے میں کہ فون ملاؤں یا نہیں۔ جمیلہ پینتیس چالیس سالہ، کسے کسائے بدن کی خوبرو عورت تھی۔ زندگی میں خاصا کامیاب خاوند تھا۔ اچھے بھلے تین چار بیٹے بیٹیاں تھے۔ اس نے اپنی ہشیاری سے بنگلہ، دو کاریں، نوکر چاکر سب کچھ مہیا کر لیا تھا، لیکن اس کی روح کو چین نہ تھا۔ پیچھے رہتے جانے کا غم ایک روگ کی طرح اس کے دل کو کھاتا رہتا۔ وہ اپنے آپ کو معاشرے کے باغی کے طور پر پیش کرتی مگر سب سمجھتے تھے کہ وہ صرف چور ہے باغی نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ زمانہ پالتو کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے دم ہلاتا پھرے، اور حالت یہ تھی کہ وہ زمانے کے پیچھے پیچھے دم ہلاتی پھرتی تھی۔ اسے شدید احساس تھا کہ مخلوقِ خدا نے اس کے حُسن کی وہ قدر نہ

کی جس کی وہ حق دار تھی۔ ایک خاوند اور ہاتھ کی انگلیوں پر آسانی سے گنے جانے والے چند عاشق، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مزہ تو تب تھا کہ اک جہان اس کے حسن کا متوالا ہوتا اور ہر کوئی جمیلہ جمیلہ پکارتا پھرتا۔ کامیاب مرد اس کی کمزوری تھے اور وہ اپنی صنف کا فائدہ اٹھانا جانتی تھی۔ نہ تو شکار کا اشتیاق ختم ہونے دیتی نہ اتنا مایوس کرتی کہ میدان ہی چھوڑ کے بھاگ جائے۔ دس سال پہلے میر اس سے تعارف ہوا تھا اور میں نے جب بھی اسے بلایا اس نے انکار نہ کیا۔ ہاتھ روکتے روکتے میں نے آخر اس کا نمبر ملا ہی لیا۔ ہنستے ہوئے کہا، "جان! بڑی اُفتاد میں پھنس گیا ہوں۔ بس فائر بریگیڈ کی طرح جھٹ چلی آؤ۔"

اس شام میں اپنے آپ سے اور صوفیہ سے بری طرح ڈر گیا تھا۔ میں گمان نہ کر سکتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں آدمی اس طرح کے جذبے کے سامنے یوں بے بس کے کنارے تک پہنچ سکتا ہے۔ میں اگر اس کا بازو پکڑ لیتا تو کچھ دور نہ تھا کہ وہ میرے سینے پر سر رکھ دیتی۔ پھر میں کہاں اور کیسے رکتا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خاں صاحب کی دل آزاری کے خوف سے اسے نوکری سے نہیں نکال سکتا۔ اگر کہیں اور بھیج دوں تو وہ بھی نکالنے ہی کے مترادف ہوگا کیوں کہ خاں صاحب اسے فوراً ملازمت چھڑوا دیں گے۔ جوان لڑکی ہے، شادی شدہ بھی رہ چکی ہے، اس کے یقیناً بدنی تقاضے ہوں گے جنھیں خاں صاحب خاندانی شرافت کے زعم میں سمجھنے سے انکاری ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ خاندانی لوگوں کی بہو بیٹیاں جنس کے تقاضوں سے پاک ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک جنس خاندانی مردوں اور غیر خاندانی عورتوں کے درمیان پُرلطف کھیل ہوگا، باقی تو سب تکمیلِ فریضہ ہے نسل انسانی بڑھانے کے لیے۔ دوسری شام میں خاں صاحب اور ان کی بیگم کو جلد صوفیہ کی شادی کر دینے کی ترغیب دینے کے لیے گیا۔ میں دیانت داری سے سمجھتا تھا کہ اس سے نہ صرف صوفیہ کا، بلکہ میرا بھی مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ خاں صاحب اور ان کی بیگم ڈرائنگ روم میں آ کے بیٹھ گئے۔ میں نے بات شروع کی، "صوفیہ کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ وقت بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے۔"

کہاں تو وہ دونوں بنس بنس کر میرا استقبال کر رہے تھے اور کہاں یک دم گہری فکر میں ڈوب گئے۔ خاں صاحب کہنے لگے، "شاہد صاحب، کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ اپنوں میں کوئی اس

قابل نہیں۔ باہر رشتہ کر کے دیکھ لیا۔"

میں نے کہا، "ساری دنیا ایک سی نہیں ہوتی۔ آپ بیٹی کو ساتھ لے کر دوستوں واقفوں کے ہاں آیا جایا کریں۔ صوفیہ کو لوگ دیکھیں گے، اس سے بات چیت کریں گے تو کوئی خاندان متوجہ ہوگا۔ آپ اس کو لیے چار دیواری میں بند بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے کیسے چلے گا۔"

خاں صاحب کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ "شاہد صاحب، ہم پٹھان ہیں۔ صدیوں سے ہماری کچھ روایات چلی آ رہی ہیں۔ یہاں کوئی انھیں نہیں پہچانتا تو نہ پہچانے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ملک نودولتیوں سے پٹا پڑا ہے جن کا دولت کے علاوہ کوئی اصول ہی نہیں۔ یہ لڑکی چاہے ساری عمر گھر میں بیٹھی رہے، میں ان کی سی بے غیرتی نہیں اپنا سکتا۔" میں ان کی بات سن کر مسکرا کے رہ گیا۔ مجھے خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ان میں کچھ لچک پیدا ہو گئی ہو گی۔ مجھے ان کے ردعمل پر ایک گونہ مسرت ہوئی کہ ابھی کچھ لوگ ہیں جو مٹتی ہوئی اقدار کے لیے پلٹ کر لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مجھے خود اپنے خاندانی ہونے پر فخر ہے۔ کئی پشتوں سے روپے پیسے کی ریل پیل گھر میں ہے۔ زمینوں کے وسیع رقبے ہمارے خاندان کی ملکیت میں رہے۔ ذات پات میں بھی پیچھے نہ تھے۔ ککے زئی پٹھان ہیں۔ خان، ملک، شیخ، جو چاہیں القاب نام کے ساتھ لکھ لیں۔ لیکن اصل خاندانی کہلانے کے وہ زیادہ مستحق سمجھے جاتے ہیں جنھیں گئے وقتوں میں کسی شاہی خاندان کی سرپرستی حاصل رہی ہو۔ خاں صاحب کو یہ دعوی بھی تھا۔ بزرگوں کے زمانے میں ڈیوڑھی پر ہاتھی واتھی جھولنے کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ میرا پردادا افغانستان اور ترکستان جیسے دور افتادہ ممالک سے گھوڑے لا کر ہندوستان کے راجوں مہاراجوں، نوابوں اور انگریزی افسروں کے پاس بیچا کرتا تھا۔ اس سوداگری سے اس نے بہت روپیہ کمایا۔ کہتے ہیں کہ وہ اُس زمانے میں لکھ پتی ہو گیا تھا۔ اس تجارت کے باعث لاہوریے اسے ملک فتا گھوڑیاں والا کہتے تھے۔ یہ نام ایسا مشہور ہوا کہ لاہور کے پرانے رہنے والے آج تک ہمارے خاندان کی شناخت کے لیے یہی خطاب استعمال کرتے ہیں۔ ایک بار میں نے بڑے بھائی سے پوچھا کہ ہمیں "گھوڑیاں والے" کی بجائے "گھوڑوں والے" کیوں نہیں کہتے۔ انھوں نے ہنس کے جواب دیا کہ "ملک فتح محمد گھوڑے بیچ دیتے تھے اور اپنے اصطبل میں صرف اچھی نسل کی گھوڑیاں جمع کرتے تھے، کیوں کہ وہ افزائش نسل میں زیادہ سود مند تھیں۔ چند برسوں کے اندر اندر کئی گنا زیادہ منافع ہاتھ آتا اور اصل پھر بھی قائم رہتا۔" صحیح معنوں

Scanned with CamScanner

میں خزانہ اس کے ہاتھ تب لگا جب انگریزی فوجیں پنجاب پر قبضہ کرنے کے لیے ستلج عبور کر کے پیش قدمی کر رہی تھیں۔ گھوڑوں کی سوداگری کے دوران کوئی انگریز عہدے دار اس پر مہربان ہو گیا تھا۔ اس نے ملک فتا کی انتظامی صلاحیتوں اور روپیہ کمانے کی لگن کو جانچتے ہوئے اور انگریزوں سے اس کی وفاداری دیکھتے ہوئے اسے گھوڑوں کے لیے دانہ، چارا اور گھاس وغیرہ فراہم کرنے کا ٹھیکا دے دیا۔ وہ بڑا ہشیار آدمی تھا۔ اگلی مہم سے پہلے وہ انگریزی مقبوضہ علاقے میں مستعدی سے مطلوبہ چیزوں کا وافر ذخیرہ مہیا کر لیتا۔ اس کے علاوہ محاذ سے اگلی طرف دشمن کے علاقے میں بھی اپنے خفیہ کارندوں کی مدد سے عام راستوں سے ہٹ کر واقع چھوٹے چھوٹے دیہات میں مقامی لوگوں کی شراکت میں بھوسے اور دانے کے مختصر گودام خریدتا چلا جاتا۔ اور پھر بھی کوئی چیز کم پڑ رہی ہوتی تو اس کے کارندے بے بس دیہاتیوں سے بہ نوکِ شمشیر لُوٹ کر لے آتے۔ جب دو فوجیں آمنے سامنے لڑنے پہ تلی کھڑی ہوں تو غریب کاشتکاروں کی فریاد کون سنتا ہے۔ ویسے بھی پنجاب کے لوگ صدیوں سے حملہ آوروں کے اس طرح کے ظالمانہ سلوک کو خاموشی سے برداشت کرنے کے عادی تھے۔ اس کی پیدا کردہ زرعی زمینیں اور شہری جائیدادیں وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی بکتے رہنے کے باوجود بزرگوں کے اللوں تللوں کی کسی نہ کسی طرح، والد صاحب کی موت تک، متحمل ہوتی رہیں اور شہر میں رئیس ہونے کا بھرم بھی قائم رہا۔ والد صاحب مرنے سے دس سال پہلے فالج کے حملے سے بستر پر پڑ گئے تھے۔ اس دوران بڑے بھائی ان کے مختارِ عام تھے۔ انھوں نے خاموشی سے بقیہ جائیدادوں کا بیشتر حصہ فروخت کر کے جو روپیہ ملا اس سے اپنے اور بیوی کے نام پر نئی جائیدادیں خرید کر لیں اور کاروبار جما لیے۔ مجھے تعلیم اور سی ایس ایس کے امتحانوں وغیرہ میں لگائے رکھا۔ میں اپنے اخراجات اور آسائشوں کے لیے جو چھوٹی موٹی رقمیں مانگتا مشترکہ کھاتے میں سے بڑی دریادلی سے دیتے رہتے۔ والدہ کی زندگی میں حسبِ سابق سابقہ ہیں سب کچھ چلتا رہا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے دھوکا دہی کا پتا چلا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے، مایوس ہو کر شیخ مچل دودھ فروش کے نودولتیے اور غیر خاندانی خانوادے میں زرینہ سے شادی کر لی کہ چلو اس راہ سے ہی صنعت کار بننے کی کوئی سبیل نکالوں، مگر شیخ نے قریب نہ پھٹکنے دیا۔

دوسرے دن ایک دفتری کام کے سلسلے میں دو دن کے لیے اسلام آباد چلا گیا۔ کام سے

فارغ ہو کر شام کو ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھے اس بے طرح یاد آنے لگی جیسے وہ کوئی شے ہو اور میں ایک جنگل۔ مجھے کسی کل چین نہ تھا۔ ایسا مضطرب ہوا کہ مجبور ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کی یاد ذہن کے چاروں کونوں میں آزادانہ سرسراتی پھر رہی تھی اور میں بے بس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ شام کاٹنا عذاب ہو گیا۔ طبیعت کسی دوست کے ہاں جانے یا دل چسپی کے کسی بھی مشغلے کو اپنانے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ میرے لیے کسی کو اس طرح یاد کرنے اور اس کے لیے اُداس ہونے کا زندگی میں پہلا تجربہ تھا۔ میں نے جانا کہ گزشتہ شام کی محسوسات کسی وقتی اشتعال کے تحت نہ تھیں۔ میرا صوفیہ سے لگاؤ کہیں زیادہ گہرا ہے جسے میں اس وقت صحیح طور پر پرکھ نہ سکا۔ بار کر کراچی صوفیہ کے گھر فون کیا۔ اس کی آواز سنی تو کچھ قرار آیا۔ شروع میں دفتر کے بارے میں چند سوالات کیے اور آخر بات اظہار محبت پر آ کر ٹھہری جسے میں بہانوں سے لبوں پر لانے سے ٹالتا آرہا تھا لیکن آج صوفیہ سے دوری کسی طور کھینچ کر اسے اندر سے باہر لے آئی۔ جواب میں اس کی طرف سے لمبی خاموشی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ فون پر میری ہیلو ہیلو کی تکرار پر اس نے کہا، "ہاں ہاں۔ کہیے، میں سن رہی ہوں۔"

"اب کہنا تو تم نے ہے، میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔"

"میں جس آگ میں اتنے دنوں سے پھنک رہی ہوں، بارے آپ بھی کچھ دیر اس کا مزہ اٹھائیے۔ کیا حرج ہے۔"

میں اس سے بات ختم کر کے طمانیت سے نڈھال، بوٹوں اور سوٹ میں ملبوس اسی طرح بستر پر گر پڑا اور وہیں سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ صوفیہ ایک بے چہرہ خوش پوش نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی، مستی میں سرشار چلی جا رہی ہے۔ نوجوان کا ہاتھ اس کی کمر میں ہے اور اس کا سر اُس کے کندھے پر۔ کبھی سر اٹھا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیتی ہے اور ہنستی ہوئی، ڈھیتی دیوار کی طرح بے بس، پھر اس پر گر پڑتی ہے۔ میں حیرت میں ڈوبا دونوں کو گزرتے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے حیرت اتنی فرصت بھی نہ دے رہی تھی کہ حسد کی جلن محسوس کر سکوں، یا پھر میں اور حسد ایسے یک جان ہو چکے تھے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز نہ کیا جا سکتا تھا۔ خدایا! یہ کون شخص ہے؟ منکشف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر ہے اور امریکا سے واپس آ گیا ہے۔ اس نے نہ کسی سیم سے شادی

کی تھی اور نہ صوفیہ کو طلاق بھجوائی تھی۔ یہ سب کسی کی شرارت تھی۔ میں حیرت کے جھٹکے سے نکل کر مایوسی کے پہاڑ کے نیچے دب جاتا ہوں۔ اس پر میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ خواب نے پریشان کر دیا، بالخصوص اس لیے کہ ایسا ہونا قیاس سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہی کام ادھورا چھوڑ کر واپس کراچی پہنچتا ہوں اور اس کے والدین کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرتا ہوں۔

دوسرے دن صبح کو تو واپس کراچی نہ پہنچ سکا البتہ شام کو جہاز سے اترتے ہی سیدھا صوفیہ کے گھر گیا۔ تینوں سے ملاقات ہوئی، لیکن خاں صاحب سے بات کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ دل کی بات دل میں لیے گھر چلا گیا۔

رات کے دو بجے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے سوئے سوئے رسیور اٹھا کے پوچھا، "کون؟" صوفیہ تھی اور روئے جا رہی تھی۔ غصہ کافور ہو گیا اور تجسس کھل گیا۔ میں بار بار پوچھ رہا تھا، "کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟" مگر وہ رونے پر قابو نہ پا سکی۔ میں نے کہا، "اچھا، اماں کو فون دو۔" وہ فون پر آئیں تو ایک مرتبہ "ہائے خاں صاحب" کہہ کر رونے لگیں۔ اس سے آگے وہ بھی کچھ نہ بتا سکیں۔ میں نے کہا، "اچھا میں آ رہا ہوں۔" تو گویا خاں صاحب اپنی دیانت داری اور سنہری روایات کو سینے سے لگائے اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ کیا معصوم اور وضع دار آدمی اس دنیا سے اٹھ گیا۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ میں لباس بدل کر باہر نکلا تو برآمدے میں بیوی کھڑی تھی۔ "آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"میرے ایک دوست کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ وہاں جا رہا ہوں۔"

"کون دوست؟"

"ایک صاحب ہیں خان۔ آپ انھیں نہیں جانتیں۔"

"وہی جو آپ کی پرائیویٹ سیکریٹری صوفیہ کے والد ہیں؟"

"ہاں۔"

"میں ساتھ چلتی ہوں۔"

"آپ وہاں کیا کریں گی؟ کیا پتا کہاں کہاں بھاگنا پڑے ہسپتالوں میں، ڈاکٹروں کے پیچھے۔"

"نہیں۔ آپ ذرا ٹھہریے، میں چلوں گی۔"

اس کے لہجے اور ضد سے ظاہر تھا کہ اسے شک ہے کہ میں کوئی عذر تراش کر صوفیہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لیے جا رہا ہوں۔ میں نے بھی سوچا کہ آدھی رات کو بھرے گھر کے سامنے لڑنے سے بہتر ہے کہ یہ ساتھ چلے اور میرا سچ جھوٹ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

کھلے آسمان پر اکیلا چاند اپنی دیوانگی میں مست ایک جوش کے عالم میں دھند کی سی چاندنی کے بھبوکے چار سُو اڑا رہا تھا۔ سیدھی سنسان سڑک بچھی تھی۔ ردگرد بنگلوں میں لگے ہر طرح کے درختوں کے سیاہ ہیولے تیز ہوا میں جھولتے نظر آ رہے تھے۔ جہاں چاندنی ذرے ذرے کو جگمگا رہی تھی وہاں درختوں کے تنوں کے اردگرد گہری ہوتی شام کا سا اندھیرا پھیلانے کا موجب بن رہی تھی۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

کار کے شیشے چڑھے تھے اور ایئرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ اندر دو اجنبی مسافر چپ اپنے خیالوں میں ڈوبے خاموش بیٹھے بظاہر سامنے والی سڑک کو دیکھ رہے تھے، مگر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ذہن کچھ نوٹ کر رہے تھے یا نہیں، لیکن ہر چیز ایک خاموش فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر ضرور رہی تھی۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے خاں صاحب کو صدیوں سے چلا آتا جینے کا قرینہ سکھایا ہو گا، مختلف اقدار کی اہمیت ان کے دل پر نقش کی ہو گی جو آج تک ویسے ہی نقش رہی اور زمانے کے بدلتے معیار انھیں ماند نہ کر سکے۔ آج وہ نستعلیق شخص جسے گزری صدیوں نے اپنے سائے میں پالا تھا، مر گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ صدیاں بھی اپنی اقدار سمیت مر گئیں۔ یہاں کی خاک اس کے ضمیر کو اپنے بطن میں قبول کرے گی یا وہ میری اور اس عورت کی طرح سدا ایک دوسرے کے برابر برابر مگر متوازی خطوط پر چلتی رہیں گی۔ جب کبھی قبر کھلے گی تو دونوں خاک اور ضمیر الگ الگ پڑے ہوں گے۔

میں نے کہا، "کیا خبر وہ مر گئے ہوں۔"

بیوی نے چونک کر پوچھا، "کون؟"

"خاں صاحب، اور کون۔"

"ہاں ں ں۔ کیا وہ اتنا زیادہ بیمار تھا؟"

"دل کی بیماری ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ آناً فاناً لے جاتی ہے آدمی کو۔"

Scanned with CamScanner

ہم شہر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ سڑک کے کنارے بیابان میں ایک تین منزلہ اکیلی بلڈنگ چاندنی میں نہائی ٹھٹھکی کھڑی تھی۔ اس میں ایک فلیٹ خاں صاحب کا تھا جس کی بڑی خوبی اس کا سستا ہونا تھا۔ ریت میں ہر طرف دور دور تک خاردار جھاڑیاں پھیلی تیز ہوا میں سنسناری تھیں۔ جھاڑ پھونس کی بنی جھونپڑیوں کے دو تین جھنڈ فاصلے فاصلے پر خوف سے جیٹے سمٹائے آنکھیں بند کیے کھڑے تھے۔ اس علاقے کی اصل جغرافیائی صورت اور بود و باش کی کیفیت یہی تھی جسے کراچی بزور دبا کر قبضے میں لاتے ہوئے اپنی شکل و صورت میں ڈھالتی جا رہی ہے۔ میں نے عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کی۔ وہاں تین چار پرانی کاریں چاندنی میں اداس کھڑی تھیں۔ ان سے ہٹ کر خاں صاحب کی پرانی مورس مائنر، جو آپ بتی بند ہو چکی تھی، کھڑی تھی۔ زنگ آلود ٹین کا فرسودہ ڈبا چاندنی کے یوں بے رحمی سے ننگا کر دینے پر اور بھی افسردہ اور مایوس دکھ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ خاں صاحب کے فلیٹ کا دروازہ بھی سب دروازوں کی طرح بند تھا اور اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ موہوم سی امید بندھی کہ شاید زندہ ہوں۔ گھنٹی دی۔ بیگم صاحب نے آ کر دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھ گئیں۔ میری بیوی نے انہیں اٹھایا۔ صوفیہ خاں صاحب کے پلنگ کی پٹی میں منہ دیے رو رہی تھی اور کچھ بولتی جا رہی تھی جو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں پلنگ کے قریب خاموش کھڑے ہو گئے۔ ہمیں کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ ہم اپنے آپ کو کیا کریں میں سوچ رہا تھا کہ خاں صاحب اگر اپنے وطن میں فوت ہوتے تو اب تک بیسیوں عزیز رشتے دار آنسو بہاتے اکٹھے ہو چکے ہوتے۔ پھر خیال آیا کہ خاں صاحب نے ایک بار بتایا تھا کہ اب وہاں بھی وطن کہاں باقی رہ گیا ہے۔ زمانے نے سب کچھ تتر بتر کر دیا ہے۔ محلوں، بازاروں میں گھوم جائیے، کوئی شناسا چہرہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ اس میں سے کچھ بھی تو نہیں بچا جو کبھی تھا۔ میں نے دیکھا کہ صوفیہ کا ہاتھ پٹی سے کھسک کر بے جان سا فرش پر آ رہا اور سسکیوں سے بدن کا لرزنا تھم گیا۔ میں نے بیوی سے کہا، یہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ زرینہ نے آگے بڑھ کر صوفیہ کو سنبھالا۔ اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، دیکھیں، بیٹی کو ہوش آ رہا ہے۔ آپ خود سنبھلیں گی تو اسے حوصلہ دلائیں گی۔" ہم تینوں صوفیہ کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے آئے۔ میں سوچنے لگا کہ خاں صاحب زندگی کی جنگ ہر محاذ پر ہار کر اب چادر میں منہ چھپائے سو

رہے ہیں۔ ان کا حشر دیکھ کر میں کانپ گیا۔ ناکامی کی دہشت نے ایک بار پھر مجھے آن دبوچا۔ دم گھٹنے لگا۔ آج اس کوٹھری میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ میں نے غربت کے خوف سے ڈھیروں دولت پیدا کی لیکن ہو کر وہی رہا جس کے سہم سے عمر بھر جوتا دوبھر رہا تھا۔ ساری کی ساری دولت محبت کے ایک ہی داؤ میں ہار دی۔ خاں صاحب جب دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ کنگال نہ تھے، میں ہوں۔ انھیں پنشن کا سہارا تھا اور ان کی ناخوشی بھی بس اتنی ہی تھی جتنی کہ ان کی پنشن کی رقم تھی۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں اور اسی نسبت سے میری طمانیت اور خوشی بھی مکمل ہے۔ زندگی کوئی جنگ نہیں۔ اس میں نہ فتح ہوتی ہے نہ شکست۔ محض زندہ رہنے کا وسیلہ ہے، جب تک چلے۔ ہم نے اپنی انا کی پرستش کے جواز میں اسے خواہ مخواہ جنگ بنا لیا ہے۔ پتا نہیں لوگ سیدھے سبھاؤ کیوں نہیں جیتے؟ جیسے درخت اور پرندے جیتے ہیں۔ جب موت آئے تو مر جائیں۔

میں نے انھیں شہر میں مکان کرائے پر لینے کی تجویز دی اور کہا کہ موجودہ کرائے سے جتنا کرایہ زیادہ ہوگا وہ میں ادا کر دوں گا۔ اماں نے کہا کہ عدت کے تین ماہ ختم ہونے سے پہلے وہ اس فلیٹ سے قدم باہر نکالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔ خاں صاحب کے چلے جانے سے ان کے مسائل مالی سے زیادہ عدم تحفظ اور تنہائی کے تھے۔ صوفیہ اگر گھر بار والی ہوتی تو خاں صاحب کی موت ماں بیٹی کے لیے اتنی بڑی کمی کا سبب نہ بنتی اور انھیں جلد صبر آ جاتا۔ صوفیہ کو صبح دفتر کی گاڑی لے آتی۔ شام کا وقت ہوتا تو میں پہنچا آتا اور نہ دفتر کی گاڑی تو ہوتی ہی تھی۔ اماں گھر کے تمام معاملات میں، کیا پکانا ہے سے لے کر بڑے فیصلوں تک میں صوفیہ کے منہ کی طرف دیکھتیں اور جو وہ کہہ دیتی، چاہے ان کے خلاف منشا ہی کیوں نہ ہو، اس کو چپ چاپ قبول کر لیتیں۔ لیکن اس کے باوجود صوفیہ کی کیا مجال تھی کہ اپنی مرضی سے کہیں آ جا سکے۔ گھر کے اندر بھی اماں ہمہ وقت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتیں۔ محبت بھی عجیب سرپھروں کا کھیل ہوتا ہے۔ کڑی نگرانی کے باوجود ہم بوس و کنار کے لیے مواقع پیدا کر ہی لیتے۔ اماں جتنی بھی سادہ لوح تھیں، آخر انھوں نے پوری صورت حال کو بھانپ لیا۔ کب تک چھپ سکتی تھی۔ ایک شام ہم صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے باتوں میں بالکل بھول گئے کہ کہاں بیٹھے ہیں اور میرا بازو اس کے کندھے پر چلا گیا، اور اوپر سے اماں آ گئیں۔ غصے میں بولیں، "اے لڑکی! اٹھ یہاں سے اور جا کے اپنے کمرے میں بیٹھ۔" مجھ پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ندامت اور پریشانی میں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ مجھ سے

مخاطب ہو کر کہنے لگیں، "آپ کے تیور میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں اور یہ سمجھتی ہوں کہ آپ کی رور رور کی آمد بلامقصد نہیں۔ خاں صاحب تو چلے گئے مگر میں زندہ ہوں اور میرے دیدوں کا پانی ابھی ڈھلا نہیں۔ کل سے یہ دفتر نہیں جائے گی نوکری ختم۔ خاں صاحب کی پنشن ہم دونوں کی گزراوقات کے لیے کافی ہے۔ نہ بھی ہوتی تو ہمیں ایسی نوکری کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو اس سے ایسی ہی ہمدردی ہے تو دو بول پڑھوا لیجیے اور عزت آبرو سے رخصت کرا کے جہاں جی چاہے لے جائیے۔"

میں نے کہا، "میں تو خود آپ سے درخواست کرنے والا تھا لیکن سوگ کے ایام ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ جو بھی شرائط آپ کہیں مجھے منظور ہیں۔"

صبح کے تین بج رہے تھے۔ میں کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے نوبیاہتا جوڑے کے سویٹ میں پڑا اپنے خیالوں میں گم چھت کو بلاوجہ گھورتا ہوا اونگھنے کو ترس رہا تھا۔ ساتھ میں کروٹ لیے صوفیہ سو رہی تھی۔ گہری نیند میں ڈوبی وہ بوجھل بوجھل سانسیں لیتی کتنی معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کا سارا گلیسر کہیں اڑ گیا تھا، باقی صرف ایک عورت رہ گئی تھی، اُن سب عورتوں جیسی جو گاڑی کے انتظار میں منہ پر پلو لیے ریلوے پلیٹ فارم پر پڑی سو رہی ہوتی ہیں۔ کل کا دن مصروف کٹا۔ اگرچہ زیادہ ہنگامہ نہ کیا گیا تھا ــــ ایک بوڑھے کی دوسری شادی کسی مطلقہ سے ہو رہی ہو تو اس پر جتنے مہمان ہوتے ہیں اس سے بھی کم تھے ــــ لیکن میرے اعصاب دن بھر کھنچے رہے کہ کہیں میرے بیوی بچوں یا سالوں میں سے کوئی آ کر جھگڑا نہ کھڑا کر دے۔ مگر خیر گزری کہ انھوں نے ایسا نہ کیا۔ وہ چاہتے تو یہ حجت کر سکتے تھے کہ دوسرے نکاح کے لیے پہلی بیوی سے اجازت نہیں لی گئی۔ مجھے نیند آ جانی چاہیے تھی۔ سب رسومات بخیر و خوبی انجام کو پہنچ گئیں۔ آخری رسم بھی اس کمرے میں آ کر ادا ہو چکی۔ میں چوں کہ دنیا کے دھندے نپٹانے کے بعد گھر جا کر آرام کرنے کا عادی ہوں، اس لیے شاید میرے جسم و روح اب اس انتظار میں ہیں کہ یہ شخص فرائض سب بھگتا چکا ہے اور سب کی مخالفت کے باوجود شادی کرنے کی ضد بھی پوری کر چکا ہے، تو اسے اب ہمیں گھر پہنچانا چاہیے تاکہ یہ بھی آرام کرے اور ہم بھی آرام کر سکیں۔ یہ یہیں پسرا پڑا ہے۔ واقعی مجھے وہاں ہوٹل کے بستر پر صوفیہ کے پہلو میں پڑے ہونا عجیب غیر فطری سا لگ رہا تھا۔ میں رنگین

خوابوں کی سرزمین میں زیادہ دیر نہیں بھٹک سکتا، جلد زمین پر لوٹ آتا ہوں ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے لیے۔ ماہ جبیں سے مجھے محبت تھی۔ متعدد بار اسے ملنے کے لیے گوجرانوالہ گیا۔ کچھ بدنامی کے چھینٹے بھی اڑے۔ لیکن میں نے کوئی پروا نہ کی۔ جوں ہی احساس ہوا کہ اُس کی وجہ سے میری منزل کھوٹی ہو سکتی ہے تو دل کی کچھ چلنے نہ دی۔ قطع تعلق کے بعد وہ بہت دنوں تک مجھے بری طرح یاد آتی رہی۔ مسلسل خوابوں میں اسے دیکھتا تھا۔ صرف ایک بار اظہارِ طلب کرنے پر وہ میری ہو سکتی تھی، لیکن نہیں کیا۔ زرینہ اور اس کے گھر کا ماحول پہلی بار ہی دیکھنے پر مجھے ایک آنکھ نہ بھایا، لیکن شادی جھٹ سے رچالی۔

پتا نہیں مجھے کس وقت نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ سامنے صوفیہ کرسی پہ بنی ٹھنی خاموش بیٹھی چمک رہی تھی، فریم میں لگی تصویر کی طرح۔ میرے دل میں اس کا پیار چڑھتے سمندر کی لہر کی مانند زور کر آیا۔ اسے اتنا قریب اور دسترس میں پا کر طبیعت جھوم اٹھی۔ مخالفت کے باوجود شادی کر لینے کی عقلمندی پر اپنے آپ کو مبارک دی۔ صبح والی سوچ یوں لگا جیسے کسی اور شخص کی تھی جو شاید تھکا ہوا تھا اور تبخیرِ معدہ کا مریض بھی تھا۔

"تم اتنی جلدی بیدار ہو گئیں گویا دفتر پہنچنا ہو۔"

'اور آپ اتنی دیر تک پڑے سوتے رہے حالاں کہ دفتر بھی جانا ہے۔ پتا ہے، آج شام ولیمہ ہے اور کل ہمیں صبح صبح ہنی مون کے لیے پہاڑ پر نکل جانا ہے۔'

'دنیا کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اصل بات تو ہے دل کی تمنا کا پورا ہونا۔ تبھی تو ایسی بے فکری کی نیند آئی۔' وہ یہ سن کر ہنسی ـــــ اپنی ذات پر تفاخر کی ہنسی۔

شادی سے تقریباً ایک ماہ پہلے میں نے صوفیہ اور اماں کے لیے تین بیڈروم کا نیا تعمیر شدہ بنگلہ، جو دو اور ویسے ہی بنگلوں کے پڑوس میں مشترکہ چاردیواری کے اندر واقع تھا، کرائے پر لیا اور فوراً ہی انھیں وہاں منتقل کر دیا۔ شادی بھی وہیں ہوئی۔ دونوں بنگلوں کے سامنے اتنا بڑا مشترکہ لان تھا جس میں بہ آسانی ٹینس کھیلی جا سکتی تھی۔ سڑک کے رخ لوہے کا مضبوط پھاٹک لگا تھا جس پر ہر وقت چوکیدار موجود رہتا۔ اندر آنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ چوکیدار گاڑی اور سواریوں کو پہچان کر اندر آنے کے لیے دروازہ کھولتا۔ ایک بنگلے میں تو ایک غیر ملکی معمر جوڑا رہتا تھا۔ مسٹر روتھ مین کا ڈبلیو ایچ او سے تعلق تھا اور وہ صبح نو دس بجے گھر سے نکل جاتا اور اور چار پانچ بجے واپس آتا۔ بوڑھی

سیم وقت کٹی کے لیے سلائی کڑھائی میں مصروف رہتی اور کبھی کبھار اماں سے گپ لگانے چلی آتی۔ صوفیہ مقدور بھر مترجم کے فرائض انجام دیتی، باقی وہ دونوں اشاروں کی مدد سے کام چلا لیتیں۔ جہاں کچھ پسا نہ چلتا وہاں صبر کر لیتیں اور دوسری بات چھیڑ دیتیں۔ دوسرے بنگلے میں یوسف خاں اور ان کی بیگم مع اپنے دو اسکول جاتے بچوں کے رہتے تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور پختون تھے، لیکن دونوں میاں بیوی اردو پٹھانی لب و لہجے میں ٹھیک ٹھاک بول لیتے تھے۔ یوسف خاں کراچی میں مختلف قسم کی تاریں بنانے کی صنعت اپنے خاندان کی ملکیتی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی جانب سے چلاتے تھے۔ دونوں پڑوسی خاندان شریف، پڑھے لکھے اور با اخلاق تھے، جیسے کہ اس طبقے کے لوگ بالعموم نظر آتے ہیں۔ نجی ملازموں میں سے یوسف خاں کا اپنے وطن سے لایا ڈرائیور اور ہمارا بنگالی باورچی رات کو وہاں رہتے تھے جبکہ باقی سب ملازم رات کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ مجھے اس طرف سے اطمینان تھا کہ میری غیر موجودگی میں بھی وہ ان لوگوں کے درمیان ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

بنی مون سے واپس آ کر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق میں ایک رات صوفیہ کے ہاں قیام کرتا اور ایک رات زرینہ اور بچوں کے ساتھ گزرتا۔ ہنی مون کے بعد جب پہلی بار پرانے گھر جانے کے لیے تیار ہوا تو مجھے سخت بے کلی تھی کہ نہ معلوم وہ لوگ کس قدر رکھائی سے پیش آئیں اور کیسی بدسلوکی کا مظاہرہ کریں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ سب لوگ مجھے یوں ملے جیسے میں کسی لمبے سفر سے کئی دن کے بعد لوٹا ہوں اور بیچ میں صوفیہ سے میری شادی کا واقعہ گویا سرے سے ہوا ہی نہیں۔ ان کے اس درگزر کے رویے نے ایک بار تو میرا دل چھوتا اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔ صوفیہ کی باری کی رات اگر شام کو پرانے گھر گیا ہوتا تو بعض اوقات تو اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں اتنا مگن ہو جاتا کہ مجھے وقت کا احساس نہ رہ جاتا۔ کبھی وہ ضد کر کے آئس کریم وغیرہ کھانے نکل پڑتے تو میں صوفیہ کو فون پر کوئی عذر بنا کے نہ آسکنے کی اطلاع کر دیتا۔ دوسرے دن جب میں پہنچتا تو اسے خاموش اور کھنچا کھنچا پاتا۔ ایک بار کہنے لگی، "ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ اُدھر کی باری ہو اور آپ یہاں ٹھہر گئے ہوں۔ ویسے بھی میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اب سرد مہر ہوتے جا رہے ہیں۔"

"صوفیہ، ایسی کوئی بات نہیں۔ شروع شروع کی محبت والا جنون سدا کون قائم رکھ سکا ہے

جو ہم قائم رکھ سکیں گے۔' میں نے ہنستے ہوئے اضافہ کیا، "شادی ویسے بھی محبت کا نشہ اتارنے کا پرانا آزمودہ نسخہ ہے۔ وہ خواب ہے اور یہ حقیقت، ان دونوں کا میل کہاں ہو سکتا ہے۔"

زندگی دو سال تک ایسے ہی سیدھی سیدھی چلتی رہی۔ لگ رہا تھا کہ اسے بس اب آخر تک یوں ہی چلتے رہنا ہے۔ اور وہ ڈرانے دھمکانے والے خواہ مخواہ میں تونا چینا کی کہانیاں بانکنے والے نظر آنے لگے تھے۔

ایک دن صوفیہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہنے لگی، 'اگر میرے بھی کوئی بچہ ہوتا تو آپ کی دل لگی کا ذریعہ مہیا کرنے میں اس گھر کا بھی کوئی حصہ ہو جاتا۔"

میں جواب میں ہنس پڑا۔ 'ایسا کیوں سوچتی ہو۔ اس گھر میں میری دل لگی کا سامان تم کیا کم ہو۔" لمحہ بھر کے لیے مجھے جرم کا شدید احساس ہوا لیکن اعتراف کی حماقت یا فضیحتا کھڑا کر دیتی۔ میں نے صوفیہ سے نکاح کرنے سے پہلے اپنے بچوں کی وراثت جہاں تک ممکن ہو انہیں تک محدود رکھنے کے لیے خفیہ طور پر لاہور جا کر لس بندی کا آپریشن کرا لیا تھا اور میرے سوا کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، 'بے شمار ایسے جوڑے ہوتے ہیں جن کی اولاد نہیں ہوتی، لیکن ان کے درمیان محبت آخر تک قائم رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بچہ نہ ہو تو سوائے ایک دوسرے پر پورا جذباتی انحصار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ شاید اسی وجہ سے ان کے درمیان محبت بھی عام جوڑوں کی نسبت زیادہ گہری ہوتی ہے۔'

وہ اسی طرح مایوسی میں ڈوبی ہوئی بولی، "پتا نہیں کیا ہوتا ہو گا۔ ہماری تو شادی کو بھی دو سال ہو چکے۔ آپ کے تو بچوں کے بھی بچے ہو چکے، آپ کو بھلا کیوں فکر ہونے لگی۔'

"تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر لو۔"

"کیا ہے۔ وہ کہتی ہے آپ کا ٹیسٹ ہونا چاہیے۔'

"بھئی میرے تو چھ بچے ہیں، مجھے کیا اب بھی ٹیسٹ کی ضرورت باقی ہے؟'

"عمر..." اس نے چیختے ہوئے کہا۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر اضافہ کیا، وہ کہتی ہے تمہاری زیادہ عمر کی وجہ سے ضروری ہے۔'

"مجھ سے بالا ہی بالا تم نے ڈاکٹروں سے مشورے شروع کر دیے؟" میں نے اس کی بات سے پہلو تہی کر کے حملہ کیا۔

"تو کیا اب ڈاکٹر سے بھی بات تم سے پوچھ کر کیا کروں؟ کیا سو سال پہلے کی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔"

میں نے لڑائی کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا کہ ایسا نہ ہو کہ بات ہر پھر کر دوبارہ میرے ٹیسٹ پر آ جائے۔ ہر چند دنوں کے وقفے کے بعد وہ یہی تقاضا دہرا دیتی۔ میرا جواب ہر بار یہی ہوتا کہ "لیڈی ڈاکٹر نے تمھیں کیا پٹی پڑھا دی ہے۔ مرد، گر ایک بار اہل ثابت ہو جائے تو پھر مرنے تک اہل رہتا ہے۔ چلیے یہ بھی فرض کر لیں کہ میں اب نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔ ٹیسٹ کوئی علاج نہیں ہے۔ تم کیا قدرت سے لڑ سکتی ہو؟"

اس بات کو ابھی چند ماہ گزرے تھے، بلکہ ابھی ٹیسٹ والا پوڑا چل ہی رہا تھا کہ اماں نے صوفیہ کی غیر موجودگی میں مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بات شروع کی۔ "شاہد احمد، صوفیہ پچھلے کئی مہینوں سے بہت پریشان چلی آ رہی ہے۔ آپ کو کوئی فکر نہیں۔ نہ تو وہ ڈھنگ سے کھاتی ہے نہ چین سے سوتی ہے۔ بات بات پر لڑتی ہے۔"

"کیوں، کیوں؟ کیا بات ہو گئی؟"

"دیکھیے بات یہ ہے کہ زندگی موت تو اللہ کے اختیار ہے، لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جو پہلے آتے ہیں وہ پہلے جاتے ہیں۔ صوفیہ کے کوئی بچہ نہیں اور نہ اب اسے ہونے کی امید رہی ہے۔ نقص اس میں ہے یا آپ میں، اللہ کو معلوم ہے۔ اس کے نام کوئی جائیداد نہیں کہ وہ وقت کی روٹی کا وسیلہ بن سکے۔ گھر تک بیچاری کا اپنا نہیں۔ آپ ایسا کریں کہ لاہور والی شیکسٹائل مل جو صرف آپ ہی کی ملکیت ہے، اس کے نام منتقل کر دیں۔ خاندان والوں کے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ آپ کی ذاتی جائیداد تھی آپ نے جس کو چاہا دے دی۔ اور پھر کسی غیر کو تو نہیں دے رہے، اپنی بیوی کو دے رہے ہیں۔"

میں یہ سن کر ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اماں اپنے آپ یہ بات نہیں کر سکتیں، ضرور صوفیہ نے انھیں اکسایا ہے۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ سکا کہ "اچھا، مجھے اس کے سارے پہلوؤں پر غور کر لینے دیجیے، پھر دیکھیں گے۔"

بہت دنوں تک گھر میں مل کی منتقلی کی رٹ چلتی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ صوفیہ کا مزاج ہر وقت برہم رہنے لگا۔ بات بات پر کھانے کو دوڑتی۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھ سے بولنا ہی چھوڑ

دیا۔ پھر سوالوں کا جواب دینا بھی بند کر دیا۔ معاملے کو ایسی لاینحل صورت اختیار کیے ایک مہینا گزر گیا۔ میں اس مقاطعے سے زچ ہو گیا، لیکن طبیعت کسی طور مل منتقل کرنے پر آمادہ نہ ہو رہی تھی۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایک دن مجھے دفعتاً ایک کاروباری کام کے سلسلے میں دفعتاً لاہور جانا پڑ گیا۔ کچھ متعلق کاغذات صوفیہ کے ہاں پڑے تھے۔ جہاز چھوٹنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں بھاگم بھاگ گھر آیا۔ اماں لاؤنج میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں سیدھا بیڈروم میں چلا گیا۔ جالی لگی کھڑکی سے کیا دیکھتا ہوں کہ باہر مشترکہ لان میں ٹینس کا نیٹ لگا ہے اور صوفیہ خوشی میں بھڑکتا شعلہ بنی ایک خوب صورت نوجوان کے مقابل ٹینس کھیلنے میں جی جان سے مصروف ہے۔ کورٹ کے کنارے کرسیوں پر مسز روتھ مین، بیگم یوسف اور ان کے دونوں بچے خوب جوش و خروش سے تالیاں بجا بجا کر کھلاڑیوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ گیند باہر نکل جاتی تو بچے دوڑ کر اٹھا لاتے۔ نوجوان کو گیند پر پورا کنٹرول تھا۔ وہ کورٹ میں جہاں چاہتا وہاں گیند پھینک دیتا اور کہتا لو اب اٹھاؤ۔ وہ کبھی اٹھا لیتی، کبھی نہ اٹھا پاتی تو نعرہ بلند کرتی، "یہ بے ایمانی ہے، فاؤل ہے۔" ایک ایک پوائنٹ پر آپس میں دوستانہ تکرار ہوتی۔ بچے بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ آخر میں مسز روتھ مین فیصلہ کر دیتیں۔ سبھی بہت خوش تھے اور ایک ایک پوائنٹ سے پورا پورا لطف نچوڑ رہے تھے۔ لڑکے کی بھرپور جوانی اور دل میں گھر کر جانے والا حسن اور صوفیہ کا بے تکلفانہ رویہ دیکھ کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یک بارگی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور مجھے لگا کہ صوفیہ میرے ہاتھوں سے گئی۔ میں تو اس جگہ کو ایک محفوظ قلعہ سمجھتا تھا جہاں کوئی جوان مرد کبھی پھٹک نہ سکے گا۔ یہ کون، کب اور کیسے یہاں آ گیا میرا بنا بنایا کھیل چوپٹ کرنے۔ کاش میں آج جوان ہوتا اور اس کی جگہ اسی ماحول میں صوفیہ کے مقابل ٹینس کھیل رہا ہوتا۔ میں کمرے سے کاغذات لے کر نکلا تو اماں نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ میں نے پوچھا، "یہ ٹینس کھیلنا کب سے شروع ہوا یہاں؟"

"اسے تو ایک مہینا ہو گیا۔"

"مجھے بتایا ہی نہیں کسی نے۔"

"صوفیہ نے نہیں بتایا؟"

"وہ مجھ سے بولتی کب ہے؟ یہ نوجوان کون ہے؟"

"بیگم یوسف کا بھائی ہے۔ فوج میں کپتان ہے۔ تبدیل ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا ہے۔"

"مجھے صوفیہ کا غیر مردوں کے ساتھ یوں بے تکلفی سے ملنا بالکل پسند نہیں۔"

"کل سے نہیں کھیلے گی۔ منع کر دوں گی۔"

"میں ایک کام سے ابھی لاہور جا رہا ہوں۔ کل شام تک واپس آ جاؤں گا۔"

ایک تنگ و تاریک، دھوئیں سے بھرا کمرہ ہے۔ دھول سے اٹی ایک بوسیدہ آتش ٹیبل لمبائی کے رخ والی دیوار کے درمیان میں دیوار کے ساتھ لگی رکھی ہے۔ میز کچھ پھٹی پرانی کتابوں، اخباروں رسالوں اور کچھ چُرمُر ہوئے میلے کپڑوں سے بھری ہے۔ لوہے کا زنگ آلود ٹیبل لیمپ میز پر پڑی چیزوں میں الجھا میز کی سطح کی طرف منہ کیے جل رہا ہے اور بہ مشکل ایک موم بتی جتنی روشنی پھونک رہا ہے۔ سامنے کی دیوار میز والی دیوار سے چھ فٹ دور ہو گی۔ وہاں ایک تپائی پر چائے کے پتا نہیں کب کے جھوٹے برتن پڑے سڑ رہے ہیں۔ لیکن وہاں کمرے سمیت کچھ بھی زیادہ واضح نہیں۔ ہر چیز ایک عجیب طرح کی دھند میں لپٹی ہے۔ پورا ماحول گندا اور گھٹیا ہونے کے علاوہ افسردگی اور مایوسی کا احساس دلاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سردی کا موسم ہے، لیکن مجھے سردی لگ بھی نہیں رہی۔ وہاں کوئی آگ بھی روشن نہیں۔ مجھے خیال آتا ہے باہر یقیناً بہت سردی ہو گی۔ دونوں دیواروں کے درمیان تنگ جگہ میں ایک سیدھی پشت والی گدے دار بغیر بازوؤں والی کرسی ہے جس کی بدرنگ پوشش جگہ جگہ سے پھٹ کر لٹک رہی ہے۔ کرسی کی پشت آتش ٹیبل کے لمبائی والے رخ سے لگی ہے۔ اس پر ایک شخص مادر زاد ننگا، دُہرا ہوا اس طرح بیٹھا ہے کہ اس کے پاؤں زمین پر ہیں اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھی اس کا بوجھ سنبھالے ہیں۔ بائیں ہاتھ میں سلگتا ہوا سگرٹ ہے جس میں سے مسلسل اٹھتا دھواں کچھ دور سیدھا چلا جاتا ہے، پھر ٹھوکر سی کھاتا ہوا دوبارہ سیدھا ہو کر بکھرنا شروع ہوتا ہے اور مٹ جاتا ہے۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ چہرے سے اور بدن کے ڈھیلے پن سے لگتا ہے کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ اس کے سوا اس کے چہرے اور بدن سے کسی بھی قسم کے تاثر کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا۔

میں پتا نہیں کمرے میں کس مقام پر کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں۔ شاید بیک وقت ہر جگہ موجود

ہوں۔ اس شخص کو میری موجودگی کا کوئی علم نہیں۔ پھر میرا دل کہتا ہے کہ اسے میری موجودگی کا علم ہے لیکن وہ اس حقیقت سے کلی طور پر بے پروا اور بے نیاز ہے۔ کمرے میں اگر کوئی اور ہے تو رہے، اس کی بلا سے۔ وہ اپنے اسی سوڈ میں ذرہ برابر فرق لائے بغیر بیٹھا رہتا ہے۔ یہ شخص کون ہے؟ کچھ پتا نہیں چلتا۔ لگتا ہے یہاں کوئی اور بھی تھا جو ابھی ابھی کسی ضرورت سے اٹھ کر گیا ہے اور ابھی واپس آ جائے گا۔ یہ انتظار کا مختصر وقفہ بتا رہا ہے۔ میں یہاں کس لیے آیا ہوں؟ میں اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوں، کچھ پتا نہیں چلتا۔ مجھے چلے جانا چاہیے۔ میں جانے کا ارادہ باندھتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں کہ صوفیہ اس کی گود میں بیٹھی ہے ـــــ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے، اسی کی طرح لباس سے عاری۔ مرد کے چہرے پر وہی پرتاثر لاتعلقی کا ثبت ہے اور کسبِ لذت میں وہ اس سے کہیں زیادہ دل چسپی کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ پھر وہ اس کے برابر لاتی ہے تو وہ اسے ہونٹوں پر مشینی انداز میں چومتا ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ اسے میری موجودگی کا علم نہیں لیکن اس وقت ششدر رہ جاتا ہوں جب وہاں بیٹھے بیٹھے وہ نئی بیاہی کتیا کی طرح کھیسیں نکالتے ہوئے چیختی ہے:

"تو یہاں کیوں آیا ہے؟ چلا جا یہاں سے!"

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے وہاں جانے پر اس قدر بدمزہ کیوں ہوئی۔ اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس کے ڈانٹ پلانے پر نہ تو مجھے غصہ آیا نہ میں نے بدلہ لینے کی ٹھانی نہ کسی ردعمل کا اظہار کیا، بس پی گیا۔ ذرا سی سبکی ضرور محسوس کی اور دل میں شرمندہ ہوا کہ میں یہاں آیا ہی کیوں تھا۔

کراچی پہنچنے پر میں نے لاہور والی مل صوفیہ کے نام منتقل کر دی اور دونوں گھروں میں باری باری شب باشی کا دستور ختم کر دیا اور ہر رات صوفیہ کے ہاں قیام کرنے کا طریق اختیار کیا۔ ساتھ ہی میں نے کرائے پر ایسا نیا مکان لینے کے لیے تلاش شروع کر دی جس کے ہر طرف بڑے بڑے لان ہوں، الگ تھلگ ہو تاکہ اڑوس پڑوس والوں سے کسی قسم کے تعلق واسطے کا کوئی امکان نہ رہ جائے۔ ایسا گھر جلد ہی مل گیا اور میں، صوفیہ اور اماں کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔

مل صوفیہ کے نام منتقل کرنے کی دیر تھی کہ میرے خاندان میں افراتفری مچ گئی۔ زرینہ کے بڑے بھائی، جو میرے بڑے بیٹے راشد اور بڑی بیٹی راشدہ کے سسر بھی تھے، دفتر میں مجھے

ملنے کے لیے آئے اور کہا، "دیکھیے شاہد صاحب، آپ حرف بہ حرف وہی کر رہے ہیں جس کا ہمیں ڈر تھا۔ خیر، یہی کرنا تھا آپ نے۔ میں پہلے بھی اسی طرح چند خاندانوں کو ڈوبتے دیکھ چکا ہوں۔ ہم نے پوری کوشش کی کہ آپ کے ساتھ صلح صفائی سے رہیں اور جو ظلم آپ نے پورے خاندان پر کیا تھا اس کو بھول جائیں۔ ہم نے اسے بھلا دیا اور آپ کی دوسری شادی کو قبول کر لیا، لیکن آپ اپنے اس وعدے پر قائم نہ رہ سکے کہ دوسری شادی کو کاروباری معاملات میں دخیل نہ ہونے دیں گے۔"

"بھائی صاحب، آپ کیوں اس قدر ناراض ہو رہے ہیں؟ بیٹھیے تو سہی۔ میں نے کیا کیا ہے؟ کسی مشترکہ کاروبار کے حصص اس کے نام منتقل نہیں کیے کہ وہ آپ کے لیے کبھی خطرہ بن سکے۔ ایک چھوٹا سا ساڑھے بارہ ہزار اسپنڈلز کا یونٹ تھا، جو تھا بھی صرف میرا۔ حق مہر کے عوض کاغذات کی حد تک اسے دے دیا ہے۔ اس کا انتظام میرے پاس رہے گا اور آمدن بھی میں لوں گا۔ اس سے بھلا ہماری مشترکہ کمپنیوں اور اداروں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟"

"وہ مل کہاں سے آئی ہے؟ انھیں مشترکہ کمپنیوں کے منافع سے لگی ہے۔ ہم نے اشتراک پر اصرار نہیں کیا تو اور بات ہے۔ آپ نے اپنے بچوں کا حق اس غیر عورت کو دے دیا ہے اور وہ بچے ہمارے بھی ہیں۔ ہم آپ کو ان کا حق غصب کر کے اس عورت کو دینے نہیں دیں گے۔ ہم سب اکٹھے ہیں اور سب کی متفقہ رائے یہی ہے۔ پہلا وار آپ نے کیا ہے۔ اب ہم اپنے دفاع میں جو کچھ بھی کریں آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔" اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔ میں ناگاہ صدمے اور رنج سے کانپ رہا تھا۔ اب بھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے اس کا اخلاقی طور پر جواز تھا۔ اگر شادی یا اس کے عواقب سے ان میں سے کسی کو بھی کوئی ذہنی یا جذباتی صدمہ پہنچتا تو وہ اس کا ردعمل پہلے ظاہر کرتا۔ کسی غیر صورت سے محبت اور شادی پر انھیں دراصل سرے سے کوئی اعتراض تھا ہی نہیں۔ میں چاہے دس شادیاں کرتا یا بیس داشتائیں رکھتا، ان کی جوتی کو فکر نہ تھی۔ بات تو تب بگڑی جب انھوں نے سمجھا کہ میں ان کے مشترکہ خاندانی مالی مفادات کو خطرے میں ڈالنے کا موجب بن رہا ہوں۔ اس پر سب متحد ہو گئے تاکہ مجھے کچل کر ہمیشہ کے لیے یہ کانٹا ختم کر دیں۔ یہ لوگ، بالخصوص میرے دونوں بیٹے اور دونوں سالے، میری شادی کے پہلے دن سے موقعے کی تلاش میں تھے کہ کوئی عذر ان کے ہاتھ لگے تو مجھے نکال باہر کریں۔ اب انھوں نے

زبردستی اس منتقلی کو حذر بنا لیا ہے تاکہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرتے اور زمانے کے سامنے مناسب جواز پیش کرتے ہوئے مجھے تباہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے پرانے ساتھی خوف سے مجھے اپنے شکنجے میں دبوچ لیا۔ میں وکیل سے مشورہ کرنے دوڑا۔

میں جانتا تھا کہ اگر اب بھی میں لاہور والی مل واپس اپنے نام پر منتقل کر لوں تو یہ مصیبت یہیں ختم ہو جائے گی۔ لیکن صوفیہ کو نوجوان کے ساتھ ٹینس کھیلتے دیکھنے اور لاہور میں وہ حواب دیکھنے کے بعد صوفیہ کی ناراضگی دوبارہ مول لینے کی ہمت نہ رہی تھی۔ یہ تو صرف دولت جا رہی ہے جو میری اپنی پیدا کردہ ہے۔ اگر چلی بھی گئی تو میں پھر پیدا کرنے کے سکت رکھتا ہوں۔ لیکن اگر صوفیہ چلی گئی تو اب یہ حالت ہے کہ میں اسی وقت مر جاؤں گا۔

میں نے اگرچہ پرانے گھر میں کئی دنوں سے رات کا ٹھہرنا بند کر دیا تھا لیکن پھر بھی دن میں ایک چکر ضرور وہاں کا لگا لیتا۔ کبھی دوپہر کے کھانے پر، کبھی شام کی چائے پر۔ بیوی بچوں سے گپ لگاتا، چھوٹے بچوں سے کھیلتا اور پرانے دستور کے مطابق ہنستا ہنساتا دو تین گھنٹے صرف کرتا۔ زرینہ کے بھائی کی آمد کے بعد میں پرانے گھر گیا تو دیکھا کہ وہاں کوئی مجھ سے بات کرنے کا روادار نہیں۔ بچوں کو پکڑ کر کمروں میں بند کر دیا گیا کہ کہیں ان کی معصول کی گرم جوشی مجھے ان کے متحدہ احتجاج کے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہ ڈال دے۔ بیٹیاں بہویں تیوریاں چڑھائے کچھ دیر اپنے کاموں میں مصروف چپ چاپ پھرتی رہیں، پھر اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ زرینہ باہر نکلی ہی نہیں۔ ان کے اس رویے سے میرے دل پر ایسی چوٹ پڑی کہ میں تڑپ اٹھا۔ جہاں مالی مفادات کا معاملہ ہو وہاں کسی دل پر چوٹ پڑنے کی کوئی کہاں پروا کیا کرتا ہے۔ میں نے عمر بھر کبھی خود پروا نہ کی تھی۔ میں غصے میں بھرا ہال کمرے میں گھڑا، جس میں بیڈروموں کے دروازے کھلتے تھے، سب کو سنانے کے لیے پوری طاقت سے چلا کر کہہ رہا تھا، "تم نے مل کر جو مجھ پر ظلم کی ٹھانی ہے ایک دن تم کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔" ہال کمرے کی گونج نے دہرایا، "تم کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔" یہ گونج سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ کیا یہ میری ہی آواز تھی یا جواب میں پورا گھر مجھ سے مخاطب تھا؟ میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے امید تھی کہ کوئی مجھے منانے کے لیے آئے گا۔ آج تک کوئی نہیں آیا۔ اب یہ عالم ہے کہ کسی کا بھی آنا نہ آنا برابر ہے۔

ایک مہینے کے اندر اندر انھوں نے کاغذوں میں اجلاس کی طلبی اور میٹنگوں کا انعقاد دکھا کر

مجھے انتظامی سربراہیوں سے الگ کر کے راشد اور دوسرے بیٹے اختر کو کمپنیوں کی ہاگ ڈور تھما دی۔ حصص جو میرے پاس رہ گئے تھے انھیں بیچ بیچ کر مقدمات پر لگاتا رہا۔ دو سال تک تو میں مقابلے کی تاب لاسکا، پھر سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کر لاہور منتقل ہو گیا۔ مجھے شکست تسلیم کرتے ہی بنی۔ میری آمدنی صوفیہ کی ملکیتی دل کی آمدن تک محدود ہو کر رہ گئی۔ معیارِ زندگی بہر طور بحال رہا۔ رہائش کے لیے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی۔ میرے اعصاب اور ذہن عرصے سے بس میں نہ رہے تھے۔ آگے بڑھنے کی لگن اور ذہنی پرچ جاتی رہی تھیں۔ ایک دن خودرحمی کے عالم میں صوفیہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہنے لگا، "میں نے اولاد کو کیا کچھ نہیں دیا اور انھوں نے بدلے میں سب کچھ چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا۔"

"چلو چھوڑو اس قصے کو۔ تمھارے پاس کیا نہیں؟ گھر ہے، برنس ہے۔ کیوں فکر کرتے ہو؟"

"میں نے ان کی خاطر پانچ سال پہلے نس بندی کرالی تاکہ..." فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ غلط جگہ پر غلط بات کہہ گیا ہوں، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ سنتے ہی صوفیہ پلنگ سے شعلے کی طرح بھڑک کر اٹھی۔ پہلے اس کا رنگ انار کے دانے کی طرح سرخ ہوا اور پھر پیلا زرد ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر قالین پر بیٹھ گئی۔ میں نے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ کہیں دور سے آتی نحیف آواز میں صرف اتنا کہہ سکی، "مجھے ہاتھ نہ لگانا۔" کچھ دیر بعد اٹھی اور کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں اور اماں کھٹکھٹاتے رہے۔ اس نے ایک بار اتنا کہا، "میرا موڈ ٹھیک ہو گا تو میں خود ہی آجاؤں گی۔ مجھے بیزار نہ کریں۔" دوسری صبح وہ نہائی دھوئی کمرے سے نکلی۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ مجھ سے کہا، "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ الگ۔" ہم اسٹڈی میں چلے گئے۔ اس نے چٹخنی لگا دی۔ وہ لیے دیے رہنے والی سنجیدہ مزاج عورت تھی لیکن جس طرح سنجیدگی اب اس پر امڈ کے چھائی تھی اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ گھبرایا ہوا تو پہلے ہی تھا۔ میں نے اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی ہتھیار پھینک دیے۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے دھوکا کیا۔ تم بس مجھے معاف کر دو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"نہیں دھوکا صرف تم نے مجھے نہیں دیا، پہلے میں نے تمھیں دیا۔ مجھے تم سے کوئی محبت نہ تھی لیکن تمھیں شادی پر مائل کیا اور کر لی۔ میرا مسئلہ تحفظ کا تھا اور اب بھی ہے، لیکن سمجھ میں

یہی آتا ہے کہ تم اس کی ضمانت نہیں ہو۔"

"دیکھو یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔ اس میں محبت کہاں ہوتی ہے؟ اگر پہلے کہیں کچھ ہوتی بھی ہے تو بعد میں کہاں رہ جاتی ہے۔ ایک کاروباری اشتراک سا رہ جاتا ہے۔ لوگ نبھاتے رہتے ہیں، عادتاً، زمانے کے ڈر سے، اکلاپے کے خوف سے، انجانے کے سہم سے، کسی مناسب موقعے کے انتظار میں۔ پھر مایوس ہوتے ہوتے صبر کر لیتے ہیں۔ اتنے میں موت سر پر آ جاتی ہے۔ مجھ سے سیکھو۔ میں نے دو بار شادی کی۔ پہلی بار رشتہ مانگ کر، دوسری مرتبہ محبت کر کے۔ دونوں دفعہ نتیجہ ایک ہی رہا۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ سو شادیاں کر لو، صورت یہی رہے گی۔ ذرا سوچو، دو زندہ انسان جن کی جینز کی اپنی اپنی وراثت، اپنا اپنا ماضی اور ان سے مل کر بنی اپنی اپنی نفسیات ہے، وہ کیوں کر ایک دوسرے میں ضم ہو کر یک جاں ہو سکتے ہیں کہ ان کی الگ الگ شناخت ہی مٹ جائے۔ یہ رشتہ تو اسی طرح مصلحتوں اور مصالحتوں سے ہی چلتا ہے۔ میرا گناہ سخت ہے۔ مگر معاف کر دو اور مصالحت کر لو۔"

"شادیاں میں نے بھی دو کیں۔ پہلی کا ابھی نشہ نہ اترا تھا کہ اس نے دھتکار دیا۔ دوسرے کو میں خود دھتکار رہی ہوں۔ جس تیزی سے وقت میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے اور موت کا لمحہ قریب آ رہا ہے، اس کے خوف سے میں حواس باختہ ہو رہی ہوں۔ ساری عمر زندگی کی تیاریوں میں صرف ہو گئی اور زندہ رہنے کا ایک لمحہ ابھی تک میسر نہیں آیا۔"

وہ کبھی نہیں آئے گا۔ ان تیاریوں کا ہی نام زندگی ہے۔ اسے الگ الگ عہدوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ جان لو کہ ہم تم زندہ ہیں۔ جس لمحہ کی تلاش میں ہو وہ یہی ہے اور ہم ساتھ ہی آنے والے لمحے کی تیاریوں میں بھی مصروف ہیں۔ بس اتنی ہی زندگی ہے۔ اسی کا نام زندگی ہوتا ہے۔ اس کے آگے اور پیچھے اندھیرا ہے۔ نہ نکلنا کسی سراب کی تلاش میں۔ بہت پچھتاؤ گی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ بہت تھک گئی ہوں۔ لڑتے لڑتے دھوکوں سے۔ اپنے، دوسروں کے وقت کے، حالات کے دیے ہوئے دھوکوں سے۔ میں تیس سال کی ہو چکی ہوں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ آئندہ پانچ سات سال میں میری سب صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی۔ ابھی وقت ہے۔ مجھے ہر قیمت پر اپنے محبوب سے ملنا ہے۔ خدا کے لیے آزاد کر دو۔ مجھے جہاں زیب کے ساتھ رہنا ہے۔ اپنی مل واپس لے لو۔"

"نہ کرنا تیسرا نکاح۔ دھوکا ہے، فریب ہے۔ کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے مایوسی کے۔
"جہاں اتنے دھوکے کھائے ہیں وہاں ایک اپنے دل کے کہے سے بھی کھا لینے دو۔ تم مجھے طلاق دے دو۔"

میں یہ سن کر چپ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر بہت بڑا خلا ہے اور اس کی گہری خاموشی میرے کانوں میں سائیں سائیں کر رہی ہے۔ میں گردن جھکائے بہت دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا، مگر کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ ایک خیال رہ رہ کے ذہن میں گھوم جاتا کہ میں ایک ایسا کبوتر ہوں جس کے پاؤں کچی مٹی کے ہیں۔ اگر میں کچی مٹی کا بنا کبوتر ہوتا جس کے پاؤں زندہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں اپنے آپ سے نکل کر کہیں چلا جاتا۔ میرے سامنے وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر پوچھا:

"وہی فوجی کپتان؟"

"ہاں۔"

"دیکھو، میں اپنی نس کھلوا لیتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہارے فریب کا میرے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ویسے بھی تمہیں کہنے والی تھی کہ مجھے آزاد کر دو۔"

مجھے تبھی پتا چلا جب میں مٹھیاں بھینچے کمرے کے درمیان میں کھڑا چیخ رہا تھا، "میں مر جاؤں گا تو تم آزاد ہو گی۔ میں مر سکتا ہوں طلاق نہیں دے سکتا۔ نہیں دوں گا طلاق۔"

وہ چلائی، "میں جا رہی ہوں جہاں زیب کے پاس۔ روک سکتے ہو تو روک لو۔" وہ چشمی کھول کر آندھی کی طرح اڑتی اپنے بیڈروم میں گھس گئی۔ میں نے اماں کو بتایا، "وہ جا رہی ہے ہمیں چھوڑ کر۔ اسے روک لو۔"

اس دن تو وہ رک گئی لیکن... اس واقعے کو ایک ہفتہ نہ گزرا ہوگا، میں دفتر میں تھا اور اماں اپنے کمرے میں سو رہی تھیں، کہ وہ خاموشی سے فرار ہو گئی۔ یہ اماں کے لیے اپنے خون کی عظمت اور خاندانی فضیلت کے حوالے سے بہت بڑا چیلنج تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے صوفیہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں کہ "وہ جہاں بھی ہو گی، زمین کی پاتال میں یا آسمان کی بلندیوں پر، میں اسے زندہ یا مُردہ اس گھر میں لا کر رہوں گی۔ ساری بیٹی ہو اور خاوند کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یہ نہیں ہونے دوں

گی۔' واقعی دس دن بعد اماں ایک خاموش بہ ظاہر مغرور، غیر متاسف، لیکن اندر سے افسردہ اور ٹوٹی ہوئی صوفیہ کو لے کر آن موجود ہوئیں۔ میں نے ایک بار نظر بھر کر اسے دیکھا اور اسٹڈی میں چلا گیا۔ اس نے نہ تو مجھ سے نظر ملائی نہ کوئی اہمیت دی۔ ماں گھر آتے ہی بستر پر پڑ گئیں اور چند دنوں بعد فوت ہو گئیں۔

میں پورے دس دن گھر میں بند رہا۔ دفتر والوں کو بیماری کا عذر کر دیا اور چپ کا روزہ رکھ لیا۔ مجھے یاد نہیں ان دنوں میں کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو جس کا تعلق صوفیہ سے نہ ہو۔ ڈریسنگ ٹیبل پر بکھرا میک اپ کا سامان، الماریوں میں لٹکے اس کے کپڑے، گاڑی کا دروازہ بند ہونے یا انجن کے اسٹارٹ اور بند ہونے کی آوازیں... وہ کہیں جا رہی ہے یا واپس آئی ہے؟ ابھی اس کی آواز گونجے گی، بلکہ گونجتی سنائی دیتی۔ نوکروں کی آوازیں اس کے جواب میں ابھرتی معلوم ہوتیں۔ وہ وہاں نہیں تھی، لیکن لگتا کہ کہیں گئی بھی نہیں ہے۔ یہیں کہیں ہے۔ تصور میں اس کی اماں سے ہوتی ہوئی باتیں سنتا۔ میری دانستہ غلطیاں اور نادانستہ کمزوریاں ـــــ جیسے بڑھاپا ـــــ زیر بحث ہوں گی۔ اس کی یاد میں ڈرنا تک بھول گیا۔ اس کی یاد کے یک ایک لمحے میں میری اپنی ذات معمول سے کہیں زیادہ نمایاں ہو کر، ابھر کر میرے سامنے رہتی۔ اس کی یاد گویا آئینہ تھا میرے لیے، اپنی ذات کا نظارہ کرنے کے واسطے۔ کیا پرستش کے وقت دونوں ذاتیں اسی طرح زندہ، موجود اور آمنے سامنے ہوتی ہیں؟ نیند میں بھی میں اس کو نہ بھول سکتا تھا۔ ہر خواب اسی کا خواب ہوتا۔ ایک خواب تو ایسا تھا جو معمولی فرق سے مجھے ہر روز نظر آیا کیا۔

ایک بہت چوڑا سوکھا ہوا دریا ہے۔ دریا کے پیٹ میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ریت ہی ریت پھیلی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور ریت اڑاتے چھوٹے چھوٹے بگولے ہر طرف اڑتے پھر رہے ہیں۔ دوسرا کنارہ بہت دور ہے اور مٹی کے اونچے نیچے ٹیلوں کا ایک ٹیڑھا میڑھا، کٹا پھٹا سا، دونوں طرف دور تک جاتا لمبا سلسلہ ہے۔ وہ میرے سامنے ایک اونچی دیوار کی طرح ڈٹا کھڑا ہے۔ لگتا ہے کہ دریا کے اندر سے چڑھتے ہوئے اسے عبور کرنے کی کوشش بے سود ہو گی۔ ٹیلوں پر موٹے تنوں کے دو سوکھے ٹنڈ منڈ درخت دور دور کھڑے ہیں۔ دونوں کناروں پر کسی زندہ چیز، سبز درخت یا گھاس کی پتی کا نام و نشان نہیں۔ اس اجاڑ ڈھنڈار ماحول میں اتنی

افسردگی اور مایوسی ہے کہ دل ڈوبنے لگتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ کون سا دریا ہے۔ اطلاع ملتی ہے کہ راوی ہے، لاہور کے قریب۔ یقین نہیں آتا لیکن مانے بغیر چارہ بھی نہیں۔ سوچا راوی اب ایسا ہی ہو گیا ہو گا۔ چیزوں کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ میں دریا کی ریت میں کہیں دور دور سے چلتا کسی چیز کو تلاش کرتا آ رہا ہوں۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کیا چیز ہے جسے تلاش کر رہا ہوں۔ میں تھکان سے اتنا نڈھال ہوں کہ ایک ایک قدم اٹھانا مشکل نظر آتا ہے۔ کنارے پر دریا کی طرف منہ کیے ایک مفلوک الحال شخص گم سم بیٹھا ہے اور دونوں ٹانگیں سینے سے لگا رکھی ہیں۔ جانتا کہ کوئی درویش ہو گا۔ میں بھی اس کے پاس اسی کی طرح زمین پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہم دونوں کے سامنے ایک چھوٹی نہر جتنی چوڑی پانی کی رو دھیرے دھیرے چلی جا رہی ہے۔ کنارے سے بندھی ایک چھوٹی سی کشتی پانی کے اوپر ہچکولے کھا رہی ہے۔ پانی کے یوں غیب سے ظاہر ہونے پر مجھے کوئی خاص تعجب نہیں ہوتا۔ اسے ایک معمول کی چیز گردانتا ہوں۔ ذہن میں کہیں یہ خیال بھی پل رہا ہے کہ پانی ضرور درویش کی برکت سے ظاہر ہوا ہے۔ اس کے بعد ماحول پر برستی افسردگی قدرت چھٹ جاتی ہے۔ درویش سے پوچھتا ہوں کہ تم نے یہاں کوئی لڑکی تو نہیں دیکھی۔ پھر خود ہی حیرت زدہ ہو جاتا ہوں کہ یہ سوال کہاں سے اُمڈ کر میرے ہونٹوں پر آ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں کسی لڑکی کے بارے میں متردد ہوں۔ کیوں اور کیسے پوچھ لیا یہ سوال؟ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں کہ کس لڑکی کے بارے میں اس سے سوال کیا ہے۔ اپنے آپ میں ڈر رہا ہوں کہ اگر اس نے پلٹ کر پوچھ لیا کہ اس کا نام کیا ہے اور حلیہ کیسا ہے تو کیا بتاؤں گا۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ ایک لڑکی ہے جسے میں بخوبی جانتا ہوں اور کوئی اسے زبردستی اغوا کرنا چاہتا ہے۔ میں اسی کو تلاش کرتا بہت دور سے یہاں پہنچا ہوں لیکن کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کون ہے، اس کا نام کیا ہے، اس کی صورت کیسی ہے اور میر اس سے کیا تعلق ہے۔ ایک مبہم سا خیال گزرتا ہے کہ میں اسے محض انسانی ہمدردی میں کھوجتا پھر رہا ہوں۔ درویش جواب دیتے ہوئے انگلی سے اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے، وہ دیکھ لڑکی کو زبردستی لیے جا رہے ہیں۔ دریا کے کنارے ایک جیپ پتھروں پر اچھلتی دوڑتی جا رہی ہے۔ جیپ کے چاروں طرف کہنوس کے پردے اڑ رہے ہیں۔ جیپ ٹھسا ٹھس بھری ہے۔ لڑکی کو بچانا تو ضرور ہے لیکن وہ لوگ جیپ پر ہیں اور میں پیدل ہوں۔ دریا پہلے خشک تھا، اب اس میں پانی بھی ہے۔ کہیں شاید عبور کرنا پڑے۔ اس کی گہرائی بھی ۔

جانے کیا ہے۔ دریا میں جہاں پہلے ریت تھی اب وہاں بھورے بھورے بے شمار پتھر پڑے ہیں۔ ان پر کیسے تیز چلا جا سکے گا؟ نہیں وسوسوں میں الجھا کھڑا ہوں کہ پتا نہیں کس طرح جیپ میرے قریب سے گزرتی ہے۔ اب میں جانتا ہوں کہ وہ صوفیہ کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب دیکھتا ہوں کہ جیپ کو رشید کا کل چلا رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن ہے کہ اسے میری وہاں موجودگی کا کچھ پتا نہیں چلتا یہ کیوں صوفیہ کو اغوا کر رہا ہے؟ اسے کیا ضرورت ہے صوفیہ کو اغوا کرنے کی؟ لڑکی کینوس بٹا کر دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر صوفیہ جیسی کوئی پریشانی نہیں اور نہ ہی مجھے پہچاننے کے آثار ہیں۔ اس کو تو مجھے دیکھ کر خوش ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوئی۔ حیرت و استعجاب کا ایک اور ریلا دل پر امڈتا ہے۔ لڑکی کا چہرہ ماہ جبیں کا ہے لیکن آنکھوں کی تیزی اور بدن کا پھرتیلا پن بتاتا ہے کہ صوفیہ ہے۔ صوفیہ کی صورت اتنی بدل گئی کہ بالکل ماہ جبیں لگ رہی ہے۔ اتنے میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ پہلا خیال یہ آتا ہے کہ وہ درویش بھی دراصل میں ہی تھا۔

آج اس خرابے میں بیٹھا جب اس خواب کو یاد کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ وہ آنے والے حالات کی پیش بینی تھا۔ وہ اطمینان جو اب آ کے اس درویشی کے عالم میں نصیب ہوا ہے، یہ وہی پانی کی رو ہے جو لاہور کے قریب اس ڈھنڈار راوی میں دفعتاً کہیں سے نمودار ہو گئی تھی۔

ہم دونوں اماں کی تیمارداری میں ایسے منہمک اور ان کی بگڑتی ہوئی حالت پر اتنے فکرمند تھے کہ آپس کی جھک جھک کی کنجِ آتش تو کجا کسی اور موضوع پر منہ کھولنے کا یارا نہ تھا۔ ہم ان کی بیماری اور ڈاکٹروں کی رائے کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے بعض اوقات رو پڑتے اور ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے۔ شادی کے بعد یہ پہلا مشن تھا جس سے ہم دونوں کا تعلق برابر کا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دونوں بے غرض دل سے اماں کی صحت یابی کے خواہاں تھے۔ اسے اماں سے بے حد محبت تھی ـــــ اس کی ماں تھی اور روایتی لحاظ سے صوفیہ کا اس دنیا میں آخری سہارا تھی۔ میرے لیے اماں وہ تو تا تھی جس میں میری جان تھی۔

اماں کی موت کے بعد چند دنوں تک شدتِ غم کی وجہ سے یہی صورتِ حال برقرار رہی، اس کے بعد بدلتے بدلتے اپنی معمول کی ڈگر پر آ گئی۔ اکٹھے کوئی آفت بھوگنے کے بعد جو اپنائیت اور

ایک دوسرے سے ہمدردی پیدا ہو جایا کرتی ہے، وہ موجود حالات صوفیہ کے اندر پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی کیوں کہ لڑنے کے لیے دو جنے ہونے چاہییں۔ اکیلا تو کوئی لڑ نہیں سکتا۔ میرا اس سے ایک ہی سوال رہ گیا تھا کہ تم جو چاہو کرو مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں نے اسے آخری پیش کش کے طور پر کہا کہ "دیکھو! میں نے بھی زندگی میں ایک بار محبت کی ہے اور اس کے دکھ کو جانتا ہوں۔ تم جہاں زیب سے ملتی رہو لیکن میرے دکھ کو بھی پہچانو، مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔" اس نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اماں کے چالیسویں کے دوسرے دن اس نے ٹیکسی منگوائی اور میرے سامنے اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اس کا راستا نہ روکا۔ چپ چاپ بیٹھا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ مہینا بھر بعد تنسیخ نکاح کے عدالتی سمن آ گئے۔ میں انھیں وصول کر کے رشید کاکل کو اس کے دفتر میں دے آیا۔ میرے لیے باہر کی دنیا میں کچھ کرنے کا رہ نہ گیا تھا۔ مجھے اب جو بھی کرنا تھا اپنے اندر کرنا تھا۔

۴

جب اعتراضات اتنے بڑھے کہ زلیخا کی برداشت سے باہر ہو گئے تو اسے یوسف کا نقاب اُلٹواتے ہی بنی۔ سبھی بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے والیاں ایسی کھوئی گئیں کہ کسی ایک کو بھی ہوش نہ رہا کہ چھری اپنے ہی ہاتھ پر چل رہی ہے کہ ہاتھ میں پکڑے سیب پر۔ میں خود شاہد کے حسن کے سحر میں برسوں پھنسا رہا۔ لمبے عرصے تک ایک عجیب طرح کی احمقانہ خواہش رہ رہ کر مجھ پر چھا جاتی کہ کسی طرح میں شاہد احمد بن جاؤں۔ کبھی کبھی تو اس کا دورہ اتنا شدید ہوتا کہ میں بالکل بے بس ہو کر تنہائی میں رونے پر مجبور ہو جاتا۔ ایسے حسن کے سامنے ماہ جبیں، عورت ذات، بھلا کس کھیت کی مولی تھی کہ اس کی چاہت سے اپنے آپ کو روک سکتی۔

شاہد کا حُسن، میری ذہانت اور ماہ جبیں کی وفا، گویا ہماری زندگیوں کے اپنے اپنے محور تھے جن کے اردگرد ہم سیاروں کی طرح گھومتے اور ایک دوسرے کی کشش سے اپنے اپنے مدار پر قائم رہتے۔ اس دنیا میں سو فیصد خالص تو کچھ ہوتا نہیں۔ اگر کھرا سونا ہو بھی تو جب کسی شکل میں

ڈھالنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گا۔ کچھ کھوٹ ہو تو دم رہتا ہے۔

ہم تینوں کی خوبیاں بہت کچھ کھری تھیں لیکن تھوڑا تھوڑا ان میں کھوٹ بھی تھا، تبھی تو اتنی دیر نکال گئیں۔ شاہد کی خوبی کچھ زیادہ ہی کچی نکلی، شاید اس لیے کہ زیادہ کھری تھی اور بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے خود ہی اپنے آپ کو کھا گئی۔ باقی شاہد کی فریب کاریوں کا ڈھیر اس کے سامنے بچا پڑا رہ گیا۔ حسن کا پول کھل جانے پر قدرتی نتائج غیر متوقع طور پر اس پر آن وارد ہوئے جیسے کوئی اندھیرے میں گاڑھی ریورس کرتے ہوئے، دن میں دیکھے مگر بھولے ہوئے گڑھے میں جا گرے۔ آخر آخر میں شاہد بھی گرنے والے کی طرح اپنے آپ کو احمق محسوس کر رہا تھا۔

ماہ جبیں جانتی تھی کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے شاہد احمد کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں عمر بھر چپ رہا جیسے کچھ نہیں جانتا۔ وہ چپ رہی کیوں کہ اسے تو چپ رہنا ہی تھا۔ شاہد احمد نے ماہ جبیں سے سابقہ تعلق کی بنا پر ہماری زندگی میں کبھی کسی طرح سے دخل اندازی کی کوشش نہ کی۔ وہ عمر بھر ہمارے گھر نہیں آیا (سوائے ایک مرتبہ کے، وہ بھی آج سے دو ڈھائی سال پہلے جب ایک چھٹی کے دن اسے فوری قانونی مشورے کے لیے میرے گھر آنا پڑا)۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی سوچے سمجھے پروگرام کے تحت تھا یا تمام واقعہ اس کے نزدیک اس قدر غیر اہم اور معمولی نوعیت کا تھا کہ اس کی مزید توجہ کا اہل نہ تھا۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ اس کے نزدیک ماہ جبیں کی حیثیت شروع میں ایک لونڈی کی تھی اور بعد میں وہ شاید اس کے نزدیک مستعمل لونڈی کی طرح بے معنی اور بے کار چیز ہو چکی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ میرے گھریلو سکون کے لیے اچھا ثابت ہوا۔ ماہ جبیں نے عمر بھر مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ وہ جیسے مزاج کی، کم گو، گھریلو، مرنجان مرنج عورت ہے۔ سست بہت ہے۔ چلتی ہے، کھاتی ہے، کوئی کام کرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سلوموشن فلم دیکھ رہے ہوں۔ کبھی لمبے چوڑے مالی مطالبات نہیں کیے اور نہ ہی کسی خاص قسم کی سماجی زندگی اختیار کرنے کا تقاضا کیا۔ قدرت نے اسے نہایت مطمئن دل سے نوازا ہے۔ وہ گھنٹوں چپ بیٹھی رہ سکتی ہے۔ نوکروں سے کبھی سختی نہیں کرتی۔ اپنے بچوں سے تو گویا اسے عشق ہے۔ تینوں تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے ہیں۔ دو کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر ان کے لیے لمبی لمبی دعائیں مانگتی رہتی ہے۔

مجھے ادھر اُدھر سے پتا چلا کہ شاہد احمد تیس پینتیس برس بعد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ایک بار پھر لاہور میں آ کر آباد ہو گیا ہے اور بیوی کو حق مہر میں منتقل کی ہوئی مل چلا رہا ہے۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس نے لاہور آ کر مجھے اطلاع نہ دی۔ جب کراچی میں وہ پہلی بیوی اور بچوں کے خلاف مقدمات لڑ رہا تھا تو میں اس کے بلانے پر تین چار مرتبہ کراچی جا کر، بغیر فیس لیے، سندھ ہائی کورٹ میں پیش ہوا اور بحث کی۔ یہ الگ بات کہ اس کے موقف میں کوئی جان نہ تھی اور وہ مقدمات ہار گیا۔ میں کڑھ کڑھا کر جلد اس کی یہ بداخلاقی اس کی بدعادت پر محمول کرتے ہوئے بھول بھال گیا۔ میں اس کی بے توجہی جھیلنے کا پرانا عادی تھا لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ جہاں میں اس کے پیٹھ پیچھے غصے سے اُبلتا پھرتا وہاں جب وہ سامنے آتا تو سارا غصہ فرو ہو جاتا اور جس امداد یا مروّت کا وہ خواستگار ہوتا میں بلاحیل و حجت مقدور بھر اس کی خدمت پر تیار ہو جاتا۔ اسے لاہور آئے دو سال ہوئے ہوں گے کہ ایک چھٹی کے دن میں اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اور ماہ جبیں پاس بیٹھی کچھ بُن رہی تھی کہ شاہد احمد کار میں سوار پورچ میں اترا۔ میں موکلوں سے کبھی گھر پر نہیں ملتا۔ خیر وہ صرف موکل بھی نہیں تھا۔ ماہ جبیں اجنبی کو آتے دیکھ کر اٹھ کر اندر چل دی۔ اس کے پاس سے گزری تو اس نے سلام علیکم کہا اور میرے پاس آ گیا۔ اس کی پھٹی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت خوف زدہ اور گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا، "کیوں، خیریت تو ہے؟"

"نہیں۔ خیریت نہیں۔"

"ہوا کیا؟ کراچی میں جب تم مقدمات میں گھرے ہوئے تھے تب بھی میں نے تمھیں اتنا پریشان نہیں دیکھا۔"

"میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا رہی ہے۔ صوفیہ نے مل کے قبضے اور طمیدِ حساب کے اور تنسیخِ نکاح کے الگ الگ دعوے دائر کر دیے ہیں۔"

"صوفیہ ہے کہاں؟"

"پتا نہیں۔ دو مہینے ہوئے کہ وہ کچھ بتائے بغیر گھر سے غائب ہو گئی۔"

"اسی وقت کچھ کرتے۔ مجھے بتایا تو ہوتا۔"

"کیا بتاتا؟ منہ چھپائے گھر میں پڑا رہا۔ جس کی خاطر میں نے ساری دنیا چھوڑ دی اس نے

Scanned with CamScanner

مجھے چھوڑ دیا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کاکل صاحب یہ مل بھی نکل گئی تو میں تو پیسے پیسے کو محتاج ہو جاؤں گا۔ جینا تو مشکل ہو گا ہی، مرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ بے عزتی اور بے توقیری کی موت کیسے مر سکوں گا۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا اور دوسرے دن دفتر آنے کے لیے کہا تاکہ سوچیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کسی طرح صوفیہ سے ملیں یا پھر جواب دعویٰ تیار کریں۔ وہ کرسی سے اٹھا اور منہ سے اور کوئی لفظ کہے بغیر اپنی دُھن میں چل پڑا۔ میں بھونچکا سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ سبز سبز چمکتے تازہ گھاس کے قطعے پر ایک ٹوٹا پھوٹا بوڑھا آدمی، کندھے جھکائے، پریشانیوں میں ڈوبا، آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا آئینے میں گھنٹوں تک ایک خود فریفتگی کے عالم میں اپنا عکس دیکھنے کی سکت اس میں اب بھی باقی ہو گی کہ نہیں۔ شاید نہیں۔

اس کے جانے کے بعد میں اندر گیا تو ماہ جبیں پوچھنے لگی، "یہ کون شخص تھا۔ پہلے کہیں دیکھا ہوا لگتا ہے۔"

"شاہد احمد تھا۔"

"کون شاہد احمد؟"

تمہارا خالہ زاد۔ خان بہادر صاحب کا بیٹا۔"

پہلے تو وہ منہ کھولے مجھے دیکھتی رہ گئی، اور پھر کہا، "نہیں۔" میں نے قدرے چیختے ہوئے کہا، "ہاں۔ ہاں۔ وہی تھا۔ 'تارہ صدے کے جھمیلے میں پھنسے اس کے ذہن نے پتا نہیں کچھ سنا یا نہیں، لیکن آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ لیکن مجھے یوں چیخنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا اور اپنے اندر تحمل پیدا کرتے ہوئے کہا، 'ماہ جبیں، عمر کے اس حصے میں ان اپنوں کی متواتر بے وفائی جھیلنا، جن کی وفا پر کبھی پکا یقین رہا ہو، مشکل ہوتا ہے۔' پھر میں نے سوچا، یہاں لفظ متواتر استعمال کرنے کا کیا مقام تھا؟ میں غالباً شاہد کے لیے اس کے رونے اور شدید صدمہ زدہ ہونے کو اپنے حق میں ایک طرح کی بے وفائی خیال کر رہا تھا اور اس کی اس پہلی بے وفائی کو صوفیہ اور زرینہ اور اس کی اولاد کی شاہد کے خلاف مسلسل بغاوت سے الگ کرنے کے لیے لفظ متواتر استعمال کر رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کا غم اور احساسِ کم مائیگی دفعتاً کہیں سے آ کر مجھ پر چھا گیا۔ پینتیس سال تک ماضی کے جس منحوس سائے کو اپنی

گھریلو زندگی پر پڑنے سے روکے رہا تھا اسے آج شاہد اپنے ساتھ لا کر ایک بجلیوں بھرے سیاہ بادل کی طرح میرے گھر پر تان گیا۔ میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے اپنی اسٹڈی کی طرف چلا گیا کہ وہ شخص جس نے اس عورت کے ساتھ اتنا بڑا فریب کیا اور اس کی عزتِ نفس کو پامال کیا، وہ اتنے برسوں بعد بھی اس کی تکلیف پر بے کل ہو اٹھی ہے۔ کیوں؟

میں اسٹڈی میں کتاب سامنے رکھے گم سم بیٹھا پہلے فقرے ہی کو بار بار پڑھے جا رہا تھا کہ ماہ جبیں آہستگی سے دروازہ کھول کر کسی وقت دبے پاؤں آئی اور جب میں نے دیکھا تو کونے میں کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے متوجہ پا کر کہنے لگی، "شادی کے بعد سے آپ ہی میری زندگی کا مرکز ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کے لیے میرا آنسوؤں کا کوئی اور مطلب نہ نکالیں۔ یہ تو اس حالت پر ہے ہیں جو وقت نے ہم سب کی بنا دی ہے۔ آج شاہد احمد کو دیکھا تو اس بات کا احساس یکبارگی اس شدت سے ہوا کہ آنسو نکل پڑے۔"

میں کچھ دیر چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر تسلی دیتے ہوئے بولا، "ماہ جبیں، تم دل میلا نہ کرو۔ میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ وقت تو ریت کی رسی ہے، اسے کون پکڑ سکا ہے۔ ہم کبھی کبھی اس کے لیے صرف اداس ہو سکتے ہیں۔"

ماہ جبیں اب پوری طرح سنبھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اس کے جذباتی ہیجان کی قدرتی عمر ہی اتنی تھی یا اس نے حالات کے جبر کے پیشِ نظر سنبھل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اگر ایسا بھی تھا تو کوئی انسان دوسرے کی خاطر، یا اپنی خاطر، یا دونوں کی ازدواجی زندگی کی خاطر، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے؟ مجھے اب دل سے حسد نکال دینا چاہیے۔

ماہ جبیں نے پوچھا، "یہ کدھر آئے تھے؟"

"ان کی دوسری بیوی صوفیہ نے تنسیخِ نکاح اور ان کی آخری بچی ہوئی مل کے قبضے کے لیے دعوے کر دیے ہیں، جو کہ دراصل حقِ مہر میں پہلے ہی اسے کاغذات میں منتقل کی جا چکی تھی۔ اور لگتا ہے کہ وہ دونوں چیزیں لے مرے گی۔ وہ بہت پریشان تھا۔" میں یہ بتاتے ہوئے ماہ جبیں کے چہرے کو ممکنہ ردِ عمل جاننے کے لیے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک شاہد کے لیے گر کسی آنکھ کو نم ہونا ہی تھا تو یہ مقام تھا نم ہونے کے لیے، نہ یہ کہ اس کے حسن و جوانی کے ڈھل جانے پر ماتم کیا جاتا جو کہ ایک فطری عمل ہے۔ وہ میری بات اس دل چسپی سے سن رہی تھی جیسے

میں الف لیلہ کے کسی کردار پر گزرنے والی مصیبتوں کا حال اسے سنا رہا ہوں۔ میں بات سنا چکا تو اس کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ ایک بار جھلکتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے اطمینان سے کرسی کی پشت سے کمر لگا کر بیٹھتے ہوئے نوکر کو آواز دے کر سلائیاں اور اون اٹھا لانے کو کہا، اور مجھ سے بولی، "واقعی یہ تو بہت برا ہوا۔ شاہد احمد بڑھاپے میں خراب ہوئے۔ اصل میں زیادہ چالاکی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"ہاں، اب کچھ بھی کہہ لو۔ ویسے وہ آدمی آسانی سے مار کھانے والا نہیں تھا، لیکن بڑھاپے کی محبت نے اسے برباد کر دیا۔"

محبت کا نام سن کر اس نے نادانستہ طور پر ذرا سی ناک چڑھائی جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ ہوس پرست محبت کو کیا جانے۔ میں نے بات جاری رکھی اور ہنستے ہوئے کہا، "کسی بوڑھے کو اس عارضے سے کبھی جاں بر ہوتے دیکھا نہیں۔ پتا نہیں کیوں اس دلدل میں جو ایک بار پھنستے ہیں تو پھر دھنستے ہی چلے جاتے ہیں۔" اس پر وہ بھی ٹھٹھا مار کر ہنسی۔

وقت کے زیادہ سودمند استعمال کی خاطر میں نے ایک عرصے سے نچلی عدالتوں میں پیش ہونا چھوڑ دیا تھا لیکن شاہد کے لیے چوں کہ دونوں مقدمات زندگی اور موت کا مسئلہ تھے اور وہ مقدمات کی مخدوش صورتِ حال سے بہت دہشت زدہ تھا اس لیے اہم پیشیوں پر میں نے خود پیش ہونے کا فیصلہ کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار صوفیہ کو کمرۂ عدالت میں دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گیا۔ جو کچھ اس کے بارے میں اِدھر اُدھر سے سن رکھا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر خوب صورت تھی، اور جوانی تھی کہ انگ انگ سے اُبلی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہوش مندی اور چہرے سے خود اعتمادی ٹپکتی تھی۔ وہ اپنے آپ پر نازاں تھی تو مناسب طور پر نازاں تھی (البتہ معصومیت یا سادگی کا اس کی شخصیت سے کوئی واسطہ نہ تھا)۔ شاہد احمد اگر مارا گیا تو ٹھیک مارا گیا۔ آج میرے پیچھے کھڑا مظلوم صورت شاہد احمد خود بھی اپنی انھیں خوبیوں کے زور پر کبھی اسی طرح طرارے بھرا کرتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ شاید ڈورین گرے کی مثال سے فریب کھا گیا۔ ڈورین گرے کے حسن و جوانی کی ڈھال تو تہہ خانے میں چھپا کر رکھی اس کی اپنی تصویر تھی جو گزرتے وقت اور اس کی بداعمالیوں کی چھاپ اپنے اوپر لیتی ہوئی بدشکل اور بوڑھی ہوتی جاتی تھی۔ یہاں بوڑھا بدشکل شاہد احمد اپنے مال و دولت کو اپنی ڈھل جانے والی خوبیوں اور بداعمالیوں کا بدل بنا کر سامنے لایا،

جو صوفیہ ایک ہی داؤ میں جیت کر لے گئی۔ شاید جب اپنے عروج پر تھا اگر اُس زمانے میں صوفیہ سے اس کی ملاقات ہوئی ہوتی تو نتیجہ غالباً موجودہ صورتِ حال کے بالکل برعکس ہوتا۔

کمرۂ عدالت سے باہر نکلے تو صوفیہ کا دوست، میزبان، اور یقیناً طلاق کے بعد اس سے شادی کا طلبگار، میجر جہاں زیب کھڑا تھا۔ میں نے شاہد کے اصرار پر صوفیہ سے کہا، "بیگم صاحبہ، میں شاہد احمد کا صرف وکیل نہیں بلکہ چالیس سال پرانا دوست بھی ہوں، اور میں صرف ایک منٹ کے لیے آپ سے الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے خوش دلی سے کہا، "ہاں ہاں۔ میں آپ سے کبھی ملی نہیں لیکن میں آپ کو جانتی ہوں، غائبانہ طور پر۔ آپ شاہد احمد کی طرف سے کراچی کی عدالتوں میں پیش ہونے کے لیے بھی آتے رہے ہیں۔ فرمائیے۔"

میں نے کہا، "آپ کی ناراضگی کے اسباب چاہے کچھ بھی ہوں، آپ اسے معاف کر دیں۔ یہ اس کی زندگی کا سوال ہے۔ اس نے کبھی آپ سے بُرا سلوک بھی کیا ہوگا۔ کبھی آڑے وقت میں کام آیا ہوگا۔ کبھی آپ نے بھی اسے چاہا ہوگا، تبھی تو شادی کی۔ وہ اب بھی آپ کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ اس نے آپ کی خاطر پورے خاندان کو چھوڑ دیا، اب آپ اسے چھوڑ جائیں گی تو وہ مر جائے گا۔ اتنی سخت سزا نہ دیں۔ میں اس کی جانب سے آپ کی تمام شرائط قبول کرتا ہوں۔ فلیٹ کا قبضہ فوراً لے لیں۔ گزشتہ تین سال کا پورا مسافع نقد دینے کے لیے تیار ہے۔ الگ رہنا چاہیں تو الگ رہیں، صرف طلاق نہ لیں۔"

"کاکل صاحب! مجھے کبھی اس سے محبت نہیں رہی۔ شادی اُس وقت میری مجبوری تھی۔ کرنی پڑی۔ اگر وہ مجھ سے فریب نہ کرتا تو زندگی بُری بھلی جیسی بھی تھی اسی کے ساتھ گزر جاتی۔ میں اسے چھوڑ کر نہ جاتی۔ میں نے اسے برسوں برداشت کیا ہے اور کرتی رہتی۔ لیکن کیا کروں وہ بہت ہی خود غرض اور کمینہ آدمی ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔ وہ تو مجھ سے میری پوری زندگی تیاگ کر لیے جا رہا تھا۔ کیسے؟ یہ اسی سے پوچھیے گا۔ خیر گزری کہ مجھے بروقت پتا چل گیا۔ وہ شخص عرصے سے جانتا ہے کہ مجھے اس سے نفرت ہے، اور میں کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں یہ بھی اسے معلوم ہے۔ رہی یہ تجویز کہ میں قانونی اور مذہبی لحاظ اس کی زوجیت میں رہتے ہوئے رہائش کسی اور کے ساتھ رکھوں، اس سے وکیل صاحب میں کیا یہ سمجھوں کہ آپ اس کے ساتھ مل کر میرے اور

میرے پسندیدہ شخص کے قتل کے لیے پیشگی قانونی جواز پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

اس کا جواب سن کر ایک بار تو میں سناٹے میں آ گیا۔ گھبرا کر بولا، "نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کا جو جی چاہے کریں، میں کچھ نہیں کہتا۔" دل میں شاہد کو غلط بات پر اصرار کرنے کے لیے برا بھلا کہتا اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا۔ البتہ ایک ڈھارس تھی کہ میں نے اس کی صورت دیکھ کر جو اندازہ لگایا تھا اسے اس نے فوراً ہی صحیح ثابت کر دیا۔

سال ڈیڑھ سال میں مقدمات کا فیصلہ ہو گیا اور نتیجہ وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپیلیں دائر کرنے کی نہ میری رائے تھی نہ اس کے پاس ذرائع تھے۔ گلبرگ میں کرائے کی کوٹھی چھوڑ کر شہر سے دور ایک چھوٹے سے محلے میں مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا اور گھر کا سامان، کار، ٹیلی ویژن، قالین بیچ بیچ کر گزر اوقات کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جن دنوں مقدمات چل رہے تھے ماہ جبیں کو ان مقدمات کی تاریخیں یاد ہوتیں اور وہ ہر پیشی کی روداد مجھ سے کرید کرید کر پوچھا کرتی۔ شاہد احمد میں اس کی دل چسپی دوبارہ زندہ ہو گئی تھی۔ یہ بات تو خیر پہلے دن ہی اس کے رونے پر ظاہر ہو گئی تھی لیکن اب کے اس دل چسپی کی نوعیت کیا تھی اور شدت کتنی تھی، اس کے بارے میں کچھ مکمل کر سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد کیا وہ صرف اس کا خالہ زاد رہ گیا تھا جس کے آفت میں پھنس جانے کی وجہ سے اسے ہمدردی ہو رہی تھی یا اس میں کچھ فیصد عاشقانہ جذبات کے دوبارہ زندہ ہونے کی آمیزش بھی تھی؟ یا وہ سرے سے کبھی مرے ہی نہ تھے؟ میرے اندر رقابت سر اٹھا چکی تھی۔ میں اسے سختی سے دبائے ہوئے تو تھا لیکن مجھے ڈر رہتا کہ کہیں میں کسی دن پھٹ نہ پڑوں۔ عمر بھر کی پیش بندیاں، مصلحت کوشیاں اور ماہ جبیں سے ان کہی اور اپنے آپ سے بار بار دہرائی گئی مصلحتیں، سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ جس گھر کو بنا کے منزل کے قریب تک آ پہنچا ہوں، کیا اس گھر کو اب شاہد احمد خود ڈوبتے ڈوبتے اپنے ساتھ لے ڈوبے گا؟ میں نے ایسے تمام اندیشوں کو ہاتھ کی پشت سے ایک طرف ہٹا دیا۔ شاہد کی طرح ڈوبنے کے لیے جتنی ہوس، چالاکی اور خود غرضی کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں۔ میں پتے میز پر رکھ کر کھیلتا ہوں، اس کی طرح چھپا کر نہیں۔ اس میں اگر ہار ہو بھی تو وہ مکمل نہیں ہوتی صرف ایک محاذ تک محدود رہتی ہے، اور آپ کسی اور دن جنگ لڑنے کے لیے زندہ بچ جاتے ہیں۔ وقت کا وہ چاند جو جسمانی تقاضوں کے سمندر میں چڑھاؤ پیدا کرتے کرتے فریقین کو اندھا کر دیتا ہے، وہ اب دونوں کے لیے

غروب ہو چکا ہے۔ پھر سوچوں پر اجارے کا دعویٰ کون کبھی کر سکا ہے جو میں اس وہم میں پڑوں۔ ماضی کے متعلق مجھے پوری آگہی تھی اور شادی کرتے وقت اندازہ تھا کہ عواقب کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر بھی اگر چانس لیا تھا تو وہ تقریباً نبہ ہی گیا ہے۔ اب یہ وسوسے کیسے؟ اس سوچ سے میرا ذہنی تناؤ اور کھچے ہوئے اعصاب اعتدال پر آ گئے۔

جب میں نے تنسیخ نکاح کے فیصلے کی خبر ماہ جبیں کو سنائی تو اس کے چہرے پر اطمینان پھیلتا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ گیا ہو۔ شاید عورت سے عورت کا مثالی حسد اس کا سبب تھا۔ ماہ جبیں نے مختلف حلقوں سے صوفیہ کے حسن و جمال کی اتنی شہرت سن رکھی تھی کہ وہ اسے دیکھنے کے لیے بیتاب ہو ہو اٹھتی۔ اس نے آج اسے دیکھنے کی پرانی فرمائش پھر دہرائی۔ میں نے کہا کہ "جوں ہی کوئی مناسب موقع بنا تو تمہاری فرمائش پوری کر دوں گا۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ تمہیں صدمہ ہو گا کیوں کہ وہ تمہاری جوانی کے زمانے سے آج بھی کہیں بڑھ کر خوب صورت ہے۔" اس کی خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی کیوں کہ مل کی ملکیت اور قبضے کا فیصلہ جلد ہی ہو گیا اور صوفیہ نے شاہد احمد کا بینکوں میں منجمد روپیہ عدالت کے ذریعے وصول کیا اور تین مہینے کے اندر اندر مل شاہد احمد کے بیٹوں کے ہاتھوں بیچ کر اپنے دوست میجر جہاں زیب کے ساتھ ایسی گم ہوئی کہ کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں چلی گئی۔ البتہ افواہ کے طور پر سنا کہ کہیں کینیڈا میں جا کر آباد ہو گئی ہے اور جہاں زیب سے نکاح کر لیا ہے۔

ماہ جبیں کو جب پتا چلا کہ مل شاہد احمد کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے تو بہت افسردہ ہوئی اور کہنے لگی، "کیا کبھی کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ شاہد کا یہ انجام ہو گا۔ کتنے بڑے گھرانے میں آنکھ کھولی، کس طرح عمر بھر لوگوں کو انگلیوں پر نچاتے رہے، کتنی دولت پیدا کی، اور آخر کو خود فقیر ہو گئے۔" قریب تھا کہ وہ رو پڑتی۔ شاید میری وجہ سے ضبط کر گئی۔

میں نے کہا، "زندگی میں اس نے صرف ایک بار اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل کر کسی اور سے محبت کرنے کا حوصلہ کیا تو اپنی دنیا ہی بھول گیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں عورت ہو یا مرد، بڑھاپے کا عشق گھر برباد کر کے رہتا ہے۔"

"نہیں! عشق وشق کیا ہوتا انہیں۔ وہ عورت دھوکا دے گئی، بس۔"

شاہد احمد ہفتے دس دن میں گھومتا پھرتا کبھی میرے دفتر آ نکلتا۔ دل چاہتا تو گھنٹوں خاموش

بیٹھا مجھے کام کرتے دیکھتا رہتا، کبھی چند منٹوں بعد کچھ بتائے بغیر اچانک غائب ہو جاتا۔ اس نے نہ کبھی کسی کی شکایت کی، نہ حالات اور زمانے کا کوئی گلہ کیا۔ میں نے ایک بار روپے دینا چاہے تو بس اتنا کہا، "ابھی نہیں۔" اس کی حالت سے مجھے لگتا تھا کہ حواس کھو بیٹھے گا، لیکن وہ قائم تھے اور جیسے بعد میں ثابت ہوا ابھی تک قائم ہیں۔ بس بجھ گیا تھا اور بولنا کم کر دیا تھا۔ مجھے پہلے کبھی اس قدر زندہ اور فعال آدمی کو یوں بجھتے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا، "شاہد، کوئی کام کر لو۔ مثلاً کپڑے کا تھوک کا کام چھوٹے پیمانے پر۔ تمہیں اس کا تجربہ بھی ہے۔ سرمایہ میں لگا دیتا ہوں۔"

اس نے کہا، "کام؟ نہیں۔ دم گھٹ جائے گا!" اور اٹھ کر چلا گیا۔

ایک دن آ کر بولا، "میں فتح کوٹ چلا گیا ہوں۔ کبھی آنا۔"

میں نے کہا، "شاہد، میرے گھر چلے آؤ۔ بہت جگہ ہے۔" وہ "نہیں" کہتے ہوئے اٹھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گویا اپنے آپ سے کہا، "یہ فتح کوٹ پتا نہیں کہاں ہے۔ اس کو کیسے ڈھونڈوں گا۔" منشی پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا، "میں جانتا ہوں۔ شہر سے باہر ایک کچی آبادی ہے۔"

"اچھا۔ ڈرائیور کو ذرا سمجھا دینا۔"

کچی بستی میں منتقل ہونے کے بعد اس کا میرے دفتر آنا بند ہو گیا۔ فاصلہ زیادہ تھا، اس کی صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ کیسے آتا؟ سوچا اس دوران شاید اس نے نئی زندگی سے بھی کچھ نہ کچھ موافقت پیدا کر لی ہو گی۔ چھ ماہ بعد ایک چھٹی کے دن خیال آیا کہ شاہد سے ملنا چاہیے۔ میں نے ماہ جبیں سے چلنے کے لیے کہا۔ بولی، "آپ جائیں۔ پہلے جگہ تو دیکھ آئیں۔ پھر کبھی دل چاہا تو چلوں گی۔" میں سمجھا کہ صوفیہ کے ہجر میں شاہد نے اپنی جو گت بنائی اس کے بارے میں سنتے سنتے اب حسد کی وجہ سے اس کی شاہد میں دل چسپی ختم ہو گئی ہے۔ کچی آبادی سے بھی باہر نکل کر دو کنال کے قریب جگہ کے ارد گرد چار چار فٹ اونچی مٹی کی دیوار تھی۔ ایک کونے میں کچی کوٹھری تھی۔ پاس ہی ہینڈ پمپ تھا۔ سامنے نیم کا بھاری بھرکم پیڑ تھا، اس سے آگے کینو اور مالٹے کا چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ موسم بہار تھا اور دور دور تک مالٹے اور کینو کے پھولوں کی مہک کا طوفان آیا ہوا تھا۔ حد نظر تک چاروں طرف گندم کے سفر کھیت لہلہا رہے تھے۔

نئی آبادی میں پہنچ کر میں نے بچوں سے پوچھا، "یہاں شاہد احمد کہاں رہتے ہیں؟" وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے کہا، "چند مہینے ہوئے شہر سے آ کر یہاں رہنے لگے ہیں۔"

وہ یک زبان ہو کر بولے، "وہ باؤ بابا؟"

"ہاں ہاں، وہی۔"

وہاں پہنچا تو شاہد احمد نیم تنکے چارپائی پر بیٹھا پرندوں کو روٹی کے بھورے بنا بنا کر ڈال رہا تھا۔ سر اور داڑھی کے کھچڑی بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے۔ سلوٹوں بھری میلی شلوار قمیص تھی۔ آج مجھے وہ بہت ہی بوڑھا لگا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر افسردہ ہوا، وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ مجھے چارپائی پر بٹھا کر کوٹھری سے مٹی کا خالی گھڑا اٹھا لیا اور اسے مقابل الٹا رکھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، "یہیں آ جاؤ۔ بڑی جگہ ہے۔"

بولا، "نہیں۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کا مزہ آئے گا۔"

میں نے کہا، "شاہد تم زندگی کے بہاؤ میں بہتے بہتے کدھر کے کدھر نکل آئے ہو!"

"کدھر نکل آیا ہوں؟ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کسی اور سیارے میں نکل آیا ہوں۔ وہی دنیا ہے بھائی جو تمہاری ہے۔ بس ذرا سوچ کا رُخ بدل دیا ہے، اور وہ بدلتا رہتا ہے جیسے جیسے زندگی سے آپ کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی اور پُراعتماد گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ افسردگی اور اُداسی کے گڑھے سے باہر نکل آیا ہے۔ اس حالت میں کوئی کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟ یا تو پاگل ہو جائے یا مر جائے یا اس پر قابو پا لے۔ اس نے قابو پا لیا تھا اور حالات سے مفاہمت کر لی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے شاہد احمد سے اب کے اُس کے چوتھے جنم میں ملاقات کر رہا ہوں۔ جس روحانی سکون اور قلبی طمانیت کی راہ اس نے پیدا کر لی تھی اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ اس کا آخری جنم ہوگا۔ اس کے بعد وہ جنموں کے چکر سے نکل کر مکتی پا جائے گا۔ میں نے کہا، "شاہد، میرے ساتھ گھر چلو۔ وہاں بڑی جگہ ہے۔ تمہارے آنے سے ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی اور جس طرح کی زندگی کے تم ہمیشہ سے عادی ہو وہ تمہیں مل سکے گی۔"

"میں ان گنت خولوں کے اس جہنم میں لوٹ کر واپس نہیں جا سکتا۔ کل، ہم اس موضوع

کو بند نہ کر دیں، ہمیشہ کے لیے؟"

میں خفیف سا ہو کر چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بوجھل خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے بات شروع کی۔ "تم نے کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ پرانے زمانے میں ایک راجا ہو گزرا ہے جس کا نام بھرتری ہری تھا۔ اس پر بھی کبھی ایسی ہی اُفتاد پڑی تھی جیسی کہ اب مجھ پر پڑی ہے۔ راجا اپنی دوسری اور جوان سال رانی کو اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ اُس نے بےوفائی کی تو دنیا سے ایسا جی اُچاٹ ہوا کہ تخت چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور پھر کبھی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ سکھ کے سرچشمے سے نکل کر راجا جو دکھ کی بھٹی میں گرا تو ایسا کندن بن کر نکلا کہ شاعر ہو گیا اور اس کی شاعری نے اسے امر کر دیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ سادھو کا راجا کو دربار میں پیش کیا گیا امر کر دینے والا پھل، جسے راجا نے بےوفا رانی کی چاہت میں اسے اپنے آپ پر فوقیت دیتے ہوئے دے دیا کہ وہ کھا کر امر ہو جائے، وہ اگر واقعی کھا لیتی تو کیا امر ہو جاتی؟ نہیں۔ راجا کا نمک حرام کوتوالِ شہر جس کا رانی سے یارانہ تھا، اسے رانی نے محبت میں آ کر وہی پھل اٹھا کر دے دیا اور خود نہ کھایا۔ کیا وہ کھا لیتا تو امر ہو جاتا؟ ہرگز نہیں۔ راجا کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کی قدردان بازاری عورت جس سے اسی نمک حرام کوتوال شہر کو عشق تھا، وہ اسے اپنے عشق کی سرمستی میں وہی پھل دے آیا۔ اگر وہ کھا لیتی تو امر ہو جاتی؟ نہیں۔ اس بےچاری کو کیا امر ہونا تھا۔ وہ اگر راجا کی خدمت میں جا کے پھل نہ بھی پیش کرتی اور یوں گھوم پھر کر دوبارہ واپس آیا پھل راجا نہ بھی کھاتا تب بھی راجا ہی کو امر ہونا تھا۔"

میں نے کہا، "تم ایک بات بھول رہے ہو۔ کھانا تو دور کی بات ہے جس جس نے اس پھل کو چھوا بھی، وہ سب کے سب امر ہو گئے۔ وہ امر نہ ہوتے تو آج تم ہزاروں برس بعد بیٹھے ان کی کہانی کیسے سنا رہے ہوتے؟ اور امر ہونا کیا ہوتا ہے؟"

میری بات سن کر وہ مجھے کچھ دیر احمقانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر ہنسا اور بولا، "یار، تم بات تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگتا ہے۔"

"لکڑی لوہے کا بوجھ یوں ہی نہیں اٹھاتی۔ بیچ میں کوئی بات ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اپنے آپ پر فوقیت دی، اس لیے امر ہوئے۔"

ایک بار تو میرا دل چاہا کہ اسے بتا دوں کہ تمھاری اور بھرتری ہری کی کہانیوں میں صرف ایک بات مشترک ہے کہ دونوں نے دوسری شادی اپنے سے بہت چھوٹی عمر کی عورت سے کی،

اور وہ بیچاریاں بدنی تقاضوں یا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وفا نہ کر سکیں۔ بھرتری ہری تو اپنی مرضی سے راج پاٹ کو لات مار کر چلا گیا تھا اور اپنی پسند سے فقیری اختیار کی۔ تمھیں تو دوسروں نے لاتیں مار مار کر بڑی مشکلوں سے تم سے سلطنت چھینی۔ پلے پیسہ نہ رہا تو فقیر بننے کے سوا کیا چارہ تھا۔ بھرتری ہری رانی کے ساتھ رہنا چاہتا تو رہ سکتا تھا مگر اس کا دل نہ مانا۔ تم تو صوفیہ کو رقیب سمیت قبول کرنے پر تیار تھے مگر وہی نہ مانی۔ اس نے جو کچھ کیا شاہانہ وضع داری سے کیا۔ تم وہی کچھ کسی کمینے پن کی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس نے ایک بڑے آدمی سے یوں رشتہ جوڑ کر اس کی عظمت میں شریک ہوتے ہوئے زندہ رہنے کا سہارا ڈھونڈھ لیا ہے تو مجھے کیا تکلیف ہے، اور اس میں بھرتری ہری کا کیا بگڑتا ہے۔ اندھے سے لاٹھی اور لنگڑے سے بیساکھی نہیں چھیننی چاہیے۔

میں نے کہا، "یار، اتنے دنوں تک تو تم نے چپ سادھے رکھی، اب بولنے پر آئے ہو تو کسی دوسرے کو منھ نہیں کھولنے دیتے۔ خیر تو ہے؟"

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگا:

"بات یہ ہے کہ یہاں میری سننے اور سمجھنے والے ذرا کم کم ہیں۔ اس لیے تمھاری صحبت کو غنیمت جانتے ہوئے چھ مہینے میں جو جو سوچا ہے اسے جھٹ پٹ اگلنے کی کوشش میں ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، کبھی صوفیہ بھی یاد آتی ہے؟"

"تم نے اس کا نام لیا ہے تو میرے اعصاب یوں جھنجھنا اٹھے ہیں کہ میرے وجود کے درودیوار لرز گئے ہیں۔ بس اسی سے اندازہ کر لو۔"

"فرض کرو وہ واپس آجائے تو تم اسے قبول کر لو گے؟"

"نہیں۔ میں نے عورتوں سے ملنے کی قسم کھا لی ہے۔ کسی عورت کو اس چاردیواری کے اندر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں۔"

"چلو اگر وہ زور سے اندر آ ہی جائے تو پھر؟"

"میں فوراً یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

"اگر تمھاری بیٹی شوبنہ جس سے تمھیں بہت پیار ہے ملنے آئے تب؟"

"تب بھی اجازت نہ دوں گا۔ اس معاملے میں بیوی، بیٹی، بہن اور غیر عورت کوئی ہو،

سب سے یہی سلوک ہوگا۔"

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ جو ایک صوفیہ کی بےوفائی کا بدلہ پوری عورت جنس سے لینے پر تلا بیٹھا ہے وہ جنموں کے چکر سے ابھی نکلتی نہیں پا سکے گا۔ اسے اپنی روح کو در گزر سکھانے کے لیے ایک جنم اور لینا پڑے گا۔

**

تھامس پالاکیل

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

چاکلیٹ کی جنگ

کوئی بیس برس پہلے کا ذکر ہے، میرا دوست افاچن ہمارے گاؤں کے بیچوں بیچ اُگے پیپل کے پیڑ تلے ایک بکری اور اپنے تین کسان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا جو پان اور تمباکو کی پتیاں چبا رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے افاچن ایک عالمی سازش کے نرغے میں آ گیا۔ اس کے بعد کے پانچ برسوں میں اسے تھیڈاماڈ گاؤں میں ایک انقلاب، نباتات کی ایک پوری نسل کی تباہی، تیرتے ہوئے محبت ناموں، جذباتی صدمات اور خود اپنے زوال کا ذمے دار قرار دیا گیا۔

تھیڈاماڈ بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ آپ اسے نقشے پر نہیں پائیں گے۔ ایک گرجاگھر، شراب کی چند دکانیں، مندر، ڈاک گھر، چائے خانے، اسکول، اور یہاں تک کہ پیشہ ورانہ انداز میں تسکین فراہم کرنے والی ایک عورت بھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں جو اتنی بڑی دنیا کو کسی بھی طرح متوجہ کر سکے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میرا دوست ضرور عالمی طاقتوں کے، خصوصاً امریکا کے، لیے ایک کشش سی محسوس کرتا تھا۔ اور اس کا مرحوم باپ، موجد استھپن، بھی اس قسم کے خیالات رکھتا تھا جنھیں "کتے کے بھونکنے کے اثرات" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کتے کا جی بھونکنے کو چاہا، اور بس، ایک ناریل اس کی کھوپڑی پر آ گرا۔ ٹھیک اسی طرح عالمی سازش افاچن کے سر پر آ گری۔

اس روز بھی، جب بڑی دنیا کو اس چھوٹے سے گاؤں کے ساتھ اس سازش میں شریک ہونا تھا، تینوں کسان پان اور تمباکو چبا رہے تھے۔ بکری اُن کی طرف دیکھتے ہوئے گلی میں پڑا ایک پرانا اخبار چاٹ رہی تھی، پھر وہ بھی اسے چبانے لگی۔

"آج گرمی کچھ کم ہے، کیوں؟" اوناچن نے اپنے کسان ساتھیوں سے کہا، اور اپنی بات کا جواب اسے خاموشی کی صورت میں ملا۔ اسے ان اگلے وقتوں کے لوگوں پر بہت تاؤ آتا تھا کہ وہ بس چپ چاپ بیٹھے پان چبایا کرتے تھے۔ اوناچن کو باتیں کرنے کا شوق تھا۔ مگر ان کسانوں میں سے کوئی بھی اپنا منہ پان اور اس کی پیک سے بھرے ہونے کی وجہ سے بول نہ سکتا تھا، یہاں تک کہ جھگڑالو کنات جورف بھی نہیں جس کے گلے میں اس کی پرانی تسبیح جھول رہی تھی۔ اس جگالی میں ان تینوں کا ساتھ دینے کے بجائے اوناچن نے سبز انقلاب کی بات چھیڑ دی جس کے بارے میں وہ اخباروں میں اتنا کچھ پڑھ چکا تھا۔ اپنے باپ استھاپن کی طرح، جو اُس خودکار تابوت کا موجد تھا، اوناچن کو بھی اہرامِ مصر اور دیوارِ چین کے پیمانے کے منصوبوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ موقع بموقع وہ خود بھی اس نوع کا کوئی منصوبہ پیش کرتا، مثلاً اچار کے تالاب کا منصوبہ جس میں پورے گاؤں کے لوگ اچار ڈال سکیں اور انھیں چھوٹے چھوٹے مرتبانوں سے نجات مل جائے۔ لیکن یہ خیال صرف کمیونسٹوں کی دلچسپی کا باعث ہوا۔ اور رشتہ سازوں نے شادی کے ممکنہ امیدواروں کی فہرست میں سے اوناچن کا نام خارج کر دیا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ جنوب کے علاقے میں بھی سبز انقلاب لایا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ میرا تو یہی خیال ہے،" اوناچن بولا۔

کنات جورف نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کندھے اُچکا دیے۔

"ہم امیر ہو جائیں گے۔ دن میں چار بار کھانا کھایا کریں گے۔ ہمارے پاس ریڈیو بھی ہو گا،" اوناچن نے کہا۔

کنات جورف نے اپنے منہ میں پان بھرے بھرے اوناچن کی طرف دیکھا، کیوں کہ محض اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے پان کی پیک منہ سے نکال دینا اسے مہنگا سودا معلوم ہوا۔

"اخباروں میں لکھا ہے کہ پھر ہمارے گاؤں میں بجلی بھی آجائے گی،" اوناچن نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

اب کنات جوزف سے نہ رہا گیا اور اس نے پیک تھوک ہی دی۔ پھر وہ چلّا کر افاچن سے بولا، "اور تمھارے اخبار ربڑ کے بھاؤ کے بارے میں کیا لکھتے ہیں؟ کہ کسان بھاڑ میں جائیں؟"

"اسی لیے تو ہمارے بھارت دیش میں سبز انقلاب کی ضرورت ہے،" افاچن نے کہا۔

"یہ کیا بک رہا ہے؟ وہی کمیونسٹوں والی باتیں؟" کنات جوزف نے اپنے پان چباتے ساتھیوں سے رجوع کیا۔

"دیکھتے جاؤ۔ پانچ سال میں امریکا بن جائے گا۔" افاچن نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور مستقبل کو اپنی انگلیوں سے ظاہر کر کے دکھایا۔ "امریکا ہمیں ساری چیزیں بھیجے گا۔ موٹی گائیں، بڑے بڑے ٹریکٹر، نئے بیج، اچھی بجلی۔ میں نے سب اخبار میں پڑھا ہے۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

بکری نے بھی منمنا کر تائید کی۔ آخر وہ بھی اخبار کھاتی تھی۔ پھر گاؤں کے سر سبز ہونے سے اُس کا بھی مفاد وابستہ تھا، جو یوں اب بھی ربڑ کے پودوں سے اچھا خاصا ہرا بھرا تھا لیکن تمام مویشی ربڑ کے پھیکے، ثقیل اور چپچپے رس سے بھرے پتوں سے بیزار ہو چکے تھے جس نے سو برس پہلے، جب ایک گورا مشنری ربڑ کے پودے پہلی بار تھیڈاناڈ لے کر آیا تھا، بکریوں اور گایوں کی ایک پوری پیڑھی کی جان لے لی تھی۔

"ہم یہ ربڑ کے پیڑ کاٹ پھینکیں گے اور ان کی جگہ چاول اور گیہوں اور میٹھے آلو اگائیں گے۔ تھیڈاناڈ میں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی۔ بابا!"

"دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی، اور تمھارے سوکھے سڑے جسم پر بوٹی چڑھے گی۔ بابا!" کنات جوزف نے اپنے دانت نکال دیے جو پان چبانے سے لال ہو رہے تھے، اور پھر اپنے ساتھیوں سے بولا، "میرا خیال ہے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ تم نے سنا کہہ رہا تھا ربڑ کے پیڑ کاٹ پھینکیں گے۔ کل ہمارے گلے کاٹنے کی بات کرے گا۔"

کسان روایتی طور پر ربڑ کے پیڑوں سے پیدا ہونے والی دیرپا خوش حالی کا احترام کرتے تھے۔ کیا ہوا جو آج کل ربڑ کا بھاؤ گر گیا ہے، ایک نہ ایک دن پھر چڑھ جائے گا، وہ سوچتے۔ پرانی کہاوت تھی کہ آدمی اپنی زندگی میں ربڑ کی کاشت کا منظر صرف تین بار دیکھ سکتا ہے۔ چوتھی بار کاشت کا موقع آنے تک یا تو وہ مر چکا ہوگا یا آنکھیں جاتی رہی ہوں گی۔ کنات جوزف اپنی زندگی میں ربڑ کی تین بار کاشت دیکھ چکا تھا اور کہاوت کے بقیہ حصے کا خیال اسے کچھ خوش نہ کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

کنات جورف نے افاچن کی بات کو جھٹک کر موسم کا ذکر چھیڑ دیا۔ بکری نے تھوتھنی آگے بڑھ کر پان کی اس پیک کو سونگھا جو دھول میں لاوے کی طرح بہنے لگی تھی، لیکن سرکار کے آنے پر اسے اپنا سر پیچھے کر کے تعظیم میں اٹھ کھڑا ہونا پڑا۔ افاچن، کنات جورف اور باقی دو کسان بھی کھڑے ہو گئے۔

ایک کھٹارا جیپ آ کر پیپل کے پاس رکی۔ اس میں سے والرس کی سی مونچھوں والا ایگریکلچرل اسلیسر ہاتھ میں کچھ سوکھی جڑی بوٹیاں لیے برآمد ہوا۔ یہ امریکا کے مشہور عالم کوکو کے پودے تھے۔ گاؤں کے سرسبز ہونے کا عمل فوراً شروع ہونے والا تھا۔ اسی لیے۔

اگلے پانچ برسوں میں، جن کا خاتمہ چاکلیٹ کی جنگ پر ہوا، افاچن کو جب کبھی وہ لمحہ یاد آتا تو ساتھ ہی خدا کی قدرت کا بھی خیال آتا، اور اس کے منہ سے نکلتا کہ قسمت کی بات ہے۔ قسمت کا کچھ نہ کچھ دخل اس میں یقیناً رہا ہوگا کیوں کہ ٹھیک اس وقت جب افاچن اپنے ساتھیوں سے نئے امریکی بیجوں کے آنے کی بات کر رہا تھا، جیپ میں بیٹھا سرکار کا افسر اپنے ہاتھ میں کوکو کے آخری چار پودے لیے ایسے جوشیلے کسانوں کو ڈھونڈتا وہاں وارد ہوا جو تجرباتی بنیاد پر اس کی کاشت شروع کر سکیں۔

افاچن اور اس کے تین کسان ساتھیوں کو چُن لیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک کو، بھارت دیش کے راشٹرپتی کی طرف سے تحفے کے طور پر، کوکو کا ایک ایک پودا ملا، جو خود بھارت کے راشٹرپتی کو امریکا کے پریزیڈنٹ کا تحفہ تھا، اور یوں سبز انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔

جیپ گاڑھے سیاہ دھوئیں کے بڑے بڑے بادل اُگلتی رخصت ہو گئی۔ اس دھوئیں سے افاچن کو فرحت کا احساس ہوا کیوں کہ اسے اس میں ترقی کی جھلک دکھائی دی۔ تینوں کسان ایک ایک پان اور چبانے کے خیال سے پھر بیٹھ گئے۔ بکری نے بھی پیپل کے برابر میں رکھے کوکو کے چار پودوں پر نظر ڈالی اور ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس نے اخبار چاٹنے کا مشغلہ چھوڑ کر اپنی لمبی گلابی زبان نکال کر ان لذیذ پودوں کو، ایک ایک پتّی کر کے، تناول کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ان چاروں میں سے صرف ایک، افاچن، کے پاس انقلاب لانے کا سوقع رہ گیا۔ اور مجھے اس نے اپنا اقتصادی مشیر مقرر کیا۔

افاچن نے اپنے حصے میں آئے ہوئے کوکو کے پودے کو اولمپک کی مشعل کی طرح تھاما اور گھر کی طرف دوڑا۔ راستے میں اس کی لنگی ہوا سے اڑ کر گر پڑی لیکن وہ مشعل اٹھائے اپنی منزل کی طرف گام زن رہا۔ کوکو کے پودے کو اس قطعۂ زمین میں لایا گیا جہاں پریشان حال کسانوں اور دل گرفتہ دوشیزاؤں کے مددگار ولی سینٹ جارج کو ہدیے میں پیش کرنے کے لیے کیلے اگائے جاتے تھے۔

سینٹ جارج کے لیے مخصوص قطعے میں یک عجیب و غریب پودے کو پنپتا دیکھ کر افاچن کی ماں والیہ ماما رونے لگی کیوں کہ اس کے نزدیک سینٹ کو ان کے کیلوں سے محروم کرنا سخت بے حرمتی کی بات تھی۔ لیکن سینٹ کو صبر کرنا پڑا۔ مجھے یاد ہے، اُس سال سینٹ جارج کے تہوار پر افاچن اپنی روایتی کیلوں کی نذر لیے بغیر نمودار ہوا۔ بہترین نذر کا انعام کنات جوزف نے جیتا: وہ سینٹ کے لیے ربڑ کی ایک چادر لایا تھا جس کا وزن اٹھارہ پاؤنڈ تھا۔ قالین کے باپ کی یہ غیر معمولی ربڑ کی چادر دیکھ کر بے دانت کے منہ والا پادری بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے ضرور درجن بھر ربڑ کی چادروں کو سی کر بنایا گیا ہو گا۔ یہ تبرک پچاس روپے میں نیلام ہوا، جو اس کی لاگت سے دگنی رقم تھی۔

"افاچن، تم اس بار اپنے بھاری کیلے کیوں نہیں لائے؟ شاید وہ ساٹھ روپے میں نیلام ہو جاتے،" میں نے کہا۔

"میں نے امریکی کوکو کا پیڑ اگایا ہے،" اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا۔ "اگلے سال میں کوکو کا ایک ڈوڈا نذر میں پیش کروں گا۔ کیسا رہے گا؟"

"کوکو! اوہ خدایا! تم یقیناً اس ملک میں کوکو اگانے والے پہلے کسان ہو گے،" میں نے کہا۔

اگلے پندرہ مہینوں میں افاچن کا کوکو کا پیڑ پھول لے آیا۔ افاچن نے کھاد کے طور پر انڈے کے چھلکے اور راکھ اور مچھلی کا خون ڈالا، اور کہا جاتا ہے کہ پودا اتنی تیزی سے بڑھا کہ تم اسے بڑھتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ اور ننگی آنکھ سے۔ افاچن تو خیر اس کے اگنے کی آواز تک سن سکتا تھا۔

اس سال گرمیوں میں نصف درجن سفید پھول پک کر کوکو کے پیلے پیلے ڈوڈے بن گئے، اور گہرے سبز پتوں کے پس منظر کو روشن کرتے ان پیلے ڈوڈوں کے شاندار نظارے نے پورے گاؤں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ گرجا گھر اور بازار کے بیچ، اور شراب خانے اور مندر کے بیچ آتے

جاتے گاؤں والے، بلکہ اینی طوائف کے خانۂ مسرت سے لوٹتے ہوئے شرفا بھی، اس طلسمی درخت کو دیکھنے کے لیے اواچن کے گھر آ کھڑے ہوئے۔ اس درخت نے ایک تاریخی اہمیت اختیار کر لی جو واسکوڈی گاما کی آمد اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی روانگی سے بھی زیادہ تھی۔ جب پہلے پہل اندر بیج پڑنے سے پھولنے لگے تو اواچن نے پورے پیڑ کو ایک پردے سے ڈھانپ دیا جسے اناج کی بوریوں اور لنگیوں اور پرانی قمیصوں کو ملا کر سیا گیا تھا۔ یہ پیڑ کو محمد قادر کی نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کی خاطر کیا گیا جو ہمارے گاؤں کا واحد مسلمان تھا۔

محمد قادر ہی اواچن کے پیڑ کی یکایک شہرت کا باعث تھا۔ اس نے دھات کے پرانے ٹکڑوں کی تلاش میں اپنی روزمرہ گردش کے دوران ساتوں گاؤں میں یہ بات پھیلا دی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے پہلی بار محمد قادر کو دیکھا تو میری ماں نے مجھے دھیمی آواز میں بتایا تھا کہ محمد قادر جس چیز کی تعریف کر دے وہ آخرکار فنا ہو کر رہتی ہے، اور مجھے نصیحت کی تھی کہ اس کالی زبان والے کے سائے سے بھی دور رہوں۔ مجھے اکثر قادر پر ترس آتا کیوں کہ بڑے لوگ اپنی ہر بد قسمتی کا قصور اسی کے سر منڈھتے۔ کبھی کبھی تو اسے ملکی سطح پر آنے والی آفات کی بھی ذمے داری اٹھانی پڑتی۔ اس کی زبان سے تاج محل کی تعریف نکلے ابھی ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ اخباروں میں خبر چھپی کہ تاج محل زمین میں دھنسنے لگا ہے۔ تمیڈ ناڈ کے لوک ورثے کے مطابق ایک بار محمد قادر نے کسی گائے کے تھنوں کی تعریف کی، اور اس کے فوراً بعد وہ بے چاری بس سے کچلی گئی، اور جوں ہی اس نے ایک حسین عورت کے لمبے بالوں کی تعریف میں کچھ کہا غریب کے بال جھڑنے لگے اور آخر وہ بالکل گنجی ہو گئی۔ اس تمام کے باوجود میں محمد قادر کو پسند کرتا تھا۔

میری اور اواچن کی دوستی کی بنیاد خالصتاً سبز انقلاب پر ہمارے اعتقاد پر تھی۔ محمد قادر بھی اس کا حامی تھا۔ بد قسمتی سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکتا تھا؛ اس کے پاس زمین ہی نہ تھی۔ میرے باپ کے پاس زمین کی کمی نہ تھی لیکن اس نے اس پوری تحریک کو نچلے طبقے کے کسانوں کی لیشن پرستی جان کر نظر انداز کر دینا مناسب سمجھا۔ میری اپنی شراکت دانش ورانہ نوعیت کی تھی۔ میں نے ہی اواچن کو سمجھایا تھا کہ کس طرح جنوبی امریکا اور مغربی افریقا اور کیریبین کے کسان کوکو کی کاشت کر کے سونے کی فصل کاٹ رہے ہیں، اور کیسے دنیا بھر کا چاکلیٹ کوکو کے

بیجوں سے تیار کیا جاتا ہے، اور یہ کہ سبز انقلاب کا مستقبل کوکو سے وابستہ ہے۔ بانی اسکول کی بوٹنی کی کتاب سے حاصل کردہ علم کا آموختہ دُہرانے کے لیے افاچن بہترین سامع تھا۔ میں اس کے لگائے ہوئے پودے کو "تھیوبرما کوکوا" کے نام سے پکارنے کا اہل تھا، اور وہ ان لفظوں میں پوشیدہ گہرے معانی کو سمجھنے پر قادر تھا۔

جب خود افاچن کی گفتگو میں بھی نباتیات کی اصطلاحات اور علامتوں اور استعاروں کی بھرمار ہونے لگی تو لوگ اس سے کترانے لگے۔ وہ اسے گلی کے سرے پر آتا دیکھتے تو مڑ کر دوسری سمت میں بھاگ کھڑے ہوتے، یا پیشاب کرنے کے بہانے دریا کے کنارے کی طرف چل دیتے۔

تاہم افاچن کا پہلے پھل کا جوش کبھی قابو سے اس درجہ باہر نہیں ہوا جتنا بعد میں اس کے احساسِ ناکامی کو بے قابو ہوا تھا۔ بہت سے بہت اتنا ہوا کہ اس نے کہہ دیا کہ کنات جوزف کی بیٹی روشا کے نوک دار پستان بالکل کوکو کے ڈوڈے معلوم ہوتے ہیں۔ روشا کی کسی ساتھی نے افاچن کے یہ شاعرانہ خیالات اس تک پہنچا دیے۔ اگلی بار جب روشا نے اسے پھل کے پیڑ تلے بیٹھے دیکھا تو اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے کی دھمکی دی جو خود اس کا باپ، استاپن، تھیڈاناڈ کے جانوروں کے ساتھ کیا کرتا تھا، یعنی بلامعاوضہ آختہ۔

کوکو کا پہلا پھل پکنے پر افاچن نے پادری کو دعوت دی کہ خود آ کر پیڑ کو برکت دے اور سینٹ جارج کے لیے پیڑ کا پہلا پھل بطور نذر وصول کرے۔ اور مجھے بھی اس تقریب میں شرکت کی باضابطہ دعوت دی گئی۔ اس شام جب ہم پیڑ کے پاس کھڑے پادری کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، محمد قادر اور دو درجن دوسرے دل چسپی رکھنے والے لوگ بن بلائے مہمان بن کر وہاں پہنچ گئے۔ ان کی قیادت بہترین نذر کا انعام پانے والا اور روشا کا باپ کنات جوزف کر رہا تھا۔

آخر کار پادری بھی گرجا گھر کا خادم کو ساتھ لیے آ پہنچا۔ ہم سب پیڑ کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ جس وقت پادری درخت پر اور حاضرین پر مقدس پانی چھڑک رہا تھا، محمد قادر کھسکتا بڑھتا سب سے آگے کی صف میں آ گیا۔ مقدس پانی کا ایک قطرہ اس پر بھی پڑا۔ یہ ایک عظیم لمحہ تھا۔ میری نگاہیں پیڑ کے تنے سے جھولتے کوکو کے پیلے پھلوں پر مرکوز تھیں اور ذہن میں خدا اور بہشت اور سانپ سے متعلق خیالات گردش کر رہے تھے۔ مقدس پانی کی بوچھار نے محمد قادر کو بھی خدا کی یاد دلا دی ہو گی، کیوں کہ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا، "یا اللہ! کیسا شاندار درخت ہے!

Scanned with CamScanner

اللہ تیری شان!"

"اپنی کالی زبان بند کر،" کنات جوزف نے چلا کر کہا۔

"اپنے اللہ کو اپنے تک ہی رکھو۔ یہاں دعا پڑھی جا رہی ہے۔" پادری کے پوپلے منہ سے نکلتی ہوئی ڈانٹ خاصی نرم محسوس ہوئی۔ چناں چہ محمد قادر حاضرین کی نیک دلی پر بھروسا کیے وہیں کھڑا دانت نکالا کیا۔ یہ ایک مقدس لمحہ تھا۔ اس لمحے افاچین نے کوکو کا پہلا پھل توڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ عشائے ربانی وصول کر رہا ہے۔

اس نے یہ پھل پادری کی خدمت میں پیش کیا: "کوکو کا پہلا پھل!"

"اسے تم ہی رکھو۔ سینٹ جارج بھلا اس بے مصرف پھل کا کیا کریں گے؟" پادری نے کہا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر محمد قادر وہاں سے ہٹ جاتا تو پادری نے پھل ضرور لے لیا ہوتا۔

'قادر، یہ پہلا پھل ہے!" افاچین نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ میں نے اس کی کلائی پر چٹکی لی؛ وہ بات سمجھ گیا اور اس نے پھل مجھے تھما دیا۔ پادری اور دوسرے حاضرین منتشر ہونے لگے اور یہ جملہ کہ "سینٹ جارج بھلا اس بے مصرف پھل کا کیا کریں گے؟" تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ بن گیا۔

افاچین نہیں جانتا تھا کہ پیڑ سے حاصل ہونے والے بیجوں کو کہاں فروخت کرے۔ میں نے ایک چاکلیٹ پر سے ارسے کاغذ پر ایک امریکی کارپوریشن کے بمبئی کے دفتر کا پتا پڑھا اور انگریزی میں اپنا پہلا خط ڈرافٹ کیا۔ کوکو پر اپنی وسیع تحقیق کی بنیاد پر میں نے افاچین کو مشورہ دیا کہ بیجوں کو دھوپ میں خشک کر لے اور پیڑ پر پکتے ہوئے پھلوں پر نگاہ رکھے کہ کیڑے، گلہریاں اور پڑوسی انھیں خراب نہ کریں۔

ایک مہینے بعد ملٹی نیشنل کارپوریشن کا نمائندہ اپنا سنہری کناروں والا بریف کیس اٹھائے تھیڈانڈ پہنچا۔ اس نے ویسی جیکٹ پہن رکھی تھی جیسی پنڈت نہرو پہنا کرتے تھے۔ وہ دیسی زبان بڑی مشکل سے بول پا رہا تھا۔ اس کی آمد ایک اچھا شگون تھی۔ جب کی آمد کے ساتھ ساتھ اس واقعے کو بھی اب تک یاد کیا جاتا ہے۔ سو سو کے ان دو کرارے نوٹوں کی بابت جو اس نے افاچین کے حوالے کیے، لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اس قدر گرم اور ان کا سبز رنگ اتنا تازہ تھا کہ اس شخص نے ضرور انھیں اسی صبح چھاپا ہوگا۔

جب کارپورچن کا نمائندہ رخصت ہوا تو اوناچن نے چاے اور تلے ہوے کیلوں سے میری تواضع کی اور میری پیٹھ ٹھونکی۔ "تم دنیا کے سب سے قابل لڑکے ہو۔ تمھیں دولت سنبھالنی چاہیے۔" چاے خانے میں بیٹھے بیٹھے میں نے اسے ایک نرسری قائم کرنے کا مشورہ دیا جس میں ساتوں گاؤوں میں بیچنے کے لیے کوکو کے پودے تیار کیے جائیں۔

اوناچن اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کا چہرہ اسی ابدی مسکراہٹ سے جگمگا رہا تھا جو اس کے مرحوم باپ، استھاپن، کے چہرے پر پھیلی رہتی تھی۔ بوڑھا آدمی اس طرح اپنی کسی ایجاد کے ناکام ہوجانے کے بعد مسکرایا کرتا تھا۔ اوناچن اس انجام سے پہلے مسکرایا۔ اس نے نرسری کے منصوبے کو فوراً قبول کر لیا، بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا نام بھی رکھ لیا: "مرحوم استھاپن یادگاری کوکو نرسری۔" اس نام نے مجھے فکر میں ڈال دیا۔ استھاپن کے نام کے ساتھ کچھ ایسی یادگار ناکامیاں وابستہ تھیں کہ اس کی بہترین ایجاد خود اس کا اپنا تابوت ثابت ہوئی تھی۔

خبر پھیل گئی کہ اوناچن کو اپنے پہلے ہی ڈوڈے کی فروخت سے اتنی آمدنی ہوئی ہے کہ وہ اس پر پورا ہفتہ بسر کر سکتا ہے۔ یہ سچ تھا۔ ساتوں گاؤوں کے لوگ آ آ کر بیج مانگنے لگے۔ ان میں آخری آدمی کنانت جوزف تھا۔ وہ پادری کا سفارشی خط لے کر آیا تھا۔

"چھ مہینے بعد آنا۔ میں تمھیں کوکو کے پودے دے دوں گا۔ جتنے تم کہو،" اوناچن نے اس سے کہا۔

ایک روز اوناچن نے اپنی دو ایکڑ زمین بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا جس پر ربڑ کی کاشت ہوتی تھی۔ وہ اس رقم سے کوکو کی پہلی فصل تیار کرنا چاہتا تھا۔

"اور اگر ربڑ کا بھاؤ پھر چڑھ گیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ممکن ہی نہیں،" اس نے جواب دیا۔

اپنی ماں سے کہو کہ وہ پوٹلیاں کھول کر اپنی بچائی ہوئی رقم نکالے اور اس رقم سے تم کچھ سستی زمین خرید لو،" میں نے کہا۔ ہم دونوں کو ہنسی آ گئی۔ مجھے اس وقت تک یقین نہ آیا کہ وہ واقعی ربڑ کے پیڑ کاٹ ڈالنے کی جرأت کرے گا جب تک اس نے والیہ ماما سے یہ بات نہ کی۔ وہ سخت طیش میں آ گئی اور اپنا ہتھیار، جھاڑو، رسائی میں نہ پا کر اوناچن کو کاٹ کھایا۔ ہفتے بھر بعد جب والیہ ماما اعتراف کرنے گرجا گھر گئی ہوئی تھی، اوناچن نے کچھ بڑھئیوں کو بلوا کر پیڑ کٹوا دیے۔

واپسی پر کٹے ہوئے پیڑ دیکھ کر والیہ ماما بے ہوش نہیں ہوئی۔ اس نے اواچن کو بے ہوش کر دیا۔ اسے اپنا ہتھیار دستیاب ہو گیا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد اواچن نے نہایت کامیابی سے کوکو کے تین سو پودے لگائے، اور ان سے بچی ہوئی تھوڑی سی جگہ میں موجد استاپن یادگاری کوکو نرسری کھول دی۔ والیہ ماما گاؤں بھر میں اپنی بقیہ زندگی نن کے طور پر بسر کرنے کا اعلان کرتی پھری۔

اواچن کے مکان پر رک کر کوکو کے بیج مانگنے والے شہریوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اواچن ہر ایک سے وہی ایک بات کہتا رہا، چھ مہینے بعد آنا۔ چھ مہینے بعد۔

یہ انکشاف مجھ پر چاکلیٹ کی جنگ کے ختم ہونے کے کئی برس بعد ہوا کہ پورے گاؤں کے مطالبوں کی مزاحمت کرنے والا اواچن کس طرح ایک لڑکی روشا کی ترغیب سے نہ بچ سکا۔ ایک شام جب اواچن دریا سے پانی لا لا کر اپنی نرسری کے پودوں میں ڈال رہا تھا، اس نے ایک بڑے سے پتے کو دریا کی سطح پر تیرتے دیکھا جس کے اوپر کوئی چیز رکھی تھی۔ یہ ایک خط تھا۔ اواچن کو روشا کی پرانی دھمکی یاد آئی، لیکن سینے تک پانی میں ڈوبی کھڑی روشا کسی ہندی فلم کی ہیروئن کی طرح لگ رہی تھی جو نہاتے اور اپنے مشہور و معروف بدن کو صابن لگاتے ہوئے مسکرا رہی ہو۔

اواچن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے خط اٹھا کر پتے کو آگے بہہ جانے دیا۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

> میرے پیارے اواچن کو معلوم ہو کہ خط لکھنے والی دریا پر اس جگہ کے ٹھیک سامنے نہا رہی ہے جہاں سے تم اپنے پیارے پودوں کے لیے پانی بھر رہے ہو۔ میں تمھیں اس لیے خط لکھ رہی ہوں کہ میں نے تمھیں اپنی جانب تکتے ہوئے دیکھا ہے۔ خدارا میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟ میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ تم محنت کر کر کے بالکل پنسل کی طرح دبلے ہو گئے ہو۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟ تم نے میرے بارے میں جو بات کہی تھی، وہی کوکو کے ٹوکدار ڈوڈوں والی بات، وہ مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے سن کر مجھے تم سے نفرت

نہیں ہوئی۔ میں مدر تیریسا کی طرح نن بننے کا سوچ رہی تھی اس لیے کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔ لیکن اب نن بننے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ میری سہیلیوں نے مجھے بھڑکا دیا کہ تم خراب آدمی ہو، اس لیے میں نے تمھیں کچھ برا بھلا کہہ دیا تھا۔ مگر مجھے تم پہ غصہ بالکل نہیں تھا۔ لیکن میں یہ کیسے کہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے؟ کتنی شرم کی بات ہے، ہے نا؟ اس لیے میں نے تمھارے ساتھ تمھارے ابا کا مشغلہ اختیار کرنے کی دھمکی دی تھی، لیکن وہ تو صرف تمھیں ہنسانے کے لیے تھا۔ ہنس دو نا! میں دیکھ رہی ہوں۔ اس خط کو پھاڑ دینا۔ میں پھر خط لکھوں گی۔ ہنسو۔ ہنس کے دکھاؤ۔

تم سے پیار کرنے والی، "ر"۔

اور ہاں، کیا تم میرے باپ کو تھوڑے سے کوکو کے بیج نہیں دے سکتے؟

اوناچن نے اُسی شام خود جا کر دو درجن بیج کنات جوزف کو پیش کیے اور اس طرح ایک آدمی کی تباہی کا آغاز ہوا۔

اگلا سال آنے تک اوناچن کوکو کے پچیس ہزار پودے فروخت کر چکا تھا۔ والیہ ماما بھی خوش تھی۔ چاکلیٹ بنانے والی کارپوریشن کے ایجنٹ نے کوٹایام میں باقاعدہ اپنا کلکشن سنٹر قائم کر لیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہر گاؤں میں ایک اوناچن تھا جو سبز انقلاب کے طلسمی درخت کو متعارف کرا رہا تھا، اور یہ بھی کہ ہر گاؤں میں چاکلیٹ کی جنگ ہوئی۔

اوناچن کو اپنی ذاتی عادات کے بارے میں تیرتے ہوئے خطوں کے ذریعے ہدایات ملنے لگیں۔ وہ روزانہ اپنے دانت مانجھنے لگا۔ گشتی حجام ہر صبح اس کی حجامت کے لیے آنے لگا، اور اس نے اپنے ملبوسات کے ذخیرے میں دو قمیصوں کا اضافہ کیا۔ پورے گاؤں کو اوناچن کے امیر ہو جانے کی فکر لگ گئی۔ رشتہ سازوں نے اس کا نام دوبارہ اپنی فہرست میں شامل کر لیا۔ ربڑ کا بھاؤ متواتر گر رہا تھا؛ اوناچن کے تین سو کوکو کے پیڑ مسلسل بڑھ رہے تھے اور کوکو کے لاتعداد ڈوڈے پیدا کر رہے تھے۔ ہر صبح میں اسے گاڑی بھر کوکو بازار میں لاتے اور ہر شام روپوں سے بھرا تھیلا

Scanned with CamScanner

گھر واپس لے جاتے دیکھتا۔

"افاچن کے روپوں کے تھیلے کو تو دیکھو، حاملہ بھینس کی طرح موٹا اور بھدا ہو رہا ہے،" ایک چائے خانے میں بیٹھے ریٹائرڈ اسکول ٹیچر اوسف سر نے کہا۔

"شکر ہے وہ یہاں آ کر اپنے سبز انقلاب کے وعظ نہیں کرتا،" جناب جوزف نے اتفاق ظاہر کیا۔ وہ بھی اب اپنے دو درجن پیڑوں سے خاصی رقم کمانے لگا تھا۔ لیکن اگلا قدم اٹھانے سے گھبراتا تھا؛ یعنی اپنی دس ایکڑ زمین پر اگے ربڑ کے درختوں کو کاٹ ڈالنے سے، جن سے ابھی اگلے بیس برس تک مائع ربڑ حاصل ہو سکتی تھی۔

اور تو اور، پادری کے خطبوں تک میں سبز انقلاب کا تذکرہ آنے لگا تھا۔ جب نمازی لوگ عُشر ادا کرنے میں تساہل کرتے تو وہ ربڑ کے پیڑوں کو بلوط کے بے پھل کے درختوں سے تشبیہ دیتا جس کے زیرِ اثر اور لوگ اپنے ربڑ کے پیڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔

افاچن نے جو پہلے پودے آس پاس کے علاقے میں فروخت کیے تھے وہ اب پھل دینے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ان دیہاتی سڑکوں پر کوکو کی بوریوں سے لدی بیل گاڑیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہر شام کوکو کے بیجوں کو شہر کے کلکشن سنٹر تک پہنچانے کے لیے گاؤں کے بازار میں ٹرک آیا کرتے۔

کنات جوزف پہلا بڑا کسان تھا جس نے اپنے ربڑ کے پیڑ کاٹے۔ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے ماہرین سے مشورہ کیا: "فرض کیا میں نے اپنے سارے ربڑ کاٹ دیے۔ پھر کوکو کا بھاؤ گر گیا۔ اور میرے پاس بیچنے کے لیے ربڑ بھی نہیں۔ پھر میں کیا گلی میں بھیک مانگوں گا، افاچن؟"

"نا نئیں!" افاچن بولا۔ "اگر یہ پودا امریکا سے آ رہا ہے تو اس کا ضرور اچھا مستقبل ہو گا۔ اس بدبخت ربڑ سے تو اچھا ہی ہو گا۔"

"تمھیں کیسے پتا ہے؟" کنات جوزف نے اپنے تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے سوال کیا۔

"کیوں کہ امریکی کچے تیل سے ربڑ بناتے ہیں۔ بالکل سستا۔ اور یورپ والے؟ کچے تیل سے۔ روسی اور جاپانی؟ کچے تیل سے۔ گوبر جتنا سستا۔ تو پھر ہماری ربڑ کی چادروں کا کیا مستقبل رہا؟"

یہ استدلال افاچن کو میرا ہی سکھایا ہوا تھا۔ کنات جوزف اس پر افاچن سے اس قدر متاثر ہو

کہ اس نے روزنا کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کرنے کی غرض سے رشتہ ساز کو بلوا بھیجا۔

روزنا کے انچاسویں تیرتے ہوئے خط سے اوناچن کو یہ رپورٹ ملی کہ اس کے ابا نے اپنی پوری زمین پر ربڑ کی جگہ کوکو اگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اس کے لیے درکار دس ہزار پودوں کا آرڈر اوناچن کو نہیں ملے گا کیوں کہ یہ پودے ابا نے خود اگا لیے ہیں۔ روزنا نے خط کے آخر میں اوناچن سے شادی کرنے کا وعدہ کیا بشرطے کہ وہ کار خرید لے اور اسے ہر سنیچر کو سنیما اور ہر اتوار کو گرجا گھر لے جانے کا عہد کرے۔ کار خریدنے کے لیے اوناچن کو تین سال تک بچت کرنی پڑی۔ گر اس نے زیادہ بڑے قطعے میں کوکو کی کاشت کی ہوتی تو یہ منزل جلد آ جاتی۔ اس کے پاس اور زمین نہ تھی۔ اور والیہ ماما ان رقموں کو نکالنے پر آمادہ نہ تھی جو کہا جاتا تھا کہ اس نے مٹی کے پُراسرار مرتبانوں میں رکھ رکھی ہیں۔

انیس سو ستتر۔ میں باقی اسکول پاس کر کے شہر چلا گیا تا کہ کیرالہ یونیورسٹی میں معاشیات کی تعلیم حاصل کر کے بنی نوع انسان کے کسی کام آ سکوں۔ کنات جوزف نے اپنے تمام ربڑ کے پیڑ کاٹ ڈالنے والے پہلے بڑے کاشت کار ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ پورے دس ایکڑ۔ تب اچانک عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ میں نے اخباروں میں پڑھا کہ عرب ملکوں نے امریکا اور یوروپ کو تیل کی سپلائی بند کر دی ہے اور ربڑ کی قیمتیں چڑھنے لگی ہیں۔

ادھر ہماری طرف، کوکو کے واحد خریدار نے اچانک کوکو کی قیمت بیس روپے فی کلو گرام سے کم کر کے پچیس روپے فی ٹرک کر دی۔

نتائج کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اوناچن روزنا کے نام ایک تیرتا ہوا خط بھیجنے کی فکر میں تھا تا کہ اسے کار خریدنے کے منصوبے کے بارے میں تسلی دے سکے، اسے بتا سکے کہ کوکو کی قیمتیں ایک بار پھر چڑھیں گی، اور یہ کہ اس کا باپ گھر میں برتن توڑنے کا سلسلہ ختم کر دے گا، اور یہ کہ یہ بخت ربڑ کی قیمتوں کو ایک بار پھر خاک چاٹنی ہو گی، اور آخر میں یہ کہ وہ روزنا سے کسی جہیز کے بغیر شادی کرنے کو تیار ہے جو اب اس کے ابا کی خواہش تھی۔

چوں کہ خط بہہ کر بہاؤ کی مخالف سمت میں نہیں جا سکتا تھا، اس لیے اوناچن دریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پیچھے تک گیا اور وہاں سے کوکو کے ایک زرد پتے پر رکھ کر خط کو پانی میں چھوڑ دیا۔

اوناچن نے خط کو آہستہ آہستہ تیر کر رونا کے پستانوں تک پہنچتے دیکھا جو دھیرے دھیرے صابن کے جھاگ سے باہر آ رہے تھے۔ وہ غصے میں تھی۔ ہاتھ کے ایک ہی وار سے اس نے خط کو پانی میں غرق کر دیا۔ اوناچن دریا کنارے کی ریت پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

پھر چاکلیٹ کمپنی نے کوکو کو مفت بھی اٹھانے سے انکار کر دیا۔ بازار میں ٹرک آنے بند ہو گئے۔ ایک کاشت کار نے گاڑی بھر کوکو دریا میں پھینک دی۔ کوکو کے ڈوڈے دریا کی سطح پر ایک زرد کشتی کی طرح تیرنے لگے۔ اخباروں نے لکھا کہ سبز انقلاب بھارت میں اتنا کامیاب رہا ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی اس کے بارے میں ایک کتاب چھاپنے والی ہے۔ بڑی بڑی سرخیوں میں بتایا گیا کہ ربڑ کا بھاؤ دو مہینوں میں چوگنا ہو گیا ہے، اور پھر چاکلیٹ کی جنگ چھڑ گئی۔

اوناچن کو پہلی بار اندھیرے میں پیٹا گیا۔ وہ گھر اس حالت میں پہنچا کہ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کس کا کام ہے۔ اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ کسی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

اگلے ہفتے اوناچن ایک گڑھے میں بے ہوش پایا گیا۔ کچھ اور دشمنوں نے اس پر اندھیرے میں حملہ کیا تھا۔ اس بار بھی کسی کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ صرف خاموشی سے بھری شاخوں اور خالی ہاتھوں سے دھنائی کی گئی تھی۔ جب اوناچن بستر سے اٹھنے کے قابل ہوا تو پادری سے مدد مانگنے گرجا گھر گیا۔ گرجا گھر کے ٹھیک سامنے لوگوں کی ایک بھیڑ نے اس کا راستا روکا۔ اور انھوں نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ اس بار تو اندھیرا بھی نہیں تھا۔ بھیڑ میں شامل ہر شخص نے اوناچن کی پٹائی میں حصہ لیا، سوائے تین شریف کسانوں کے، جن میں سے ایک کناٹ جوزف تھا۔

بھیڑ نے اسے لہولہان کر کے سڑک پر پڑا چھوڑ دیا۔ اوناچن نے سینٹ جارج کا واسطہ دے دے کر مدد کے لیے پکارا۔ تینوں شریف کسان اس کی مدد کے لیے بڑھے۔

ان میں سے دو نے اوناچن کو اوپر اٹھایا۔

"اور یہ ہے تمھاری ماں کے لیے آخری تحفہ!" کناٹ جوزف نے چیخ کر کہا اور اوناچن کی ناف میں ایک زوردار لات ماری۔ "اور ایک اور، میری بیٹی سے محبت کا کھیل کھیلنے کے لیے۔" یہ چوٹ اس سے بھی زیادہ زبردست تھی۔ روث نے اپنے ابا کی برتی اور فرنیچر توڑنے کی عادت کی شکایت بلاوجہ نہیں کی تھی۔

تینوں شریف کسانوں نے افاچن کو سینٹ جارج کے اس مشہور مجسمے کے قدموں میں چھوڑا جس میں انھیں ایک اژدہے کو ہلاک کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اس پورے سال تیڈانا ڈ میں چاکلیٹ کی جنگ جاری رہی۔ میرے ابا نے مجھے خط میں ہدایت کی کہ اس بار چھٹیوں میں گاؤں نہ آؤں کیوں کہ افاچن کی اقتصادی مشاورت کے سلسلے میں مجھے بھی پیٹا جا سکتا ہے۔

راتوں کو افاچن کے خلاف خوب نعرے لگائے جاتے۔ پھر ایک رات یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ روثا نے اس کے نام آخری تیرتا ہوا خط بھیجا جس میں اسے بڑے پیار سے ایک مفت مشورہ دیا گیا تھا۔ افاچن نے اس مشورے پر عمل کیا۔ اس رات، تمام گاؤں والوں کی نظروں کے سامنے، اس نے اپنے تمام کوکو کے پیڑ کاٹ کر ڈھیر کر دیے اور ڈھیر پر کیروسین چھڑک کر آگ لگا دی۔ وسعت سر کا بیان ہے کہ افاچن کو آگ بار بار سلگانی پڑ رہی تھی کیوں کہ اس کے آنسو اسے بجھا بجھا دیتے تھے۔

جلد ہی دوسرے سبز انقلابیوں نے بھی اس عمدہ مثال پر عمل کیا۔ انھوں نے درختوں کو، جنگا نے پھلوں سمیت، کاٹ کر بکریوں اور گایوں کے آگے ڈال دیا۔

اس کے بعد افاچن کو کسی نے نہیں پیٹا، بلکہ اسے ایک لقب سے بھی نوازا گیا: چاکلیٹ۔ کوکو کے پیڑ کاٹنے کے بعد چاکلیٹ افاچن نے پہلا کام یہ کیا کہ صاف کی ہوئی زمین پر سینٹ جارج کے لیے کیلے کا ایک پودا لگایا۔ پھر اس نے اسی جانے پہچانے ربڑ کے پودے کی کاشت دوبارہ شروع کر دی۔ اس بار یہ پودے جزیرہ نمائے ملایا کی ریسرچ لیباریٹریوں سے لائے گئے تھے۔

چاکلیٹ کی جنگ ختم ہونے کے کئی برس بعد ہمیں اس کہانی کے اصل ولین کا پتا چلا: یہ تھا کالی زبان والا محمد قادر۔

**

تھامس پالاکیل (Thomas Palakeel) ہندوستان کی ریاست کیرالا کے رہنے والے ہیں اور آج کل ایک امریکی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں کہانیاں اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور ان کا ناول The Rock Sutra جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ ان کی کہانی Chocolate War جس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے، دہلی سے نکلنے والے انگریزی ادبی رسالے Yatra کے شمارہ ۵ (۱۹۹۵) میں شائع ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

علمی و ادبی کتابی سلسلہ

تحریر

ترتیب: رفیق احمد نقش

زیر اہتمام: ادارہ تحریر، ۳۸۰-ڈی، سیٹلائٹ ٹاؤن، میرپورخاص ۶۹۰۰۰

رابطے کے لیے: اے-۸۷، بلاک این، شمالی ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰

ترقی پسند فکر کا ترجمان

علمی اور ادبی کتابی سلسلہ

ارتقا

ادارہ: حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید

۸، الاحمد مینشن، بلاک ۱۳ بی، گلشن اقبال، یونیورسٹی روڈ، کراچی

سہ ماہی

بادبان

مدیر اعزازی: ناصر بغدادی

E-2, 8/14 سمار اسکوائر، بلاک ۱۴، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

سہ ماہی

رجحانات

مدیر: طاہر اسلم گورا

۲۵ سی، لوئر مال، لاہور

سہ ماہی

تشکیل

مدیر: احمد ہمیش

2-J. 8/6 عروج کلوننگ بلڈنگ، ناظم آباد، کراچی

Scanned with CamScanner

کمبوڈیا کی بدنام زمانہ اور سفاک خون ریز لال کھمیر (Khmer Rouge) حکومت، جو ۱۹۷۵ سے ۱۹۷۹ تک قائم رہی، جزوی طور پر واقعات کے اس سلسلے کا نتیجہ تھی جو جنوب مشرقی ایشیا، بالخصوص ہند چینی کے خطے، میں نو آبادیاتی طاقتوں کا قبضہ ختم ہونے کے بعد امریکا کی وحشیانہ مداخلت سے شروع ہوئے تھے۔ ویت نام کے خلاف امریکا کی جنگ کے دوران خطے کے دوسرے ملکوں میں جاری کمیونسٹ تحریکوں کو بھی کچلنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۷۰ میں کمبوڈیا میں جنرل لون نول کی قیادت میں امریکا نواز آمریت قائم کر دی گئی اور اس طرح شہزادہ نورودوم سیہانوک کے اقتدار کا خاتمہ ہوا جسے فرانسیسیوں نے بادشاہ سونیوانگ کے مرنے کے بعد ۱۹۴۱ میں تخت پر بٹھایا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف کمپوچیا نے سیہانوک کے حامیوں کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنا کر لون نول حکومت کے خلاف خانہ جنگی شروع کی جس میں ویت نامی کمیونسٹوں نے بھی حصہ لیا۔ ۱۹۷۳ میں پیرس مذاکرات کے نتیجے میں امریکا اور ویت نام کے درمیان جنگ بندی ہوئی جس کی شرائط کے تحت ویت نامی فوجیں کمبوڈیا سے نکل گئیں، اور امریکی فوجوں نے کمبوڈیا پر شدید بمباری کی جس سے لون نول حکومت کے خلاف ہونے والی پیش قدمی رک گئی۔ تاہم، ۱۹۷۵ میں لون نول کی فوجیں شکست کھا گئیں اور ۱۷ اپریل کو ملک کے بڑے شہروں پر متحدہ محاذ کی گوریلا فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ دیہات پہلے ہی سے ان کے کنٹرول میں تھے۔

یہ قبضہ اس جابرانہ اور خون خوار تسلط کا آغاز تھا جسے ایک فرانسیسی صحافی نے خود نسل کشی (auto-genocide) کا نام دیا۔ یہ تاریخ کی آگے کی جانب حرکت کے خلاف ایک نہایت منظم جنگ تھی جس کی مثال دنیا نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ قبضے کے ایک ہفتے کے اندر تمام شہروں کو پوری آبادی سے خالی کرا لیا گیا اور اس آبادی کو دیہی علاقوں میں زراعت کے کام پر لگا دیا گیا۔ نقدی، بینک، مالیاتی نظام، بازار، ڈاک خانے کے نظام، اخبارات، اور ذاتی جائیداد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تمام اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور بودھ پاٹھ شالائیں بند کر دی گئیں۔ شخصی آزادی کو اس قدر محدود کر دیا گیا کہ ہر آدمی انقلابی تنظیم کا سونپا ہوا کام انجام دینے کا پابند ہو گیا؛ سفر، خط و کتابت، خبروں کا تبادلہ، شخصی آرائش اور فرصت کے مشاغل ممنوع قرار دے دیے گئے۔ احکام کی خلاف ورزی کی سزائیں نہایت سخت تھیں۔ جنوری ۱۹۷۶ میں متحدہ محاذ ختم کر کے ملک کو 'ڈیموکریٹک کمپوچیا' کا نیا نام دے دیا گیا، اور نئے آئین کے تحت انتخابات کرائے گئے۔ ان نام نہاد انتخابات میں شہروں سے منتقل کی جانے والی آبادی کو رائے دینے کا حق نہ تھا۔ ان انتخابات کے نتیجے کے طور پر اعلان کیا گیا کہ 'پول پاٹ' نامی ربر کے کھیت کا مزدور انقلابی حکومت کا سربراہ منتخب ہوا ہے۔ یہ راز ستمبر ۱۹۷۷ میں پول پاٹ کے دورۂ چین کے موقعے پر کھلا کہ وہ ایک سابق اسکول ٹیچر سالوتھ سار ہے جو ۱۹۶۳ سے زیرزمین کمیونسٹ پارٹی

Scanned with CamScanner

جناب کمبوچیا کی سنٹرل کمیٹی کا سیکرٹری رہا تھا۔

لال کھمیر کی اس وحشی حکومت کے اقدامات نے ایک تخمینے کے مطابق دس لاکھ سے زائد لوگوں کی جان لی۔ ہر خفیہ اور پُرتشدد تنظیم کی طرح کمبوڈیا کی انقلابی تنظیم بھی اکثر لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ دارالحکومت نوم پنھ (Phnom Penh) کے ایک سابق اسکول کی عمارت، جسے S-21 کا نام دیا گیا تھا، حکومت کے مخالفوں پر تشدد کے لیے وقف تھی۔ اس عمارت میں بیس ہزار سے زائد افراد کو بدترین تشدد کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔ ۱۹۷۹ میں ویت نامی فوج کے ہاتھوں لال کھمیر کی حکومت کے خاتمے کے بعد اس عمارت کی فائلوں سے چار ہزار "اعترافات" برآمد ہوئے۔

امیتاو گھوش کا مضمون "کمبوڈیا میں رقص"، جسے آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے، کمبوڈیا میں پیش آنے والے انہیں واقعات کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ مضمون لندن سے نکلنے والے سہ ماہی رسالے "گرانٹا" کے شمارہ ۴۴ (۱۹۹۳) میں Dancing in Cambodia کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ "آج" کے شمارہ ۱۹ میں امیتاو گھوش کا ایک اور مضمون "مسز گاندھی کی بدروحیں" شائع ہو چکا ہے۔

امیتاو گھوش جو معاصر انگریزی فکشن کی ایک معروف شخصیت ہیں، ۱۹۵۶ میں مشرقی بنگال میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ سماجی بشریات میں ڈی فل کرنے کے لیے آکسفورڈ چلے گئے۔ اس علم کی تحقیق کے دوران انھوں نے چند سال مصر کے شہروں اور دیہات میں گزارے۔ امیتاو گھوش کا پہلا ناول The Circle of Reason ۱۹۸۶ میں شائع ہوا۔ اس کے فرانسیسی ایڈیشن کو بہترین غیر ملکی ناول کا میدیسی اعزاز ملا۔ ان کا دوسرا ناول The Shadow Lines ۱۹۸۸ میں چھپا اور اس نے ہندوستان کی ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ حاصل کیا۔ گھوش کی تیسری کتاب In an Antique Land، جو ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی، دیگر موضوعات کے علاوہ ان کے قیام مصر کے تجربات پر بھی محیط ہے، اگرچہ اس کا بنیادی موضوع برصغیر کے تہذیبی مسائل ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف Calcutta Chromosom نامی ایک ناول ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

امیتاو گھوش

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کمبوڈیا میں رقص

مئی ۱۹۰۶ کی ۱۰ تاریخ کو سہ پہر دو بجے ایک فرانسیسی بحری جہاز، امیرال کیرساں، نوم پنہ کے شاہی محل کی کلاسیکی رقاصاؤں اور سازندوں کے سو نفر کے طائفے کو لے کر سائیگان کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ جہاز کی منزل مارسائی کی فرانسیسی بندرگاہ تھی؛ اس شہر میں اس طائفے کو ایک بڑی نوآبادیاتی نمائش میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کمبوڈیا کا کلاسیکی رقص یوروپ میں پیش کیا جانے والا تھا۔

اسی جہاز میں کمبوڈیا کا چھیاسٹھ سالہ فرماں روا، بادشاہ سیسوواتھ، کئی درجن شاہ زادوں، درباریوں اور اہلکاروں کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ بادشاہ، جس کی تاج پوشی صرف دو برس قبل ہوئی تھی، کئی بار فرانس کے سفر کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا، اور یہ سفر اس کے لیے اپنی زندگی بھر کی آرزو کی تکمیل کی حیثیت رکھتا تھا۔

امیرال کیرساں ۱۱ جون کی صبح مارسائی میں لنگرانداز ہوا۔ بندرگاہ پرتجسس تماشائیوں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی؛ شہر کی ٹرامیں صبح سات بجے سے لوگوں کو گودی تک پہنچانے میں مصروف رہی تھیں جہاں بادشاہ اور اس کے ساتھ آنے والے طائفے کا استقبال کیا جانا تھا۔ ہجوم

Scanned with CamScanner

اس قدر زیادہ تھا کہ گھڑسوار پولیس کا ایک دستہ اور نیم فوجی محافظوں کے دو بریگیڈ لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے تعینات کرنے پڑے تھے۔

ہجوم کو رقاصاؤں کی پہلی جھلک نو بجے کے کچھ بعد دکھائی دی جب جہاز کہر میں سے نمودار ہو کر گودی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ متعدد نوجوان لڑکیوں کو جہاز کے پل اور بالائی عرشے پر کھڑکیوں کے درمیان حرکت کرتے اور حیرت اور استعجاب میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے دیکھا گیا۔

چند منٹ بعد سہ رنگ جھنڈوں سے سجا ایک گینگ پلینک جہاز سے جوڑ دیا گیا۔ بہت جلد بادشاہ خود عرشے پر نمودار ہوا ـــــ ایک خوش مزاج، مسکراتا ہوا شخص جو ٹیل کوٹ، ہیرے جڑے فیلٹ ہیٹ اور سیاہ ریشم کے بنے کمبوڈین وضع کے وصوتی نما "سمپوٹ" میں ملبوس تھا۔ اُن لوگوں کو جنھیں بادشاہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا، وہ پھُرتیلا، بلکہ مسرت سے بے قرار، معلوم ہوتا تھا؛ وہ درمیانے قد کا آدمی تھا، اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور دل کا حال ظاہر کرنے والی تھیں اور ہونٹ بھرے بھرے تھے جن کے اوپر مونچھوں کی باریک سی لکیر تھی۔

بادشاہ سیسوواتھ گینگ پلینک سے اترا تو تین خادم اس کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہے تھے؛ ایک نے منقش تقریباً سگریٹ کیس اٹھا رکھا تھا، دوسرے نے جلتی ہوئی بتی والا سنہری لیمپ اور تیسرے نے کنول کی شکل کا اگال دان۔ بادشاہ نے مارسائی کے لوگوں کو فوراً اپنا گرویدہ کر لیا۔ بندرگاہ تالیوں اور حیر مقدمی نعروں کے شور سے گونج اٹھی؛ اسے ایک خصوصی بگھی میں لے جایا گیا اور شہر کے سرکاری علاقے میں واقع اپارٹمنٹس تک پہنچتے ہوئے راستے بھر ہجوم اس کا تالیاں بجا کر استقبال کرتا رہا۔

اس دوران، بادشاہ کے بندرگاہ سے روانہ ہونے کے چند منٹ کے اندر اندر، ہجوم میں سے کچھ لوگ گینگ پلینک پر چڑھ کر جہاز پر پہنچ گئے تاکہ رقاصاؤں کا قریب سے نظارہ کر سکیں۔ مارسائی کے مقامی اخبار گزشتہ کئی ہفتوں سے ان کے بارے میں چھوٹی چھوٹی لذت انگیز اطلاعات شائع کرتے رہے تھے؛ بتایا گیا تھا کہ یہ رقاصائیں بچپن ہی میں محل میں پہنچا دی جاتی ہیں اور پھر تمام عمر محل ہی میں گزارتی ہیں؛ یہ کہ ان کی ساری زندگی شاہی خاندان کے ارد گرد بسر ہوتی ہے؛ یہ کہ ان میں سے بہت سی بادشاہ کی داشتائیں ہیں اور اس کے بچوں کی ماں بھی بن چکی ہیں؛ اور یہ کہ ان میں

Scanned with CamScanner

کسی ایک نے فرانس کا یہ سفر اختیار کرنے سے پہلے کبھی محل سے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ کمبوڈیا سے گزرنے والے یوروپی سیاح نوم پنہ کے شاہی محل کی دیواروں کے عقب میں رہنے والی ان رقاصاؤں کے فن کا مظاہرہ دیکھنے کی دعوت حاصل کرنے کی سعی کوششیں کیا کرتے تھے، اور اب یہ رقاصائیں مارسائی میں تھیں، پہلی بار یوروپ کی سرزمین پر۔

رقاصائیں جہاز کے فرسٹ کلاس کے عرشے پر تھیں؛ بھاگتی دوڑتی، اچھلتی کودتی، پُرجوش انداز میں کھیلتی وہ بیک وقت ہر جگہ موجود معلوم ہوتی تھیں، اور ان کے پیر پالش کی ہوئی لکڑی پر ہر طرف پھسل رہے تھے۔ پورے عرشے پر ان کی متحرک ٹانگیں ایک غبار کی طرح رقصاں تھیں ــــ کمسن لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کی ٹانگیں، 'حسین، پُرکشش ٹانگیں' ــــ کیوں کہ تمام رقاصاؤں نے رنگ برنگے سمپوٹ پہن رکھے تھے جو ان کے گھٹنوں سے ذرا نیچے ختم ہو جاتے تھے۔

دیکھنے والے انھیں دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ غالباً وہ دبیز نقابوں والی، اور جنسی کشش سے بھری سلومیوں کو دیکھنے کی توقع کر رہے تھے؛ وہ ایسی دُبلی پتلی اور کھیل کود کی شائق پُرتیلی لڑکیوں کے نظارے کے لیے تیار نہ تھے جو انھیں امپیرال کیرساں پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اور صرف وہی نہیں، یہ رقاصائیں باقی یوروپ کی توقعات سے بھی مختلف تھیں۔ ایک مبصر نے بعد میں لکھا: "ان کے سخت اور چھوٹے کٹے ہوئے بال، ان کے دبلے پتلے جسم، ان کی لڑکوں کی سی پتلی اور مضبوط ٹانگیں، بچیوں جیسے بازو اور ہاتھ ــــ وہ دیکھنے میں کسی بھی صنف سے غیر متعلق لگتی تھیں۔ وہ کچھ کچھ بچی، کچھ کچھ قدیم زمانے کا سورما اور کچھ کچھ عورت لگتی تھیں۔"

بادشاہ کی سب سے بڑی بیٹی، شہزادی سُوسپادی، ان رقاصاؤں کے درمیان شاہانہ انداز سے بیٹھی تھی اور کبھی شفقت، کبھی ملامت، کبھی محبت اور کبھی سخت گیری کی نگاہوں سے ان کی نگرانی کر رہی تھی۔ سنہری بھورے رنگ کا سمپوٹ اور ہلکے بادامی رنگ کی کُرتی پہنے اس رعب کی عورت نے مارسائی کے لوگوں پر بجلی کا سا اثر کیا۔ وہ اس کی وضع کے ہر پہلو کو مسحور ہو کر تکتے رہے: پان کے داغ لگے دانت، سینے پر سجے تمغے، سنہری کڑھائی والی جوتیاں، ہیروں کے بروچ اور سیاہ ریشمی اسٹاکنگز۔ اس کا انداز، ایک صحافی کے کہنے کے مطابق، بیک وقت رعب دار اور طفلانہ تھا، اس کی نگاہ سیدھی اور بے ریا تھی، وہ ہر شے میں دل چسپی لیتی ہوئی اور ہر

Scanned with CamScanner

شے سے بے نیاز لگتی تھی، اس کا ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھنے اور پنڈلیاں جوڑ کر بیٹھنے کا انداز بالکل مردوں جیسا تھا، بلکہ لباس کو چھوڑ کر اس کی ظاہری ہیئت کی ہر بات ایک خاص مرد کی یاد دلاتی تھی ـــــ نپولین کے دق زدہ بیٹے، رومانی اور لاابالی، ڈیوک آف رائکشاٹ لیگلوں کی۔

اچانک شہزادی کا یہ ساکت انداز بدل گیا جس پر ہجوم کو بہت خوشی ہوئی۔ چند مقامی عورتیں، ایک دس سالہ بچے کے ساتھ، عرشے پر نمودار ہوئیں اور تمام رقاصاؤں کے ساتھ ساتھ شہزادی بھی دوڑ کر ان عورتوں کے لباس کی تحسین کرنے اور چھوٹے لڑکے کو دیکھ کر خوشی کے نعرے بلند کرنے لگی۔

صحافیوں نے اس موقعے سے فوراً فائدہ اٹھایا۔ "کیا آپ کو ایسی عورتیں پسند آئیں؟" انھوں نے شہزادی سے سوال کیا۔

"اوہ! کس قدر پیاری ہیں یہ، کتنی خوب صورت!" اس نے جواب دیا۔

"اور ان کے کپڑے؟ اور ہیٹ؟"

"وہ بھی انھیں کی طرح پیارے ہیں۔"

"کیا آپ خود بھی ایسا لباس پہننا چاہیں گی؟"

"نہیں!" شہزادی نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "نہیں! مجھے ایسے کپڑوں کی عادت نہیں۔ اور مجھے ان کو پہننے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ لیکن یہ بہت خوب صورت ہیں... بہت خوب صورت..."

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اس پر ایسا تاثر چھا گیا جو دیکھنے والوں کو اُداس اور پُرحسرت معلوم ہوا۔

۳

شہزادی سُومپھادی اور بادشاہ سیسوواتھ دونوں سے واقف وہ واحد ہستی جس سے میری ملاقات ہوئی، چیا ساہی نامی رقاصہ تھی۔ اسے کمبوڈیا کے عظیم ترین رقاصوں میں شمار کیا جاتا تھا اور

Scanned with CamScanner

ایک قومی سرمایہ سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ پول پاٹ کے بھائی کی بیوی تھی۔

پہلی بار اس کی جانب میری توجہ اس وقت دلائی گئی جب میں نوم پنہ کے فائن آرٹس کے اسکول میں گھوم رہا تھا؛ یہ اسکول بہت سی عمارتوں کا ایک اُلجھا ہوا مجموعہ ہے اور واٹ نوم کے اس مقام سے زیادہ دور نہیں جہاں اقوامِ متحدہ کی بیس ہزار نفر پر مشتمل نفاذِامن کی فوج کا ہیڈکوارٹر ہے۔ یہ جنوری کا مہینا تھا، اور اقوامِ متحدہ کی کمبوڈیا میں عبوری مدت کے لیے قائم کی گئی ایجنسی (UNTAC) کے تحت کرائے جانے والے ملک گیر انتخابات میں صرف چار مہینے رہ گئے تھے۔ نوم پنہ عارضی طور پر دنیا کا سب سے زیادہ کاسموپولیٹن شہر بن گیا تھا جس کی سڑکیں ٹریفک کے اعتبار سے ایک ڈراونے خواب کی شکل اختیار کر گئی تھیں اور جہاں انٹاک کی سفید لینڈ کروزر گاڑیاں اسکوٹروں، موپڈوں اور سائیکل رکشاؤں کے روزمرہ ہجوم کو یوں کاٹتی ہوئی گزرا کرتی تھیں جیسے سمندر میں ڈولتی ہوئی حیات کی ابتدائی شکلوں کے درمیان سے کوئی عظیم الجثہ وہیل گزر رہی ہو۔

اس کثیر قومی ٹریفک اور فائن آرٹس کے اسکول کے درمیان کوڑے کرکٹ کے بہت بڑے ڈھیر واقع تھے جنھیں عرصے سے اٹھایا نہیں گیا تھا، اور ان کے علاوہ جھونپڑیوں اور کچے مکانوں پر مشتمل کئی بستیاں قائم تھیں۔ اسکول کا چاردیواری سے گھرا احاطہ کچھ عجیب طور سے خودکفیل معلوم ہوتا تھا اور اس کے غاروں جیسے ہال اور نامکمل تعمیر والے کلاس روم کسی بڑے سے ٹی وی اسٹوڈیو کی طرح شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے بھرے رہتے تھے۔

مجھے نوم پنہ پہنچے زیادہ دن نہ گزرے تھے جب میری چیا سامی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسکول کے وسیع ٹریننگ ہال کی ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک مختصر جسامت کی عورت تھی جس کی شخصیت میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جو غیرمعمولی حُسن کے اعتماد سے آتا ہے۔ وہ پنڈلیوں تک لمبے اسکرٹ میں ملبوس تھی، اور اس کے بھورے بال چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً چالیس لڑکوں اور لڑکیوں کی کلاس کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ انھیں اپنی مختلف جسمانی مشقوں میں مصروف دیکھ رہی تھی اور ان پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کے باعث اس کے نرم، گول چہرے پر کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھتی اور کسی رقاص کا بازو سیدھا کرتی یا پیٹ کو دبا کر اندر کرتی؛ وہ رقص سیکھنے والوں کے جسموں کو اپنے ہاتھ کے لمس سے یوں ڈھال رہی تھی جیسے کوئی

سنگ تراش اپنے بنائے ہوئے مجسمے کو خدوخال دے رہا ہو۔

اُس وقت مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ چیا سامی شہزادی سوسپھادی سے واقف رہی ہو گی یا نہیں۔ مجھے شہزادی اور اس کے باپ میں دل چسپی یوں پیدا ہوئی کہ میں نے ان کے ۱۹۰۶ کے سفرِ یوروپ کا حال پڑھا تھا، اور میں ان کے بارے میں مزید جاننے کا خواہش مند تھا۔

کلاس ختم ہونے پر جب میں نے شہزادی سوسپھادی کے بارے میں دریافت کیا تو چیا سامی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پہلے مجھ پر اور پھر اُس طالبِ علم پر نگاہ ڈالی جو میری ترجمانی کر رہا تھا، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں نے یہی نام لیا ہے۔ میں نے اُسے یقین دلانے کے لیے دُہرایا: ہاں، میں واقعی شہزادی سوسپھادی ہی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، شہزادی سیسووتھ سوسپھادی کے بارے میں۔

وہ ایسے پُرشوق اور کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکرائی جیسے لوگ اپنی محبوب خالہ کو یاد کرتے ہوئے مسکراتے ہیں۔ ہاں، بے شک، وہ شہزادی سوسپھادی سے واقف رہ چکی ہے، اس نے بتایا۔ جب اپنے بچپن میں وہ رقص سیکھنے کی غرض سے محل میں داخل ہوئی تو شہزادی سوسپھادی ہی رقاصوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی؛ بلکہ کچھ عرصے تک تو اس کی پرورش بھی شہزادی ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی...

چیا سامی سے میری دوسری ملاقات اس کے گھر پر ہوئی۔ وہ نوم پنہ شہر کے تیزی سے پھیلتے ہوئے بیرونی محیط پر پوچنتانگ ایرپورٹ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک ایسے علاقے میں رہتی ہے جو بیشتر زرعی زمین پر مشتمل ہے اور جہاں اکا دکا مکان کچی سڑک کے کنارے بنے ہوئے ہیں۔ اپنی جس دوست کو میں نے ترجمانی کی غرض سے ساتھ آنے پر آمادہ کیا تھا، اسے یہ جگہ فوراً ہی ناپسند ہوئی۔ سہ پہر خاصی گزر چکی تھی اور اسے اندھیرے میں ان سڑکوں پر گاڑی چلا کر واپس جانے کا خیال کچھ زیادہ خوش گوار نہ لگا۔

میری دوست مولیکا، جو درمیانے درجے کی سرکاری اہلکار تھی، تیس بتیس سال عمر کی ایک پُروقار اور پُرکشش عورت تھی اور خاص کمبوڈین لوگوں کے انداز میں نہایت مدھم آواز میں بولتی تھی۔ وہ سرکاری وظیفے پر کچھ عرصے آسٹریلیا میں پڑھ چکی تھی اور ان تمام پیشہ ور ترجمانوں کے مقابلے میں جن سے میرا واسطہ پڑا تھا، معانی کی تہہ داری اور محاورے کے زیادہ بہتر احساس کے ساتھ

انگریزی بولتی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر مجھے چیا ساہی سے ملاقات کرنی ہے تو مولیکا ہی میری ترجمان ہو گی۔ لیکن مولیکا کو آمادہ کرنا خاصا مشکل کام ثابت ہوا: وہ شہر کے مرکزی علاقے سے باہر قدم نکالنے سے بہت ڈرنے لگی تھی۔

کچھ عرصے پہلے وہ اپنی ایک دوست عورت کے ساتھ، جس کا شوہر اقوام متحدہ کا ملازم تھا، گاڑی میں سوار ہو کر کہیں جا رہی تھی کہ ایک مصروف چوراہے کے قریب چند سپاہیوں نے اس کی گاڑی روک لی۔ وہ 'ریاست کمبوڈیا' کی وردی پہنے تھے، یعنی اُس دھڑے کی جو آج کل کمبوڈیا کے بیشتر علاقے پر حکمران ہے۔ "میں بھی حکومت کی ملازم ہوں،" اس نے انھیں بتایا۔ "ایک اہم وزارت میں کام کرتی ہوں۔" انھوں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا؛ انھیں رقم درکار تھی۔ اس کے پاس زیادہ رقم نہ تھی؛ صرف چند ہزار ریئل (riels) تھے۔ انھوں نے سگریٹ مانگے: وہ بھی اس کے پاس نہ تھے۔ انھوں نے اسے گاڑی سے اترنے اور اپنے ساتھ ایک عمارت میں چلنے کو کہا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے ہی کو تھے کہ اس کی دوست نے مداخلت کی۔ آخرکار انھوں نے اسے جانے دیا: وہ عموماً اقوام متحدہ کے لوگوں کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ لیکن جب گاڑی روانہ ہوئی تو انھوں نے پیچھے سے چلا کر کہا: "ہم تمھاری تلاش میں رہیں گے۔ ہر بار تو انٹیک کے لوگ تمھارے ساتھ نہیں ہوں گے۔"

مولیکا خوف زدہ تھی، اور اس کا خوف بلاوجہ نہیں تھا۔ حکومت کے کم تنخواہ والے (اور تنخواہ سے محروم) سپاہی روز بروز بدمعاشی اور بے جواز تشدد کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے، میں ایک اسپتال میں گیا جو ایسے علاقے میں تھا جہاں سرکاری فوجیوں اور لال کھمیر (Khmer Rouge) کے گوریلا سپاہیوں کے درمیان جھڑپیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ اسپتال کے ہنگامی شعبے میں داخل مریض بیشتر بارودی سرنگوں کے یا لال کھمیر کے شیلوں کے زخمی ہوں گے۔ لیکن مجھے نصف درجن کے قریب عورتیں، جن میں سے چند کے ساتھ بچے بھی تھے، میلی چٹائیوں پر لیٹی ہوئی نظر آئیں۔ ان کے چہروں اور جسموں پر جابجا بارودی گولوں کے سیاہ زخم تھے۔ وہ سبزیاں بیچنے کی غرض سے ایک پک اپ میں سوار ہو کر قریب کے ایک بازار کی طرف جا رہی تھیں کہ راستے میں انھیں چند سرکاری فوجیوں نے روک لیا۔ فوجیوں نے ان سے پیسے مانگے؛ عورتوں نے انھیں کچھ رقم دی لیکن وہ ان کے مطالبے سے کم تھی۔

عورتوں کے پاس اور رقم نہ تھی، انھوں نے یہی فوجیوں سے کہہ دیا۔ فوجیوں نے اس وقت تو ٹرک کو گزر جانے دیا لیکن شام کو بازار سے واپسی پر پھر روک لیا۔ اس بار انھوں نے کوئی بات نہ کی؛ بس ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی ایک بارودی سرنگ کو آگ دکھا دی۔

اسپتال کے اس دورے کے چند ہفتے بعد میں چار کمبوڈین شہریوں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا اور ہم ملک کے شمال مغرب میں واقع ایک بہت کم آبادی والے علاقے کی ایک ٹوٹی پھوٹی، گرد آلود سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اچانک بندوق چلنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے نگاہ اٹھائی اور بالکل سامنے کچی سڑک کے بیچوں بیچ ایک فوجی کو کھڑے دیکھا۔ وہ بیشتر وردی پوش کمبوڈینوں کی طرح اٹھارہ بیس سال کا تھا، تار کا بنا گول سیاہ چشمہ پہنے تھا اور اپنا پیرہن ایم ٹی وی اسٹائل میں آگے کو نکالے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں گٹار نہیں بلکہ کلاشنکوف تھی اور وہ ہماری ٹیکسی کے بالکل سامنے کی زمین پر تڑاتڑ گولیاں برسا رہا تھا جس سے گرد و غبار کی ایک نازک لکیر اٹھ رہی تھی۔

ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے اپنا ایک بازو باہر نکالا اور اپنا بٹوا لہرایا۔ فوجی نے اس پر بظاہر کوئی توجہ نہ دی؛ وہ دانت نکالے جھوم رہا تھا، غالباً نشے میں تھا۔ جوں ہی میں سامنے کی سیٹ پر چونک کر سیدھا ہوا، اس کی رائفل کی نال آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہوئی یہاں تک کہ بالکل میرے ماتھے کی سیدھ میں آ گئی۔ کلاشنکوف کی نہ جھپکنے والی آنکھ کو گھورتے ہوئے میرے ذہن میں نہ معلوم کیوں دو نعرے چمک اٹھے جنھیں، جب میں اس فوجی کی عمر کا تھا، میں نے کلکتے کی دیواروں پر لکھا دیکھا تھا۔ ایک نعرہ تھا: 'طاقت بندوق کی نالی سے نکلتی ہے،' اور دوسرا: 'انڈوں کو توڑے بغیر آملیٹ نہیں بنایا جا سکتا۔' بہرحال کچھ دیر میں معلوم ہو گیا کہ اس فوجی کے ذہن میں اس وقت صرف پہلا نعرہ تھا۔

مولیکا نے ایسی اور بھی کہانیاں سن رکھی تھیں، لیکن نوم پنھ میں رہتے اور سرکاری ملازم کے طور پر کام کرتے ہوئے وہ خود کو اس دن تک نسبتاً محفوظ محسوس کرتی تھی جس دن اس کی گاڑی کو روکا گیا۔ اس واقعے نے اس کے اندر اس قسم کے خوف پیدا کیے جن کا وہ پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر تھی؛ اس واقعے نے بہت سے سوئے ہوئے ڈر جگا دیے تھے۔ ۱۹۷۵ میں، جب نوم پنھ پر لال کھمیر کا قبضہ ہوا، مولیکا صرف تیرہ سال کی تھی۔ اسے اس کے دور اور نزدیک کے تمام

رشتہ داروں کے ساتھ، جن کی تعداد چودہ تھی، شہر سے نکال کر صوبہ کمپونگ تھوم کے ایک لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ چند مہینے بعد اسے باقی لوگوں سے الگ کر کے کمبوڈیا کی وسیع و عریض جھیل تونلے ساپ کے کنارے واقع ایک مچھیروں کے گاؤں میں منتقل کر دیا گیا جہاں اگلے تین برس تک وہ مچھیروں کے ایک خاندان کی ملازمہ اور بچوں کی دائی کے طور پر کام کرتی رہی۔

اس عرصے میں اُس نے اپنے ماں باپ کو صرف ایک بار دیکھا۔ ایک بار اُسے لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کمپونگ تھوم کے قریب ایک گاؤں میں بھیجا گیا۔ وہ مچھلیوں کی ٹوکری لیے سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک اس نے نظر اٹھائی اور اپنی ماں کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ اس کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ اس نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا؛ اس ملاقات کی ہر تفصیل اس کے ایک بار بار دُہرائے جانے والے خواب سے ملتی جلتی تھی: گرم و خشک دیہات، سوکھے ہوئے پام کے پیڑ، اس کی ماں سڑک پر چھائے سُرخ غبار میں سے نکل کر سیدھی اُس کی طرف آتی ہوئی...

اس نے دوبارہ اپنی ماں کو ۱۹۷۹ سے پہلے نہیں دیکھا جب وہ ویت نامی حملے کے بعد نوم پنہ واپس پہنچی۔ اس نے کئی مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اپنی ماں اور دو بھائیوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کے ساتھ گھر سے ساڑھے تین سال پہلے نکلنے والے چودہ افراد میں سے دس مر چکے تھے، جن میں اس کا باپ، دو بھائی اور ایک بہن شامل تھے۔ اس کی ماں اُس رات کے بعد سے ایک قابلِ رحم اور دہشت زدہ وجود بن کر رہ گئی تھی جب مولیکا کے باپ کو کھیتوں میں طلب کیا گیا اور وہ وہاں سے کبھی واپس نہ آیا۔ مولیکا کا ایک بھائی کام کرنے کی عمر کو نہ پہنچا تھا؛ دوسرے نے اس ناقابلِ برداشت احساسِ جرم کی تاب نہ لا کر کہ لال کھمیر کی تفتیش کے دوران ایک کمزور لمحے میں اس کے منہ سے اس کے باپ کی شناخت کا راز فاش ہو گیا تھا، اپنے آپ کو ایک خود طلبیدہ قسم کے فالج کا شکار کر لیا ــــ اب وہ خود کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار سمجھتا تھا۔

مولیکا کا خاندان اُس سماجی گروپ سے تعلق رکھتا تھا جو انقلاب کے باعث سب سے زیادہ متاثر ہوا؛ یعنی شہری درمیانہ طبقے سے۔ وہ اصطلاحاً 'شہری لوگ' تھے، چناں چہ انھیں ریوڑ کی صورت میں ہانک کر دیہی مزدور کیمپوں میں پہنچا دیا گیا؛ ان کی زندگی کو تقویت دینے والے تمام اداروں اور علم کی شکلوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا ــــ عدالتی نظام کو لپیٹ دیا گیا، باضابطہ طب کی

Scanned with CamScanner

پریکٹس موقوف کر دی گئی؛ سکول اور کالج بند کر دیے گئے؛ بینک اور قرض کا نظام ختم کر دیا گیا؛ یہاں تک کہ نقدی کی مالیات ہی کو سرے سے نابود کر دیا گیا۔ کمبوڈیا کی خانہ جنگی ویسی نہیں تھی جیسی سومالیا یا یوگوسلاویا کی تھی، جس کی بنیاد چھوٹے چھوٹے اختلاف پر زور دینے پر ہو؛ یہ خود تاریخ کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، معاشرے کو ازسرِ نو تشکیل دینے کا تجربہ تھا۔ تاریخ میں کسی اور حکمران گروہ نے درمیانہ طبقے پر اتنا منظم اور باقاعدہ حملہ کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود، اگر اس تجربے سے کچھ ثابت ہوا تو صرف یہ کہ یہ طبقہ ناقابلِ شکست ہے۔ اس میں بے پناہ عزم اور اندرونی مضبوطی ہے، اور بدترین ناسازگار حالات میں بھی اپنے علم اور اظہار کی ہیئتوں کو قائم رکھنے کی حیران کن صلاحیت ہے۔

اس وقت سویکا کی عمر محض سترہ برس کی تھی لیکن اپنے گھر میں صرف وہی تھی جسے حالات کا سامنا کرنا تھا کیوں کہ اور کوئی فرد اس قابل نہیں تھا۔ اس نے فوج میں نوکری کی اور اپنی اور اپنے بھائیوں کی اسکول اور کالج کی تعلیم کا بندوبست کیا؛ رفتہ رفتہ اس نے ایک مکان اور ایک کار بھی مہیا کر لی؛ اس نے ایک بچے کو گود لیا اور ___ نوم پنہ کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ___ نصف درجن ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ دی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ سب ملا کر وہ تقریباً درجن بھر افراد کی پرورش کی ذمے دار تھی۔

تاہم اب وہی سویکا، جو اکتیس برس کی عمر کو پہنچنے تک کئی زندگیاں گزار چکی تھی، گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی حدوں سے باہر نکلنے میں خوف محسوس کرتی تھی۔ اس نے جس زندگی کو بڑی کوشش سے جوڑا تھا، گزشتہ سال کے دوران اس کے کنارے اُدھڑنے لگے تھے۔ انتہائی عجیب بات تھی کہ عین اس لمحے جب پوری دنیا کمبوڈیا میں امن اور جمہوریت قائم کرنے کی کوششیں کر رہی تھی، ملک کے اندر حالات کا غیر یقینی پن اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اقوام متحدہ کے زیرِ انتظام کرائے جانے والے انتخابات کے نتیجے میں کون برسرِ اقتدار آئے گا، اور کسی کے بھی اقتدار میں آنے کے بعد کیا حالات پیش آئیں گے۔ اس کے کام کے تمام ساتھی مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنے کی ہر کوشش کر رہے تھے: کچھ بھی خریدنے، چرانے، بیچنے کو تیار۔ جن دو فوجیوں نے اس کی کار کو روکا تھا وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ جتنے لوگوں کو جانتی تھی ___ وزیر، بیوروکریٹ، پولیس والے ___ سب کسی نہ کسی حد تک ایسے ہو چلے تھے؛ یہ

سب وہ لوگ تھے جو خود کو ایک اور نئی ابتدا کے مقابل پا رہے تھے۔

اب مولیکا گاڑی چلا کر شہر سے باہر پول پاٹ کے بھائی اور بھابی سے ملنے جا رہی تھی، یعنی اس شخص کے رشتہ داروں سے ملنے جس کا نام اس کے اپنے باپ اور تو دوسرے رشتہ داروں کی موت سے انمٹ طور پر وابستہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے پہلی بار اس سے وہاں چلنے کے لیے کہا تھا تو حیرت اور بے یقینی سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا؛ کمبوڈیا کے بیشتر لوگوں کی طرح اس کے لیے بھی "پول پاٹ" نام ایک تجرید کا درجہ حاصل کر چکا تھا، یہ ایک دور کی، ایک تنظیم کی، دہشت کی ایک شکل کی علامت بن گیا تھا ـــ اس نام کو اب محض کسی شخص سے وابستہ کرنا تقریباً ناممکن تھا، کسی ایسے عام شخص سے جس کے بھائی بہن، بھابی اور دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ متجسس بھی تھی، اور آخرکار اپنے خوف پر قابو پا کر وہ مجھے اپنی گاڑی میں پوچینتانگ ایرپورٹ کے قریب اس نئے مزروعہ علاقے میں لے جانے پر رضامند ہو گئی۔

جب ہم ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس مکان پر پہنچے تو وہ روایتی کھمیر طرز کا چوبی ڈھانچے پر بنا ہوا ایک آرام دہ مکان ثابت ہوا جس کے اُبھرے ہوئے نقوش کو تیز نیلے رنگ سے نمایاں کیا گیا تھا۔ اس طرز کے تمام مکانوں کی طرح اسے ستونوں کے ایک پلیٹ فارم کے اوپر کھڑا کیا گیا تھا، اور جوں ہی ہم اندر داخل ہوئے مکان کے نیچے کے سایوں میں سے ایک ہیولا سا نمودار ہوا اور ہماری طرف بڑھا؛ وہ سارونگ میں ملبوس ایک دراز قد آدمی تھا اور محنت کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور خوش گوار اور بال چھوٹے اور کھڑے ہوئے تھے۔ پول پاٹ سے اس کی مشابہت بہت نمایاں تھی۔

میں نے مولیکا کی طرف دیکھا: جب مرد نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی تو وہ اپنے ہاتھ سامنے کی طرف جوڑ کر تعظیماً جھکی اور ان دونوں نے دوستانہ انداز میں مختصر خیر مقدمی کلمات کا باہم تبادلہ کیا۔ اس کی بیوی اوپر منتظر ہے، اس نے بتایا اور ہمیں ایک چوبی زینے کے راستے ایک وسیع اور ہوادار کمرے میں لے گیا جس کی خالی دیواروں پر صرف چند فوٹوگراف لگے تھے: رشتہ داروں اور بزرگوں کی تصویریں جیسی ہر کھمیر مکان میں لگی ہوتی ہیں۔ چیا سائی کمرے کے دوسرے کونے میں ایک دیوان پر بیٹھی تھی؛ اس نے ہاتھ لہرا کر ہمیں اندر آنے کو کہا اور اس کا شوہر ہاتھ جوڑ کر مسکراتا ہوا ہم سے رخصت ہوا۔

'پہلی بار نظر پڑنے پر میرا جی چاہا کہ اس پر حملہ کر دوں،' مولیکا نے بعد میں مجھے بتایا۔ 'مگر پھر مجھے خیال آیا — اس کا کیا قصور ہے۔ اس نے میرا کیا بگاڑا ہے؟'

۳

چیا سامی کو ۱۹۲۵ میں چھ برس کی عمر میں نوم پنہ کے محل میں لے جایا گیا تھا تاکہ وہ کلاسیکی رقص کی تعلیم شروع کر سکے۔ اس کا انتخاب ایک آزمائش کے بعد ہوا تھا جس میں ہزاروں بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کے والدین بہت خوش تھے؛ اُن دنوں رقص ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے سے رعایا میں سے کوئی شخص محل میں داخلہ حاصل کر سکتا تھا، اور کسی بچے کے منتخب ہو جانے کا مطلب عموماً یہ ہوتا تھا کہ پورے خاندان کو ترجیح حاصل ہو گئی۔

اُس کے محل میں داخلے کے وقت بادشاہ سیسوواتھ کی عمر اسّی برس کی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ، ولی عہد کی کاٹنے والی جوتیاں پہنے، انتظار کی حالت میں گزارا تھا جب کہ اس کا سوتیلا بھائی نوروڈوم حکمراں تھا۔ دونوں شاہ زادوں کے سیاسی خیالات ایک دوسرے سے ڈرامائی طور پر مختلف تھے: نوروڈوم فرانسیسیوں کے سخت خلاف اور سیسوواتھ ان کا ازحد شیدائی تھا۔ آخرکار فرانسیسیوں ہی کی مدد سے سیسوواتھ کو تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا، جب کہ اس کے سوتیلے بھائی کے بے شمار بیٹے موجود تھے۔

سیسوواتھ عمر بھر کچھ لاابالی رہا؛ اس نے کبھی وقت کی پابندی نہ کی اور اپنا بیشتر وقت اپنے جوشوں اور مشیروں کے ساتھ افیون پینے میں گزارا کیا۔ یہاں تک کہ جس وقت وہ فرانس کے دورے پر تھا، فرانسیسی حکام نے اس کی مارسائی کی قیام گاہ کے ایک کمرے کو افیون کے اڈے میں تبدیل کر دیا تھا۔ "یہ دیکھیے!" اخبارات چلائے تھے، "خاص سرکاری علاقے کے اندر افیون کا اڈا! افسوس دنیا انصاف سے خالی ہو گئی۔" تاہم، یہ فرانسیسی ہی تھے جو کمبوڈیا میں بادشاہ سیسوواتھ کو افیون کی فراہمی متواتر برقرار رکھتے تھے، اور اب جب کہ وہ ان کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے فرانس کے دورے پر تھا ان کے لیے اس معمول سے روگردانی کرنا ممکن نہ تھا۔

۱۹۲۵ میں جب چیا سای کا محل میں داخلہ ہوا، تب تک بادشاہ سیسوواتھ کا طرز عمل نہایت ناقابلِ اعتبار ہو چکا تھا۔ وہ تنگ دھڑنگ، محض کمر کے گرد ایک کرامر یعنی چارخانے کی ڈھیلی ڈھالی لنگوٹی باندھے محل کے میدانوں میں پھرا کرتا۔ رقص سے وابستہ بچوں کی زندگیوں میں شہزادی سوسپادی کو مرکزی اہمیت حاصل تھی؛ وہ ایک متبادل ماں تھی جو ان کی تربیت کی سختیوں کو اپنی مہربانیوں سے نرم کر دیتی اور ان کی خوراک اور لباس کا پورا خیال رکھتی۔

۱۹۲۷ میں بادشاہ سیسوواتھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مونیوانگ تخت کا وارث ہوا، اور جلد ہی محل کی حاکمیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ نئے بادشاہ کی مرغوب داشتہ لک کمن میئک نامی ایک باصلاحیت رقاصہ تھی، اور اس نے رفتہ رفتہ "محل کی عورتوں کی نگراں" کے طور پر شہزادی سوسپادی کی جگہ لے لی۔ لک کمن میئک نے اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھا کر اپنے خاندان کے کئی افراد کو محل میں داخل کر لیا۔ ان میں صوبہ کمپونگ تھوم کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے اس کے کچھ رشتے دار بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک ـــــ جو بعد میں چیا سای کا شوہر ہوا ـــــ محل میں کلرک کی اسامی پر بھرتی ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو بھی لے آیا تاکہ وہ نوم پنہ میں اسکول کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ ان دونوں میں چھوٹا چھ سات سال کا تھا ـــــ اور یہ وہی تھا جس نے آگے چل کر "پول پاٹ" کا جنگی لقب اختیار کیا۔

چیا سای نے اپنے پیچھے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی جانب اپنے ہاتھ کی پُر تعظیم حرکت سے اشارہ کیا، اور میں نے نگاہ اٹھا کر خود کو لک کمن میئک کی سخت گیر اور تنگ مزاج نظروں کی زد میں محسوس کیا۔ "اسے پول پاٹ نے مار ڈالا،" چیا سای نے وہی عمومی الفاظ استعمال کیے جو کمبوڈیا کے لوگ اس دور میں ہونے والی ہلاکتوں کے تذکرے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ ممتاز رقاصہ اور بادشاہ مونیوانگ کی داشتہ انقلاب کے بعد کے دنوں میں بھوک کے ہاتھوں ہلاک ہوئی۔ اس کی ایک بیٹی کو لال کھمیر نے سونے کی کسی چھوٹی سی چیز کے بدلے چاول خریدتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس کی چھاتیاں کاٹ ڈالی گئیں اور اسے خون بہتے بہتے مرجانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

"پول پاٹ بچپن میں کیسا تھا؟" میں نے پوچھا ـــــ یہ سوال ناگزیر تھا۔

چیا سای لمحے بھر کو جھجکی؛ صاف ظاہر تھا کہ یہ سوال اس سے متعدد موقعوں پر کیا جا چکا ہے اور اس کے جواب پر اس نے خاصا غور کیا ہے۔ "وہ بہت اچھا بچہ تھا،" آخرکار وہ زور دے کر بولی۔

Scanned with CamScanner

"جتنے برس وہ میرے پاس رہا، مجھے اس کی وجہ سے ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچی۔"

پھر، مایوسی کے انداز میں اشارہ کرتے ہوئے، اس نے کہا، "اس کے بھائی سے میری شادی ہوئے اب پچاس برس ہو گئے ہیں، اور میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ میرا شوہر ایک اچھا آدمی ہے، نیک دل آدمی ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا، سگریٹ نہیں پیتا، دوستوں سے کبھی نہیں جھگڑتا، اس نے اپنے بھتیجوں کو کبھی نہیں مارا، نہ اپنے بچوں کو کسی مشکل میں ڈالا..."

آخر وہ ہار گئی۔ اس کے ہاتھ بے بسی کے اظہار میں لہرائے اور پھر ڈھیلے ہو کر اس کی گود میں آ گرے۔

محل نے سالوتھ سار کے بچپن کے تعلق کے باعث اسے ملک کے چند بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھنے کا موقع میسر آیا۔ ۱۹۴۹ تک وہ پیرس میں الیکٹرانکس کا مضمون پڑھنے کا وظیفہ حاصل کر چکا تھا۔ تین سال بعد جب وہ کمبوڈیا واپس آیا تو خفیہ طور پر انڈوچائنا کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کرنے لگا۔ چیا سامی اور اس کے شوہر کی اس سے ملاقات اب بہت کم ہوتی، اور وہ جن کاموں میں مصروف تھا ان کے بارے میں انہیں کچھ نہ بتاتا۔ پھر ۱۹۶۳ میں وہ غائب ہو گیا؛ انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کئی دوسرے معروف بائیں بازو والوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ فرار ہو کر جنگلوں میں چلا گیا تھا۔ سالوتھ سار کے بارے میں یہ آخری خبر تھی جو انہیں ملی۔

۱۹۷۵ میں جب لال کھمیر اقتدار پر قابض ہوئے تو اور سب لوگوں کی طرح چیا سامی اور اس کا شوہر بھی شہر سے نکالے جانے والوں میں شامل تھے۔ انہیں 'پرانے لوگوں'، یعنی لال کھمیر سے طویل وابستگی رکھنے والوں، کے ایک گاؤں میں بھیجا گیا، اور تمام دوسرے 'نئے لوگوں' کی طرح دھان کے کھیتوں میں مزدوری پر لگا دیا گیا۔ اگلے کئی برسوں تک خبروں پر مکمل بلیک آؤٹ نافذ رہا، اور انہیں واقعات کی کوئی اطلاع نہ مل سکی: یہ لال کھمیر کے دہشت پھیلانے کے نظام کا حصہ تھا کہ آبادی کو اطلاعات سے مکمل طور پر محروم رکھا جائے۔ انہیں "پول پاٹ" کا نام پہلی بار ۱۹۷۸ میں سنائی دیا جب لال کھمیر حکومت نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے کے لیے اپنے رہنما کے گرد شخصیت پرستی کا رواج قائم کرنا شروع کیا۔

چیا سامی اُن دنوں ایک اجتماعی غذاخانے میں کھانا پکانے اور برتن دھونے پر مامور تھی۔ اُس سال کے آخری مہینوں میں پارٹی کے کارکنوں نے غذاخانے کی دیوار پر ایک پوسٹر چسپاں

گیا: انھوں نے بتایا کہ یہ ان کے قائد پول پاٹ کی تصویر ہے۔ اسے اس پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو گیا کہ پول پاٹ کون ہے۔

اس طرح اسے معلوم ہوا کہ انگکار، یعنی دہشت زدہ کر دینے والی اور خفیہ "تنظیم" کا قائد جو ان کی زندگیوں پر حکمران ہے، کوئی اور نہیں ان کا ننھا سالوتھ سار ہے۔

۴

چند ماہ بعد، جنوری ۱۹۷۹ میں، ویت نامیوں نے حملہ کر کے کمبوڈیا کو "توڑ ڈالا" — کھمیر زبان میں اس کے لیے یہی فقرہ استعمال ہوتا ہے — اور لال کھمیر حکومت ختم ہوئی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد چیا سامی اور اس کا شوہر، شہروں سے نکالے جانے والے تمام دوسرے لوگوں کی طرح، اپنے اپنے گاؤں سے، جہاں انھیں جبراً بھیجا گیا تھا، نکل پڑے۔ صرف پیالہ بھر چاول ساتھ لیے، ننگے پیر، فاقہ کش اور چیتھڑے لٹکائے یہ سب لوگ ان مقامات پر واپس جانے کی سعی میں تھے جہاں وہ کبھی رہے تھے، جہاں ان کے رشتےدار اور دوست رہتے تھے۔

دیہی علاقوں کی کچی گرد آلود سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے، "نئے لوگوں" کی ان ٹولیوں نے رفتہ رفتہ زبان اور اظہار کو ازسرِنو دریافت کرنا شروع کیا۔ تین سال سے زیادہ عرصے تک وہ کسی بھی شخص سے، اپنے بچوں تک سے، آزادی سے بات نہیں کر پائے تھے۔ لوگوں کی پچھلی زندگی کے بارے میں انگکار کے کارکنوں کے تجسس سے محفوظ رہنے کے لیے بہت سوں نے اپنا فرضی ماضی ایجاد کر لیا تھا۔ اب سڑکوں پر چلتے اور باتیں کرتے ہوئے انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی فرضی شناخت کو اتار پھینکنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے ذہنوں اور اپنی یادداشت کو کریدنا شروع کیا تاکہ زندہ اور مُردہ لوگوں کے نام اور اُن لوگوں کی باتیں یاد کر سکیں جن سے پچھلے برسوں میں ان کا واسطہ رہا تھا۔

یہ ایک نہایت عجیب و غریب وقت تھا۔

امریکی کویکر خاتون ایوا مسلیویک ۱۹۸۰ میں کمبوڈیا پہنچی: یہ اس ملک میں آنے والے

Scanned with CamScanner

نولیں غیر ملکی امدادی کارکنوں میں سے ایک تھی اور اب اسے نوم پنہ میں ایک لیجنڈ کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی اس زمانے کی واضح ترین یادیں باتوں کے اس بے پناہ سیلاب کی ہیں جو کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ پھٹ پڑتا تھا اور پھر تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ دوست اور ملنے والے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر اچانک وہ سب کچھ بیان کرنے لگتے جس سے وہ پچھلے برسوں میں گزرے تھے، جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، جو کچھ ان کے خاندانوں کے ساتھ پیش آیا تھا اور جن طریقوں سے انھوں نے خود کو زندہ رکھا تھا۔ لوگ سوتے سوتے ایک دم اٹھ بیٹھتے، ان کا رنگ زرد اور حال ابتر ہوتا، وہ راتوں کو اپنے خوابوں میں وہ سب کچھ دیکھتے جسے انھوں نے اُس وقت جب وہ پیش آ رہا تھا، اپنے ذہنوں سے خارج رکھنے کی کوشش کی تھی کیوں کہ اگر وہ ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگتے تو پاگل ہو جاتے ـــــ بھائی جسے اندھیرے میں سے آواز دے کر بلا لیا گیا؛ شیر خوار بچہ جسے ٹانگوں سے پکڑ کر درخت کے تنے پر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا؛ بھوک سے دھیرے دھیرے مرتے ہوئے کمسن بچے۔ جب ان لوگوں کو صبح کے وقت دیکھا جاتا اور ان سے پوچھا جاتا کہ رات میں کیا ہوا تھا، تو وہ اپنی انگلی سے ایک لہراتا ہوا گول اشارہ کرتے جیسے ان کا ماضی ان کے سامنے گھومتی ہوئی چرخی کی طرح کھلتا چلا آ رہا ہے، اور ان کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلتا: "کیمرا۔"

آخرکار کئی ہفتوں کی سرگردانی کے بعد چیا سامی اور اس کا شوہر نوم پنہ کے مغربی مضافات میں پہنچے۔ وہاں اچانک ایک دن اس کی مڈبھیڑ ایک لڑکی سے ہوئی جو انقلاب سے پہلے اس سے رقص سیکھتی رہی تھی۔ لڑکی اُسے دیکھ کر رونے لگی۔ "آپ کہاں تھیں؟ یہاں لوگ آپ کو ہر طرف تلاش کر رہے ہیں۔"

اُن دنوں حقیقی معنوں میں حکومتی نظام مفقود تھا۔ بہت سے مزاحمتی لیڈر، جو ویت نامی حملہ آوروں کے ساتھ کمبوڈیا میں واپس آئے تھے، انتظامی معاملات کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے؛ ان میں سے بیشتر لال کھمیر ہی سے ٹوٹ کر الگ ہوئے تھے کیوں کہ انھیں پول پاٹ اور اس کے گروپ کی پالیسیوں سے اتفاق نہ تھا۔ واپس آ کر انھیں انتظام سنبھالنا اور ساتھ ساتھ سیکھنا پڑا، جہاں تک بہت عرصے تک کمبوڈیا میں حقیقی حکومت نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والی سلیٹ کی طرح تھا؛ اس سے پہلے کہ اس پر کچھ لکھا جا سکے، اس کے ٹکڑے تلاش کر کے انھیں جوڑنا ضروری تھا۔

اس کے باوجود کلچر کی کمزور وزارت نے زندہ بچ جانے والے کلاسیکی رقاصوں اور رقص کے استادوں کو تلاش کرنے کی مہم شروع کر دی تھی۔ وزارت کے اہلکار چیا سامی کو زندہ پا کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فوراً اس کے سفر کا بندوبست کیا تاکہ وہ ملک بھر میں گھوم کر دوسرے استادوں کو، اور باصلاحیت نوعمر شاگردوں کو تلاش کر سکے۔

یہ بہت دشوار کام تھا، چیا سامی نے بتایا۔ "میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کہاں سے شروع کروں۔ زیادہ تر سکھانے والے ہلاک یا اپاہج ہو چکے تھے، اور جو تھے بھی وہ کام شروع کرنے کی حالت میں نہ تھے۔ اور پھر وہ کس کو سکھاتے؟ بے شمار بچے یتیم اور خدا کی کجی کا شکار تھے۔ وہ رقص کے تصور تک سے نابلد تھے۔ انھوں نے کبھی کمسیر رقص دیکھا تک نہ تھا۔ مجھے یہ کام شروع کرنا ناممکن معلوم ہوا۔

اُس کی آواز مدھم اور لہجہ حقیقت پسندانہ تھا لیکن اس میں کہیں ایک دبی دبی سی مسرت کی بھی گونج تھی۔ میں نے اس گونج کو فوراً پہچان لیا کیوں کہ میں اسے پہلے بھی سن چکا تھا: مثلاً مولیکا کی آواز میں، جس وقت وہ "پول پاٹ کے زمانے" کے بعد کے سال کا تذکرہ کر رہی تھی جب اس نے آہستہ آہستہ، نہایت صبر کے ساتھ، اپنے اردگرد بکھرے ملبے سے اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگیوں کو ازسرِ نو تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ مسرت کی یہ گونج مجھے کمبوڈیا میں بار بار سننے کو ملنے والی تھی ـــــ اور زیادہ تر عورتوں کی آوازوں میں۔ یہ سب لوگ ایک ایسے تجربے سے گزرے تھے جو انسانی تاریخ میں کم و بیش منفرد تھا: انھوں نے خود کو ایک ایسے معاشرے کے کھنڈروں میں بھٹکتے پایا تھا جو مسمار ہو کر ملبے کا ایک بے شکل ڈھیر بن گیا تھا؛ اس کا ڈھانچا نہایت منظم انداز سے، سماجی علوم کی نہایت مہلک عقلی بیت کے اوزاروں کی مدد سے، ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب ویت نامی حملہ آوروں کی نیت کے بارے میں خوف اور بے یقینی عام تھی، کمبوڈیا کے ان باشندوں کو ـــــ کوڑے کے ڈھیر سے کپڑے کی چندیاں جمع کرنے والوں کی طرح ـــــ باقی ماندہ جیبوں کو جوڑ جوڑ کر اپنے خاندان، اپنے گھر، اپنی زندگیاں بالکل نئے سرے سے بنانی پڑی تھیں۔

اپنے اردگرد کے ہر شخص کی طرح چیا سامی کو بھی ـــــ اپنی ساٹھ برس کی عمر اور سخت مشقت اور فاقہ کشی سے تباہ ہو جانے والی صحت کے ساتھ ـــــ اپنی زندگی پھر سے شروع کرنی پڑی

تھی۔ نہایت خاموشی، صبر اور لگن سے اس نے، چند اور رقاصوں اور سازندوں کی مدد سے، یتیم اور دھتکارے ہوئے بھوکے بدحال بچوں کا ایک گروپ اکٹھا کیا اور اپنی تربیت کے برسوں کی محنت اور نظم و ضبط کو کام میں لا کر اُس فن کو دوبارہ زندہ کرنا شروع کیا جو شہزادی سومپیادی اور لک کھُن بیک نے، اُس بھولی بسری دنیا میں جہاں بادشاہ سیسوواتھ راج کرتا تھا، ان تک پہنچایا تھا۔ اپنے اردگرد کے خرابے میں تعمیر کا ازسرِ نو آغاز کر کے انھوں نے پول پاٹ کی شکست کا سامان کرنا شروع کیا۔

■

اپنے دورۂ فرانس میں بادشاہ سیسوواتھ جہاں کہیں گیا اُس کا وزیرِ محل اس کے ساتھ رہا۔ وہ تھیون کے سادہ سے نام والا ایک اہلکار تھا۔ فرانس سے اپنی شیفتگی کے باوجود بادشاہ سیسوواتھ فرانسیسی زبان سے یکسر نابلد تھا اور تھیون ہی ہر جگہ اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔

وزیر تھیون کو کمبوڈیا کے نمایاں ترین افراد میں شمار کیا جاتا تھا: کمبوڈیا کے سخت حسبِ مراتب والے جامد سرکاری ماحول میں اس کی ترقی بےمثال تھی۔ انیس برس کی عمر میں فرانسیسیوں کے لیے ترجمانی کے کام سے آغاز کرنے والے تھیون نے، اپنے کم حیثیت خاندان میں پیدا ہونے اور آباواجداد میں کھمیر اور ویت نامی خون کی آمیزش ہونے کے دُہرے عیب کے باوصف، نوم پنہ کے دربار میں سب سے طاقتور اہلکار کا رُتبہ حاصل کیا تھا — وہ بیک وقت مالیات، فنونِ لطیفہ اور محلاتی امور کا وزیر تھا۔

اس کی یہ بے نظیر ترقی بڑی حد تک فرانسیسیوں کی مرہونِ منت تھی جن کا اس نے کمبوڈیا کے فرماں روا خاندان کے ساتھ کئی عشروں پر محیط کش مکش میں بہت ساتھ دیا تھا۔ اس کے اس کردار کے باعث شاہی خاندان کے کئی افراد اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ایک سرکش شہزادے نے فرانسیسیوں کا آلۂ کار کہہ کر اس 'ترجمان لونڈے' کی مذمت کی تھی۔ لیکن کمبوڈیا میں فرانسیسی بالادستی اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ مذکورہ شہزادہ وزیر تھیون کے بڑھتے ہوئے

اڑور سوخ کو کم کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام کرنے سے قاصر تھا۔ بادشاہ سیسوواتھ کے پڑپوتے نورودوم سہانوک کو اپنی تخت نشینی کے پہلے کئی برس وزیر تھیون کی سخت گیر نگرانی میں گزارنے پڑے۔ بعد میں اس نے تھیون کو "سچ مچ کا چھوٹا سا بادشاہ" قرار دیا جو "اس زمانے کے فرانسیسی ریزیڈنٹ سپیریر کی طرح طاقت ور تھا۔"

بادشاہ کا دورۂ فرانس وزیر تھیون کے لیے ایک طرح کی ذاتی کامیابی کا درجہ رکھتا تھا اور متعدد فرانسیسی وزیروں اور سیاست دانوں کی جانب سے اس کی تحسین کی گئی۔ لیکن یہ دورہ اس کے لیے عملی طور پر بھی کار آمد ثابت ہوا، کیوں کہ جہاز امیرال کیرساں پر رقاصوں کے طائفے اور شاہی وفد کے علاوہ وزیر کا بیٹا تھیون ہاں بھی اس کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ فرانس میں اپنے قیام کے دوران وزیر تھیون اپنے بیٹے کو ایک اعلیٰ درجے کی درس گاہ ایکول کولونیال میں داخل کرانے میں کامیاب ہوا۔ وہ اس درس گاہ میں داخل ہونے والا واحد عامی کمبوڈین تھا؛ اس کے علاوہ اُس وقت وہاں داخلہ حاصل کرنے والے باقی تینوں کمبوڈین لڑکے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ خلافِ توقع بات نہیں تھی کہ وزیر کا بیٹا شاہی خاندان کے لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ اچھا طالبِ علم ثابت ہوا اور آگے چل کر فرانس سے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے والا پہلا کمبوڈین بنا۔ بعد میں وزیر کے پوتے، یعنی کمبوڈیا کے دوسرے سب سے طاقت ور خاندان کے نوجوان، بھی سفر طے کر کے تعلیم حاصل کرنے فرانس پہنچے۔

ان میں سے ایک نوجوان تھیون ہم نے اطلاقی سائنس میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور فرانس کے ممتاز ادارے ایکول پولی ٹیکنیک سے ڈگری پانے والا پہلا کمبوڈین بنا۔ اس دوران میں اس نے فرانس میں کمبوڈین باشندوں کے چھوٹے سے حلقے میں نمایاں مقام حاصل کر لیا؛ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہر ہم وطن طالبِ علم سے دوستی قائم کرنے کو بہت اہمیت دیتا تھا اور یہاں تک کہ نئے آنے والوں کو ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہتا تھا۔

دوسرے لفظوں میں، تھیون ہم بیک وقت سرپرست، بڑا بھائی اور لیڈر تھا، اور ان اجزا سے مل کر بننے والی شخصیت کو ہر وہ آدمی پہچان سکتا ہے جو یورپ میں مقیم ایشیائی یا افریقی طلبا کے پُرخروش گروہ میں شامل رہ چکا ہو، یعنی سماجی نقل مکانی اور جذباتی بحران کی اُس عجیب حالت سے گزر چکا ہو جو گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصے سے دنیا کے سب سے طوفانی سیاسی اجتماعات

Scanned with CamScanner

کا موقع فراہم کرتی رہی ہے۔ اور پھر تھیون مم کوئی معمولی قسم کا طلبہ کا سرپرست نہ تھا؛ وہ ایک ممتاز سیاسی خانوادے کا رکن تھا ـــ کمبوڈیا کے اس خاندان کا رکن جس کا موازنہ برصغیر کے نہرو یا بھٹو خاندان سے کیا جا سکتا ہے۔

تھیون مم کے بہت سے منظورِ نظر طلبا میں نوجوان پول پاٹ بھی شامل تھا، جس کا نام اُس وقت تک سالوتھ سار تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تھیون مم ہی اُسے ۱۹۵۲ میں فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی میں متعارف کرانے کا ذمے دار تھا۔ پیرس میں قائم ہونے والی یہ وابستگی ناقابلِ شکست ثابت ہوئی؛ تھیون مم اور اس کے دو بھائی تب سے لے کر پول پاٹ کے سب سے قریبی گروہ کا حصہ رہے ہیں۔

کمبوڈیا کے لحاظ سے یہ کوئی خاص عجیب بات نہیں کہ اس انتہا پسندانہ گروہ کا شاہی محل سے اور نوآبادیاتی سرکاری حکام سے اس قدر قریبی تعلق رہا ہے۔ "انقلاب اور فوجی بغاوتیں ہمیشہ محل کے احاطوں کے اندر جنم لیتی ہیں،" نوم پنھ میں ایک معروف سیاسی شخصیت نے مجھے بتایا۔ "محل کے اندر ہی کے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ان کی طرح عام انسان ہے۔ محل کے باہر کے لوگ تو اُسے ایک 'الوہی ہستی' خیال کرتے ہیں۔"

اس اعتبار سے محل کی نسلی طور پر خالص ثقافت سے تھیون خاندان کے افراد اور پول پاٹ کی قربت نے یقیناً ان کے سیاسی ورژن پر بنیادی نوعیت کے اثرات مرتب کیے ہوں گے؛ ممکن ہے یہی اثرات، جیسا کہ سورخ بین کیرنن نے تجویز کیا ہے، اس گروہ میں رائج "قومی اور نسلی عظمت" کے طاقتور عنصر کا باعث رہے ہوں۔ آخرکار یہی عنصر غالب رہا ہے؛ لال کھمیر کا سیاسی پروگرام اب بہت بڑی حد تک کھلم کھلا نسلی قوم پرستی پر مبنی ہے، جس کا سب سے بڑا نشانہ، فی الحال، ویت نام، اور کمبوڈیا میں مقیم ویت نامی اقلیت، ہے۔

لال کھمیر سے حال ہی میں ٹوٹ کر الگ ہونے والے ایک شخص نے، اس گروہ کے تحت اپنی سیاسی تربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے، اقوام متحدہ کے ایک اہلکار کو بتایا: "جہاں تک ویت نامیوں کا تعلق ہے، وہ جہاں کہیں مل جائیں ان کو قتل کرنا ضروری ہے، خواہ وہ فوجی ہوں یا سویلین، کیوں کہ وہ کبھی عام شہری نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ شہریوں کے بھیس میں فوجی ہوتے ہیں۔ انھیں قتل کرتے ہوئے مردوں، عورتوں اور بچوں میں بھی تمیز نہیں کی جانی چاہیے؛ وہ دشمن

ہیں۔ بچے فوجی نہیں ہوتے، لیکن اگر وہ کمبوڈیا میں پیدا ہوئے ہیں تو بڑے ہو کر اسے اپنا ملک سمجھیں گے۔ اس لیے ہم بچوں سے بھی کوئی رعایت نہیں کرتے۔ رہیں عورتیں، تو وہ ویت نامی بچوں کو جنم دیتی ہیں۔"

انتخابات سے ذرا پہلے لال کھمیر نے اپنی نسل پرستانہ لفظیات کا دائرہ اور زیادہ وسیع کرتے ہوئے "گوری چمڑی والے انکاک کے سپاہیوں" کے خلاف بھی تشدد بھڑکانا شروع کر دیا۔

۲

جوں جوں مجھے پول پاٹ کے فرانس کے سفر، اور اس سے پہلے کے دوروں، کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی گئیں، اس کی اصل کے بارے میں میرا تجسس اور بڑھتا گیا۔ جنوری کے آخر میں ایک روز میں نے کمپونگ تھوم کے صوبے میں واقع اس کے آبائی گاؤں کی تلاش میں جانے کا فیصلہ کیا۔

کمپونگ تھوم فوجی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ وہ کمبوڈیا کے وسطی حصے، یعنی سٹریٹیجک اعتبار سے ملک کے قلب، پر محیط ہے۔ کمپونگ تھوم نامی قصبہ بہت چھوٹا سا ہے: مکانوں کی ایک قطار جو آگے بڑھ کر اچانک گولیوں کے نشانات والے ایک بازار، ایک سکول، ایک اسپتال، کوئی سو گز لمبی چند سڑکوں، نیلی تختیاں لگی اقوام متحدہ کے زیر انتظام قطعوں میں پھیلتی اور پھر دوبارہ سمٹ کر دیہی علاقے میں گم ہو جاتی ہے جہاں پام کے گرد آلود اور مرجھائے ہوئے پیڑوں کا سلسلہ زمین پر جھکا جھکا افق تک چلا گیا ہے اور دور سے تانبے کی پرات پر سجے ہوئے گدلے بھورے اور سبز رنگ کے مادے جیسا دکھائی دیتا ہے۔

اس چھوٹے سے قصبے کے شمال میں ملک کی دو اہم ترین بڑی سڑکیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک سڑک سیدھی تھائی لینڈ کی طرف جاتی ہے اور اس کے دونوں طرف کے بڑے بڑے قطعے لال کھمیر کے کنٹرول میں ہیں۔ اس سڑک کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کمبوڈیا میں سب سے زیادہ شدید لڑائی ہوئی ہے اور لال کھمیر کے گوریلا سپاہیوں اور سڑک

Scanned with CamScanner

سے کے ساتھ ساتھ نوضنات ریاست کمبوڈیا کے فوجیوں کے درمیان بندوقوں اور شیلوں کی جھڑپیں روز کا معمول ہیں۔

جس مقام پر دونوں سڑکیں ملتی ہیں، وہاں ایک پرانا فوجی کیمپ ہے جس کا کنٹرول اب ریاست کے پاس ہے۔ اس کے محیط پر چاروں طرف بھاری تعداد میں بارودی سرنگیں لگی ہوئی ہیں: مشہور ہے کہ یہ بارودی سرنگیں خود ریاست نے لگوائی ہیں ـــــ اس کا ایک مقصد لال کھمیر کو اس علاقے سے باہر رکھنا ہے، لیکن ایک اور مقصد خود اپنے ڈھلمل یقین فوجیوں کو احاطے کے اندر بند رکھنا بھی ہے۔

یہاں، اس فوجی سرگرمی کے مرکز، بلکہ اس مرکزوں کے مرکز، میں پول پاٹ کا گاؤں تلاش کرتے ہوئے میرا بارودی سرنگوں سے متعلق کسی شخص سے سامنا ہونا ناگزیر تھا۔ یہ ایک بنگلادیشی سارجنٹ تھا، لیم شیم، بھاری سوچھوں والا دوستانہ انداز کا حامل شخص۔ وہ بنگلادیش کے اُسی ضلعے سے تعلق رکھتا تھا جو میرا بھی آبائی ضلع ہے، اور کمبوڈیا کے بارودی سرنگوں سے بھرے ایک میدان کے کنارے اس غیر متوقع انکشاف نے ہمیں فوری طور پر بھائی چارے کے ایک مضحکہ خیز حد تک قریبی رشتے میں منسلک کر دیا۔

سارجنٹ اور اس کے ساتھی کمبوڈین سپاہیوں کے ایک گروپ کو بارودی سرنگیں ہٹانے کے پیشہ ورانہ طریقوں کی تربیت دے رہے تھے۔ وہ خود سرنگیں لگانے والوں اور انجینیئروں کے طور پر تربیت یافتہ تھے، لیکن ان میں سے کسی کو اس وقت تک ایسی بارودی سرنگوں سے بھرے میدان کو دیکھنے یا اس میں کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جو بلاک کرنے کے مقصد سے لگائی گئی ہوں۔ دوسری طرف ان کے کمبوڈین شاگردوں کے لیے بارودی سرنگیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے خطرے کی حیثیت رکھتی تھیں، جیسے سانپ اور زہریلے گرگٹ۔

یہ ستم ظریفی بنگلادیشی سارجنٹ پر بھی واضح تھی۔ "یہ لوگ تو بارودی سرنگیں لگانے کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتے،" وہ ٹھیٹھ بنگالی زبان میں بولا۔ "یہ انہیں بِجنے ہوئے دھان کی طرح بکھیر دیتے ہیں۔ اکثر وہ بستر پر جانے سے پہلے اپنے گھر کے دروازوں پر سرنگ لگا دیتے ہیں۔ اپنی کاروں، ٹی وی سیٹوں، حتیٰ کہ اپنی سبزی کی کیاریوں تک کی حفاظت بارودی سرنگیں لگا کر کرتے ہیں۔ انہیں کچھ پروا نہیں کہ کون مارا جائے گا: زندگی کی یہاں کچھ کوئی قدر نہیں۔

Scanned with CamScanner

اس نے اپنے کمبوڈین شاگردوں پر نظر ڈالتے ہوئے سمجھ نہ پانے والے انداز سے سر ہلایا؛ وہ دو دو کی ٹولیوں میں بارودی سرنگوں کے میدان پر کام کر رہے تھے؛ جھاڑیوں اور گھاس سے بھرے اس میدان کو ٹیپ چپکا کر پتلی پتلی پٹیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ٹولی اس پٹی کے ساتھ ساتھ ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھ رہی تھی، ایک آدمی بارودی سرنگ کا پتا چلانے والا آلہ ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتا اور دوسرا کدال اور پھاوڑا لیے مستعد رہتا کہ سرنگ کو کھود کر نکال سکے۔ اس بے حد سست اور دشوار طریقے سے مہینے بھر میں چند ایکڑ زمین صاف کی جا سکی تھی۔ اسے مناسب رفتار خیال کیا گیا تھا اور سارجنٹ اپنے یونٹ کی کارکردگی پر خوش تھا۔

اپنے کام کے دوران سارجنٹ اور اس کے ساتھیوں کی اپنی ٹیم کے کئی کمبوڈین ارکان سے دوستی ہو گئی تھی۔ لیکن ان کو قریب سے جاننے اور پسند کرنے پر اسے یہ لوگ زیادہ سے زیادہ خالی الذہن معلوم ہونے لگتے اور ملک کا مستقبل زیادہ سے زیادہ مایوس کن محسوس ہوتا۔ یہ امر اس حقیقت کے باوجود تھا کہ کمبوڈین باشندوں کا عمومی معیارِ زندگی ایسا ہے کہ ہندوستان اور بنگلادیش کے بیشتر لوگ اس پر رشک کر سکتے ہیں؛ اور اس حقیقت کے باوجود کہ کمپونگ تھوم کئی عشروں تک جنگ کے محاذ پر واقع رہتے ہوئے بھی برصغیر کے کسی چھوٹے قصبے سے کہیں بہتر طور پر منظم ہے؛ اور اس حقیقت کے باوجود کہ خود سارجنٹ کا تعلق ایک ایسے ملک سے تھا جو انیس سو ستر کی دہائی کے آغاز پر ایک خوں ریز خانہ جنگی کے مصائب کو جھیل چکا ہے۔

"یہ لوگ یہاں اس لیے زیادہ محنت کر رہے ہیں کہ انھیں ڈالروں میں تنخواہ ملتی ہے،" سارجنٹ بولا۔ "ان کے لیے ڈالروں کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہیں۔ کبھی کبھی تو سہ پہر میں ہمیں اپنی جیب سے ان کو ڈالر دینے پڑتے ہیں، کہ یہ دن بھر کا کام پورا کیے بغیر نہ چلے جائیں۔"

وہ ہنسا۔ "یہ ان کا اپنا ملک ہے، اور اسے محفوظ بنانے کے لیے ہمیں ان کو رقم دینی پڑ رہی ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ہمارے جانے کے بعد یہ لوگ کیا کریں گے۔"

میں نے اسے وہ بات بتائی جو نوم پنہ کے ایک پرانے رہنے والے غیر ملکی نے مجھے بتائی تھی: کہ کمبوڈیا کی عمر دراصل صرف پندرہ برس ہے؛ اور اگر اس لحاظ سے دیکھیں کہ ۱۹۷۹ میں پول پاٹ حکومت کے خاتمے کے بعد اسے بالکل نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے، تو کہنا پڑے گا کہ اس کی کارکردگی کچھ ایسی بُری نہیں رہی، اور یہ بھی کہ یہ کامیابی اس ملک کو باقی دنیا سے تقریباً

مکمل علیحدگی کی حالت میں حاصل ہوئی ہے۔ یوروپ اور جاپان کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد بھاری امداد ملی تھی جب کہ کمبوڈیا کو ـــ جو جنگی تاریخ میں شدید ترین بمباری کا ہدف رہا ہے ـــ کوئی امداد نہیں ملی۔ اس کے باوجود اس ملک نے محض اپنے وسائل پر انحصار کر کے اپنی تعمیر کی ہے۔

لیکن سارجنٹ کو ترقی کے بڑے پیمانے کے ثبوت درکار تھے ۔ سڑکیں، ڈاک کا عمدہ نظام، منصوبے، اسکیمیں، پلان ـــ اور ان سب کی عدم موجودگی ان چھوٹی چھوٹی کوششوں کو بے معنی بنا دیتی تھی جو افراد اور خاندان مل جل کر اپنی زندگی کو بحال کرنے کی غرض سے کر رہے تھے ـــ ایک دروازے کی مرمت، ایک کلاس کی پڑھائی، پام کا ایک پیڑ ـــ اور جو کامیاب ہونے کے بعد محسوس تک نہیں ہوتیں کیوں کہ وہ نارمل زندگی میں شامل ہو جاتی ہیں، جس کا وہ دراصل حصہ ہیں، اور امید اور زندگی پر اصرار کرنے کے علامتی عمل کی حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ یہ سارجنٹ اقوام متحدہ کی عظیم مشینری میں ایک نہایت حقیر پُرزے سے زیادہ نہ تھا، لیکن اپنے رویّے میں نوم پنہ میں مقیم بین الاقوامی بیوروکریٹوں اور ماہروں سے کچھ مختلف نہ تھا جن کے خیال میں اس ملک کو خود اپنے آپ سے بچایا جانا بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

"کمبوڈین صرف ایک چیز میں مہارت رکھتے ہیں، اور وہ ہے تباہی پھیلانا،" وہ بولا۔ "انھیں تعمیر کی الف بے تک سے واقفیت نہیں۔ یہ لوگ چیزوں کو درست رکھنے اور آگے بڑھنے سے بالکل نابلد ہیں۔"

اس نے کمبوڈینوں کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ لہرایا، اور انھوں نے بھی سر اٹھا کر، ہاتھ لہرا کر اور مسکراتے ہوئے خم ہو کر اسے جواب دیا۔ ماہر اور زیرِ تربیت، بے پروا اور ذمے دار، دونوں گروہوں کے لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے؛ طاقت ور بچانے والے اور کمزور بچائے جانے والے دونوں اپنے اپنے کام کو پوری سنجیدگی سے لے رہے تھے۔

۷

جب میں نے پول پاٹ کے گاؤں کا پتا دریافت کرنا شروع کیا تو جواب میں مجھے خالی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ پول پاٹ کے گاؤں تو روٹ نمبر ۱۲ کے دونوں جانب واقع ہیں، لوگوں نے مجھ سے کہا، درجنوں گاؤں ہیں، اور ان میں کوئی نہیں جا سکتا کیوں کہ وہ جنگلوں کے اندر واقع ہیں اور بارودی سرنگوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی پوچھے کہ ریاست کمبوڈیا کہاں واقع ہے۔ سالوتھ سار کا نام استعمال کرنا بھی بے فائدہ ثابت ہوا؛ کسی کو یہ نام سنا ہوا نہیں لگتا تھا۔

جن لوگوں سے میں نے یہ سوال کیا ان میں سے ایک سرُوس نامی ایک نوجوان کمبوڈین میری مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا، اگرچہ وہ بھی میرا سوال سن کر دوسرے تمام لوگوں کی طرح اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ ایک امدادی ادارے میں کام کرتا تھا اور کمپونگ تھوم میں خاصا وقت گزار چکا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو پول پاٹ کے گاؤں کا ذکر کرتے نہیں سنا تھا اور اگر وہ ایسا تذکرہ سنتا تو اسے ضرور مشتبہ سمجھتا۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ پول پاٹ کا اصل نام سالوتھ سار تھا اور وہ کمپونگ تھوم قصبے کے نزدیک ہی کہیں پیدا ہوا تھا؛ گاؤں کا نام میرے ذہن سے نکل گیا تھا لیکن میں نے یہ نام کتابوں میں پڑھا ضرور تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ قریب ہی واقع ہے۔

اسے بھی دل چسپی پیدا ہوئی۔ اس نے کسی سے اسکوٹر اُدھار لیا اور ہم دونوں اس پر سوار ہو کر کمپونگ تھوم کی بڑی سڑک پر روانہ ہوئے۔ ہم راہ گیروں کو روک روک کر احترام کے ساتھ ان سے سوال کرتے: "بھائی، کیا آپ کو پول پاٹ کے گاؤں کا پتا معلوم ہے؟"

وہ بے یقینی کے انداز میں ہمیں دیکھتے اور جلدی سے آگے بڑھ جاتے؛ یا تو انھیں معلوم نہیں تھا یا وہ بتانا نہیں چاہتے تھے۔ تب سرُوس نے ایک مقامی ضلعی افسر کو روکا جو بولا لگنے ہوئے سنجیدہ سا آدمی لگتا تھا اور جس کے داہنے رخسار کے عضلات ذرا ذرا دیر بعد ایک جھٹکا سا کھاتے تھے۔ اس پر نظر ڈالتے ہی میں جان گیا کہ اسے ضرور معلوم ہوگا۔ اسے معلوم تھا۔ اس نے اپنی آواز کو دھیما کیا اور سرُوس کو سرگوشی میں پتا بتایا۔ پول پاٹ کا گاؤں سباو کہلاتا تھا، اور وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں اسپتال سے گزر کر دریائے سن کے ساتھ ساتھ چلنے والی کچی سڑک پکڑنی تھی۔ پھر

Scanned with CamScanner

اُس نے اپنے کندھوں پر سے ادھر اُدھر دیکھا اور اس سڑک کی جانب اشارہ کیا۔

سورج ڈوبنے میں کوئی گھنٹا بھر رہ گیا تھا، اور اندھیرے میں گھر سے باہر رہنا احتیاط کے خلاف تھا۔ لیکن سرُوس پُرعزم تھا۔ اس خیال سے کہ ہم پول پاٹ کے گاؤں کے اس قدر قریب ہیں، اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

سرُوس نے اپنی تقریباً پوری بلوغت کی زندگی خاردار تاروں کے پیچھے گزاری تھی۔ تھائی لینڈ کی سرحد کے قریب واقع پناہ گزینوں کے اس کیمپ کے گرد خاردار تاروں کی ڈیڑھ میل لمبی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ وہ تیرہ برس کی عمر میں اس کیمپ میں داخل ہوا تھا اور اسی باڑھ کے محیط پر چکر لگاتے لگاتے ماہ بہ ماہ، سال بہ سال بڑا ہوا۔ وہ دیکھتا رہتا کہ کون باہر نکل رہا ہے، کسے ویزا مل رہا ہے، کون پاگل ہو گیا، کس عورت کے ساتھ جبری زنا کیا گیا، کسے تھائی محافظوں نے گولی مار دی۔ وہ اب پچیس سال کا تھا۔ دُبلا، پستہ قد اور جسمانی طور پر نحیف۔ کیمپ ہی میں وہ عیسائی ہو گیا تھا اور اس کی مستقل مسکراہٹ اور بے پروایانہ انداز کے پیچھے گہری سنجیدگی تھی جو شدید مذہبی احساس کا پتا دیتی تھی۔

سرُوس کی عمر اتنی نہ تھی کہ وہ "پول پاٹ" کے زمانے کی باتیں یاد کر سکے، لیکن اسے اپنے والدین کے ساتھ تھائی لینڈ کی سرحد تک کا سفر بخوبی یاد تھا۔ وہ لوگ ویت نام کے حملے کے تین سال بعد، ۱۹۸۲ء میں، روانہ ہوئے تھے۔ جہاں وہ رہتے تھے وہاں زندگی نہایت دشوار ہو گئی تھی۔ اور انھوں نے مغربی ریڈیو اسٹیشنوں سے سنا تھا کہ سرحد پر کیمپ قائم ہیں جہاں انھیں کھانا ملے گا اور ان کی دیکھ بھال کی جائے گی۔

انھوں نے جو سوچا تھا کچھ زیادہ درست نہ نکلا۔ وہ ایک قدامت پسند کمبوڈین دھڑے کے چلائے ہوئے کیمپ میں پہنچے جو ایک طرح سے دوزخ کا نمونہ تھا۔ مگر پھر انھوں نے ایک نگاہ کو رشوت دے کر خود کو اقوام متحدہ کے ایک کیمپ، کھاؤ اے ڈانگ، میں منتقل کرا لیا جہاں حالات نسبتاً بہتر تھے۔ سرُوس نے اسکول میں داخلہ لیا، انگریزی زبان سیکھی اور کئی برس تک کسی مغربی ملک کا ویزا حاصل کرنے کا بے سود انتظار کرنے کے بعد آخرکار کمبوڈیا لوٹ آنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سال بھر پہلے کی بات تھی۔ اپنی تعلیم اور انگریزی کی استعداد کی بدولت اسے آسانی سے ملازمت مل گئی، لیکن اس نے اپنا نام اب تک اقوام متحدہ کے پناہ گزینوں کے کمیشن کی فہرست سے خارج

نہیں کرایا تھا۔

"میرا باپ مجھ سے کہتا ہے: تمہاری زندگی میں امن قائم ہو جائے گا اور تم خوش رہو گے،" اس نے مجھے بتایا، "میرا دادا بھی میرے باپ سے یہی بات کہتا تھا، اور اب میں بھی اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں سے یہی بات کہتا ہوں۔ حالات ویسے کے ویسے ہیں۔"

ہم ذرا سی دیر میں کمپونگ تھوم قصبے سے آگے نکل آئے۔ شہر کے کنارے سے ایک کچی سڑک بل کھاتی ہوئی آگے جا رہی تھی جس پر سایہ دار درخت اور بانس لگے ہوئے تھے۔ سڑک گویا گہری سرخ مٹی کی ایک ندی سی تھی: ہماری طرف آتی ہوئی بیل گاڑی کے پہیوں سے لال کتھئی غبار کی لہریں اٹھ کر آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھیں۔ یہ غبار سڑک کے بہت اوپر جا کر ٹھہر جاتا تھا اور یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی پتھریلے ساحل کے افق پر پانی کے باریک چھینٹے غروبِ آفتاب کی روشنی میں چمکتے ہوئے سرخ نظر آ رہے ہوں۔

اس سڑک کے ایک طرف جھونپڑیاں اور کچے مکان تھے، یہ بدحال ترین رہائشی جگہیں تھیں جو مجھے کمبوڈیا میں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض تو زمین میں گاڑے ہوئے بانس کے ڈھانچوں اور ان پر پام کے سلوٹ دار پتوں کے غلاف سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ بڑے مکان بھی بانسوں پر کھڑے جھونپڑوں سے مختلف دکھائی نہ دیتے تھے۔ سڑک کے دوسرے کنارے کی زمین فوراً ہی ڈھلان میں اتر کر دریا سے سی سے جا ملتی تھی جو اب، خشک موسم میں، سکڑ کر محض ایک نالا سا رہ گیا تھا جو اپنے نوکیلے کناروں والے گہرے پاٹ کی تہ میں بڑا دھیرے دھیرے بہ رہا تھا۔

یہ کہنا مشکل تھا کہ ایک گاؤں کہاں ختم اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ہم راستے میں دو چار بار راستا پوچھنے کے لیے رکے، آخری بار ایک کھوکھے پر جہاں ایک عورت سگریٹ اور پھل بیچ رہی تھی۔ اس نے اپنے کندھے کے اوپر سے اشارہ کیا: چول پاٹ کے بیٹوں میں سے ایک پیچھے کے اس مکان میں رہتا ہے، اس نے بتایا، اور دوسرا اس کے ساتھ والے احاطے میں پام کے پتوں سے بنی جھونپڑی میں۔

ہم اسکوٹر پر سوار احاطے کے اندر جا پہنچے اور نظر اٹھا کر مکان کی طرف دیکھا۔ یہ اپنے آس پاس کے مکانوں سے نسبتاً بڑا اور روایتی کھمیر طرز کا چوبی شہتیروں کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا مکان تھا۔ نیچے مرغیاں رہ رہی تھیں اور ستونوں کے درمیان کپڑے سوکھ رہے تھے۔ یہ واضح تھا کہ

Scanned with CamScanner

مکان اپنے اچھے دن گزار چکا ہے اور اب مرمت کا محتاج ہے۔

اس شکستہ مکان اور احاطے میں پام کے پتوں کی بنی ہوئی خستہ حال جھونپڑی کو دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھے یاد آیا میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پول پاٹ کا باپ ایک خوش حال کاشتکار تھا، اور میں اس سے بہتر رہائش کی توقع کر رہا تھا۔ سرُوس مجھ سے بھی زیادہ متعجب تھا: شاید اس نے فرض کر رکھا تھا کہ سیاست دانوں کے رشتہ دار کسی نہ کسی طرح ہمیشہ مال دار ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی فضا میں کسی نامانوس شے کا اشارہ سا تھا ـــ ایک با اقتدار شخص جس نے اپنے خاندان والوں کی بہتری کے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ اشارہ اس بات کی یاد دلاتا تھا کہ ہم ایک ایسے مظہر کا سامنا کر رہے ہیں جو عمومی توقعات کے یکسر برخلاف تھا۔

تب چھوٹے کٹے ہوئے سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت مکان کے برآمدے میں نمودار ہوئی۔ سرُوس نے اس سے مخاطب ہو کر چند الفاظ کہے اور اس نے ہمیں اندر بلا لیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ہمارا خیر مقدم کرتے ہوئے چٹائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنے شوہر کو بلانے اندر چلی گئی۔ بیشتر کمبوڈین مکانوں کی طرح یہاں بہت کم سامان تھا، اور دیواریں چند ایک مذہبی تصویروں اور مہاتما بدھ کی شبیہوں کے سوا بالکل خالی تھیں۔

عورت واپس آئی تو اس کے پیچھے ایک لمبا ڈیلا شخص بھی آیا جس نے اپنے سارونگ کو اوپر کر کے موڑ رکھا تھا۔ وہ پول پاٹ سے اتنی مشابہت نہ رکھتا تھا جتنا وہ بھائی جس سے میری نوم پنھ میں مختصر سی ملاقات ہوئی تھی، لیکن مشابہت تھی ضرور۔

اس کا نام لوتھ سیری ہے، اس نے چٹائی پر ہمارے پاس بیٹھتے ہوئے بتایا، اور وہ بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ سالوتھ سار بہت کم عمری میں نوم پنھ چلا گیا تھا اور اس کے بعد ان سے اُس کی بہت کم ملاقات ہوئی۔ وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے نوم پنھ ہی کے کالج میں چلا گیا تھا اور پھر مزید تعلیم کے لیے پیرس۔ وہ ہلکے انگیز انداز میں مسکرایا۔ "پیرس میں اس نے جو علم سیکھا اسی کی وجہ سے وہ ایسا بنا،" اس نے کہا۔

کمبوڈیا لوٹنے کے بعد وہ دو ایک بار ان سے ملنے آیا تھا لیکن پھر غائب ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا: اب بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے کہ اس نے، لوتھ سیری نے، اُسے نہیں دیکھا۔ پول پاٹ کے زمانے میں ان کے ساتھ بھی دوسروں سے مختلف سلوک

نہیں ہوا! انھیں گمان تک ۔ ہوا تھا کہ پول پاٹ اس کا بھائی سالوتھ سار ہے جو اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ انھیں بعد میں معلوم ہوا۔

"اسی مکان میں پیدا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں،" ان میاں بیوی نے بتایا، "برآمدے کے بالکل ساتھ والے کمرے میں۔"

"فرانس سے واپس آنے کے بعد،" میں نے سوال کیا، "کیا اس نے کبھی اپنی پیرس کی زندگی کا تذکرہ کیا تھا — کہ وہ وہاں کیا کرتا تھا، اس کے دوست کون تھے، وہ شہر کیسا تھا؟"

اس لیے، جب بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گائیں ڈکرا رہی تھیں، دریائے سن کے کنارے کے اس گاؤں سے پیرس تک کا سفر ایک غیر معمولی اوڈیسی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے خود کو یہ جاننے کے لیے نہایت متجسس محسوس کیا کہ یہ شخص اور اس کے دوسرے بھائی پیرس کے بارے میں، اور خود اپنے بھائی کے وہاں ہونے کے بارے میں، کس قسم کا تصور رکھتے تھے۔ لیکن نہیں۔ بوڑھے آدمی نے نفی میں سر ہلایا؛ سالوتھ سار نے واپس آنے کے بعد کبھی فرانس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے اس نے انھیں وہاں کی کچھ تصویریں دکھائی ہوں — یہ لوتھ سیری کو یاد نہیں تھا۔

مجھے یاد آیا، ڈیوڈ چینڈلر کی لکھی ہوئی پول پاٹ کی سوانح میں میں نے پڑھا تھا کہ پول پاٹ اپنی جوانی میں بہت وسیع المطالعہ شخص تھا اور اسے ربل بو اور ورلین کے لمبے لمبے اقتباسات زبانی یاد تھے۔ لیکن مجھے یہ جان کر کچھ خاص تعجب نہیں ہوا کہ اس نے اپنے گھر والوں کو وہاں کا تصور کرنے کا اعزاز نہیں دیا۔

اٹھنے سے ذرا پہلے میں نے سوال کیا کہ کیا اسے اپنی رشتہ دار عورت لک کھن میک یاد ہے جس نے اس کے خاندان کو پہلی بار محل میں متعارف کرایا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا، "کیا آپ نے کبھی اس کا رقص دیکھا تھا؟"

وہ مسکرایا اور نفی میں سر ہلا کر بتایا کہ اس نے کبھی "شاہی" رقص نہیں دیکھا، بس تصویریں دیکھی ہیں۔

اندھیرا اب پوری طرح چھا گیا تھا؛ کہیں شمال کی طرف سے، بارودی سرنگوں کے میدان کے پاس سے، فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور گھر کے

Scanned with CamScanner

تمام لوگ ہمارے ساتھ ساتھ نیچے اترے۔ انھیں الوداع کہنے کے بعد اسکوٹر پر سوار ہوتے ہوئے سروُس نے میرے کان میں کہا کہ اگر بوڑھے شخص کو کچھ رقم دے دی جائے تو بہتر ہوگا۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا؛ میں نے اپنی جیب سے کچھ رقم نکالی اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔

اس نے تسلیم کے انداز میں سر ہلایا، اور جب ہم روانہ ہونے لگے تو سروُس کے کان میں چند لفظ کہے۔

'اس نے تم سے کیا کہا؟' سڑک پر واپس پہنچ کر میں نے سروُس سے پوچھا۔

ہوا کے جھکڑوں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ چلّا کر بولا، 'پوچھ رہا تھا، کیا تمھارے خیال میں اب امن ہو جائے گا؟"

"تو پھر، تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا: کاش میں ہاں کہہ سکتا۔"

۸

۱۰ جولائی ۱۹۰۶ کو، یعنی فرانس پہنچنے کے ایک ماہ بعد، پیرس کے بُوا دُبولونیہ میں وزیرِ نوآبادیات کی طرف سے دیے گئے ایک استقبالیہ میں رقاصاؤں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 'پیرس میں اس سے زیادہ جگمگاتی ہوئی دعوت کبھی نہیں ہوئی،' اخبار لُ فگارو نے لکھا، 'اور نہ کسی دعوت میں ایسی انوکھی ملاحت دیکھنے میں آئی۔' دعوت نامے حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے بہت دوڑ دھوپ کی، اور دعوت کی رات کو پارک کے ارد گرد کاروں اور جگمگاتی ہوئی گاڑیوں کا ایسا اجتماع تھا جیسے 'جگنوؤں کی فوج' نکل آئی ہو۔

رقص کے دوران ایک اخباری نمائندے نے پیرس کی ایک نہایت ممتاز ہستی کو دیکھا؛ یہ موسوی وضع کا حامل پیرس مصور روداں (Rodin) تھا جو 'قوم پنہ سے آئی ہوئی کمسن کنواریوں کو دیکھ دیکھ کر مسرت سے مغلوب ہو رہا تھا، جن کے سیہ خاکے اس نے اس قدر بے پایاں محبت کے ساتھ تیار کیے۔"

روداں، جو اس وقت چھیاسٹھ برس کا تھا اور فرانسیسی فنونِ لطیفہ کی ایک ممتاز ترین شخصیت کے طور پر تسلیم شدہ تھا، بالکل مبہوت رہ گیا تھا: شہزادی سوسپادی کی کمسن شاگردوں میں اس نے یوروپ کے بچپن کو دریافت کیا۔ "ان کمبوڈیوں نے ہمیں وہ سب کچھ دکھا دیا ہے جو قدیم زمانے میں رہا ہوگا،" کچھ ہی عرصے بعد اس نے لکھا۔ "انھیں اور یونانیوں کو چھوڑ کر کسی اور کا تصور کرنا محال ہے جسے انسانی فطرت اتنے مکمل طور پر زیب دیتی ہو۔"

رقص کے مظاہرے کے دو روز بعد روداں بغل میں ایک اسکیچ بک دبائے پیرس کے ایونیو مالاکوف پر واقع رقاصاؤں کی قیام گاہ پر پہنچا۔ وہ سب مارسائی واپس جانے کے لیے اپنا اسباب باندھ رہی تھیں، لیکن روداں کو عمارت کے احاطے میں آ کر اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے اُس روز بہت سے معروف خاکے تیار کیے جن میں بادشاہ سیسووات کے بھی کچھ خاکے شامل تھے۔

شام ہوتے ہوتے مصوّر رقاصاؤں کا اس قدر گرویدہ ہو چکا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ اسٹیشن پہنچا، ٹکٹ خریدا اور اسی ٹرین پر ان کے ساتھ مارسائی تک گیا۔ وہ اپنے ساتھ کپڑے یا مصوّری کا سامان، کچھ بھی نہ لے گیا تھا اور، ایک بیان کے مطابق، مارسائی پہنچنے پر جب اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کاغذ ختم ہو گیا ہے تو اسے ایک پرچون کی دکان سے خاکی کاغذ کے لفافے خریدنے پڑے۔

اگلے چند دنوں میں اُس ولا کے باغ میں جہاں رقاصاؤں کو ٹھہرایا گیا تھا، بے تابی سے خاکے تیار کرتے کرتے، معلوم ہوتا تھا کہ روداں کی عمر کے تیس برس کم ہو گئے۔ اپنی پسندیدہ تین ماڈلوں ــــ ساپ، سُون اور یم نامی نٹ کھٹ چہاردہ سالہ رقاصاؤں ــــ کے خاکے بنانے میں اسے جو جسمانی محنت کرنی پڑی اس کے اثر سے لگتا تھا اس کا شباب لوٹ آیا ہے۔ ایک فرانسیسی بلکار نے ایک صبح اسے اپنے گھٹنے پر ایک سفید کاغذ رکھتے ہوئے دیکھا۔ "اس نے ساپ سے کہا: اس پر اپنا پاؤں رکھو۔ پھر پنسل سے اس کے پیر کا خاکہ کھینچا اور بولا: ٹھیک ہے، تمھیں کل جوتے مل جائیں گے۔ اب ذرا تھوڑی دیر اور میرے سامنے کھڑی رہو۔ ساپ نے، جو بلبلے بنانے والی بوتلوں اور گتّے کی بلیوں سے کھیل کھیل کر اکتا گئی تھی، اپنے 'پاپا' سے پمپوں کی ایک جوڑی کی فرمائش کی تھی۔ ہر شام روداں، پُرجوش، مسرور مگر تھکا ہوا، ہاتھ میں ڈھیر سارے اسکیچ لیے اپنے ہوٹل لوٹتا

Scanned with CamScanner

اور اپنے خیالات کو از سرِ نو مجتمع کرتا۔

اُن دنوں کے فوٹوؤں میں روداں کو باغ کی ایک بنچ پر بیٹھے اسکیچ بناتے دکھایا گیا ہے اور پولیس والے، جنھیں وہاں رقاصاؤں کی حفاظت کی غرض سے متعین کیا گیا تھا، اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ روداں ہر شے سے بے خبر تھا: انگکور کے مجسموں کے نمونے میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو رہے تھے۔ میں ان کمبوڈین لڑکیوں سے اس قدر محبت کرنے لگا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس شاہی اعزاز کا شکریہ کیوں کر ادا کروں جو انھوں نے میرے سامنے رقص اور پوز کر کے مجھے عطا کیا ہے۔ میں نوویل گیلیری جا کر ان کے لیے ٹوکری بھر کھلونے لایا، اور یہ آسمانی پریاں جو دیوتاؤں کے لیے ناچتی ہیں اتنی خوش ہوئیں کہ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ میرا قرض کس طرح اتاریں۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔

فرانس میں اپنے قیام کے آخری دن، اس جہاز پر سوار ہونے سے چند گھنٹے پہلے جو انھیں واپس کمبوڈیا لے جانے والا تھا، رقاصاؤں کو معروف فوٹوگرافر بودوآں (Baudouin) کے پاس لے جایا گیا۔ راستے میں ایک گندی گلی سے گزرتے ہوئے شہزادی سوسپاوی کا پاؤں گوبر کے ایک ڈھیر پر جا پڑا۔ دہشت زدہ ہو کر اس نے اپنے بازو آسمان کی طرف اٹھائے اور اپنے عالی شان لباس سے بے پروا ہو کر چلاتے ہوئے خود کو خاک پر گرا دیا۔ طائفے کی باقی ارکان نے بھی فوراً اس کی پیروی کی۔ چند لمحوں میں پوری گلی زمین پر گری ہوئی کمبوڈین رقاصاؤں سے ڈھک چکی تھی جنھوں نے رقص کا مکمل اور شاندار لباس پہن رکھا تھا۔

'وہ میری زندگی کو کیسا خالی کر کے چھوڑ گئی ہیں،' روداں نے لکھا۔ 'جب وہ رخصت ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ دنیا کا حُسن بھی ان کے ساتھ چلا گیا ہے۔ میں ان کے ساتھ مارسئی تک گیا؛ میں ان کے پیچھے پیچھے قاہرہ تک چلا جاتا۔'

اس کے جذبات کا ہوبہو عکس بادشاہ سیسوواتھ کے تاثر میں دکھائی دیتا تھا۔ 'میں فرانس سے رخصت ہوتے ہوئے گہری اُداسی محسوس کر رہا ہوں،' بادشاہ نے روانہ ہونے سے ایک رات پہلے کہا، 'اس حسین ملک میں میں اپنے دل کا ایک حصہ چھوڑے جا رہا ہوں۔'

Scanned with CamScanner

کمبوڈیا کے صدر مقام نوم پنہ میں وسیع شاہی محل کا چاں چایا پویلین۔

فرانسیسی مصور رودان ایک نوخیز کمبوڈیائی رقاصہ کا خاکہ بناتے ہوئے۔ (مارسائی ۱۹۰۶ء)

Scanned with CamScanner

پول پوٹ کے دوران میں
ٹول سلینگ یا
تفتیشی مرکز ایس ۲۱
نامی عقوبت خانہ۔

ٹول سلینگ کا ایک کمرہ۔

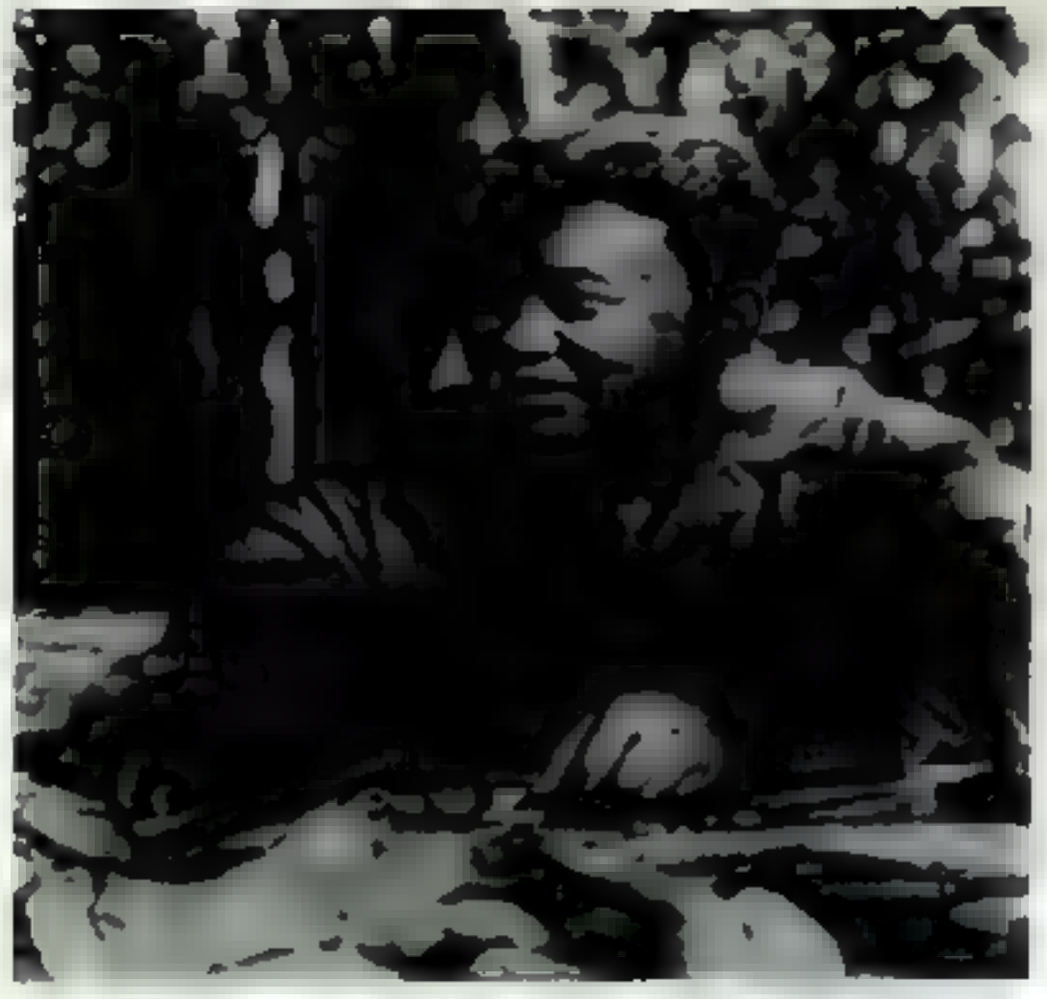

پول پاٹ اقتدار سے ہٹائے جانے کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۸۰ کو
تھائی لینڈ اور کمبوڈیا کی سرحد پر واقع جنگلوں میں انٹرویو دیتے ہوئے۔
پول پاٹ کی موت کی تازہ ترین اطلاع جون ۱۹۹۶ میں پھیلی، لیکن بے بنیاد ثابت ہوئی۔

۹

فرانس کے دورے نے بادشاہ سیسوواتھ کے ذہن کو اسی قسم کے کرب، اسی طرح کی شورش میں مبتلا کردیا جس میں اپنے وطن سے باہر آنے والے طالب علموں کی کئی پیڑھیاں مبتلا ہوتی چلی آئی ہیں ـــ گاندھی، کنیاٹا، چُو این لائی، اور ان کے ہزروں کم معروف ہم وطن ـــ اور انھوں نے اپنے کرائے کے مکانوں کے باہر واقع نامانوس، سرد دنیاؤں پر غور و فکر کرنے پر خود کو مجبور محسوس کیا ہے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۰۶ کو، کمبوڈیا واپس پہنچنے کے چند روز بعد، بادشاہ اور اس کے وزیٹروں نے اپنے تاثرات ایک مختصر لیکن فیصلہ کن انداز کی دستاویز کی صورت میں ظاہر کیے۔ ایک شاہی حکم نامے کے بھیس میں یہ تحریر دراصل سفر نامہ نگاری کی صنف سے ایک ذرا دور کا تعلق رکھتی تھی۔ اس کا آغاز یوں ہوتا تھا: بادشاہ سلامت کے فرانس کے بڑے بڑے شہروں کے دورے، اس ملک کے اداروں کے تیز رفتار مشاہدے، وہاں کی بڑی بڑی سہولتوں کی تنظیم وغیرہ نے انھیں حیرت زدہ کردیا ہے اور وہ ملک فرانس کو ایک طرح کی جنت خیال کرنے لگے ہیں۔

پیروی، اس دستاویز کے مصنفوں کا حتمی خیال تھا، وہ واحد راستا ہے جو ہمیں ترقی کی جانب لے جائے گا۔"

چند ہزار الفاظ کی مختصر سی وسعت میں بادشاہ اور اس کے وزیروں نے ن اسباق کا خلاصہ پیش کردیا تھا جو فرانس کمبوڈیا کی رہنمائی کے لیے پیش کرسکتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق اس شے سے تھا جسے بعد میں "ترقی" سے موسوم کیا گیا: مواصلات کے ذرائع کو بہتر بنایا جائے؛ زراعت کے لیے مزید زمین صاف کرکے فراہم کی جائے؛ کسان بھی زرعی پیداوار اور مویشیوں کی تعداد بڑھائیں، اپنے جنگلوں اور ماہی خانوں کو زیادہ منظم طور پر استعمال کریں، جدید مشینری کے استعمال میں مہارت پیدا کریں، وغیرہ۔ ایک نسل بعد، کمبوڈیا کی اہم سیاسی شخصیات، مثلاً کھیو سمپھان، عجیب طور پر یکساں نتائج تک پہنچنے والی تھیں، اگرچہ ان کا یہاں تک پہنچنے کا راستا یکسر مختلف تھا۔

لیکن بادشاہ اور اس کے وزیروں نے جس موضوع پر سب سے زیادہ پیش گویانہ بات کہی وہ

ریاست اور اس کے عوام کے درمیان تعلق کا معاملہ تھا؛ یہ وہ معاملہ ہے، انھوں نے خیال ظاہر کیا، جس کی بابت یوروپ سب سے اہم سبق سیکھ سکتا ہے۔ "کسی کو اپنی جان قربان کرنے سے ذرا بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے، انھوں نے لکھا، جب معاملہ بادشاہ کی الوہیت یا ملک کی سلامتی کا ہو۔ ریاست کے عوام کو ملک کی خدمت کی ذمے داری کسی چوں و چرا کے بغیر قبول کرنی چاہیے؛ اپنے ملک کی حفاظت کرنا ہی سب سے عظیم عمل ہے۔ کیا تمام یوروپی باشندے، رتبے یا خاندان کے امتیاز کے بغیر، اسی ذمے داری کے بندھن میں بندھے ہوئے نہیں ہیں؟"

افسوس، کہ اُس وقت بادشاہ سیسووتھ کو اندازہ نہ تھا کہ نوآبادیاتی خطِ تقسیم کے اِدھر کے باشندوں کے لیے سفرنامہ نگاری ایک گراں شوق ہے۔ ۱۹۱۰ میں پیرس کی وزارتِ نوآبادیات نے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دورے کے سلسلے میں ہونے والے بعض اخراجات کی حکومتِ فرانس کو ادائیگی کرے۔ حقیقت یہ تھی کہ دورۂ فرانس کے تمام تر اخراجات، بُوا دُبولونیہ میں ہونے والے رقص کے مظاہرے کے خرچ سمیت، کمبوڈیا کے بجٹ سے ادا کیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں، بادشاہ نے، جو طبعاً تباہ کن حد تک دریادل واقع ہوا تھا، اپنے ہاتھ سے ہزاروں فرانک کے تحائف اور بخششیں تقسیم کی تھیں۔ ان کے بدلے اسے اور اس کے مہمانوں کو فرانسیسی اہلکاروں کی جانب سے چند تحفے دیے گئے تھے۔ ان میں وزیرِ نوآبادیات کی جانب سے دی جانے والی وردیاں اور گلاب کی چند جھاڑیاں شامل تھیں جو بادشاہ کو ایلیزے پیلیس میں خود صدرِ جمہوریہ آرماں فالیئر، نے اپنے ہاتھ سے پیش کی تھیں۔ فرانس کی حکومت اب ان وردیوں اور گلاب کی جھاڑیوں کی قیمت کمبوڈیا سے وصول کرنا چاہتی تھی۔

اس بار وزیر تھیون نے، اپنے معمول کے برخلاف، بادشاہ کا ساتھ دیا۔ اس نے خفگی کے ساتھ اس خط کا جواب دیا اور ان تحائف کی قیمت ادا کرنے سے انکار کیا جنھیں نیک نیتی کے ساتھ قبول کیا گیا تھا۔

شاہی دورۂ فرانس کے سب سے شان دار نقوش رودان کے اسکیچوں میں ظاہر ہوئے۔ ۱۹۰۷ میں جب انھیں نمائش کے لیے رکھا گیا تو ان کی بے پناہ پذیرائی ہوئی۔ انھیں دیکھنے کے بعد جرمن شاعر رِلکے نے استاد معصور کو خط میں لکھا، "میرے لیے یہ اسکیچ عظیم ترین انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں۔"

ریکے نے جس انکشاف کی جانب اشارہ کیا وہ کمبوڈین رقص کے اسرار سے متعلق تھا۔ لیکن اس ثقافتی ملاقات کے اسرار کا اصل انکشاف غالباً شاعر پر نہیں بلکہ خود مسہ سار پر ہوا تھا: یعنی جدیدیت کے کلچر اور سیاست میں، اس کے امکانات اور اور بے پناہ دہشت سمیت، کمبوڈیا کی شمولیت کا اسرار۔

۱۰

جہاں تک بادشاہ سیسوواتھ کا تعلق ہے، اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ ایک بائی اسکول کے قیام کی اجازت دینا تھا جہاں کمبوڈیا کے باشندے فرانسیسی طرز کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ درس گاہ، جسے ابتدا میں College du Protectorat کا نام دیا گیا تھا، بادشاہ کی موت کے چند برس بعد اس کے نام سے منسوب ہوا۔

لیسے سیسوواتھ کمبوڈیا کی تعمیرِ نو کی ایک تجربہ گاہ ثابت ہونے والا تھا۔ بہت سے کمبوڈین طلبا جو ۱۹۵۰ کے عشرے میں پیرس جا کر ترقی پسندانہ سیاست سے وابستہ ہوئے اسی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے۔ پول پاٹ خود کبھی اس اسکول کا طالب علم نہیں رہا، لیکن وہ اس سے قریبی تعلق رکھتا تھا اور اس کے کئی انتہائی قریبی ساتھی، جن میں اس کی پہلی بیوی کھیو پوناری اور اس کا بہنوئی، اور پول پاٹ کا طویل عرصے تک نائب، اینگ ساری بھی شامل تھا، اسی اسکول سے پڑھ کر نکلے تھے۔

اس گروپ کے ممتاز ترین افراد میں کھیو سامپھان بھی تھا، جو ایک وقت میں پول پاٹ کے ڈیموکریٹک کمپوچیا کا صدر رہا اور اب لال کھمیر کا سب سے معروف رہنما ہے۔ ۱۹۶۰ کے عشرے اور اس کے بعد کے وقتیں برسوں میں کھیو سامپھان کمبوڈیا کی نمایاں ترین سیاسی شخصیات میں شامل رہا۔ وہ ملک بھر میں بدعنوانی کے شائبے تک سے پاک آدرش پسند کے طور پر جانا جاتا تھا: اپنی ماں کی التجاؤں کے باوجود رشوت لینے سے اس کے صاف انکار کی کہانیاں عوامی دیومالا کا حصہ بن چکی ہیں۔ وہ ایک اہم اقتصادی مفکر اور نظریہ ساز بھی تھا؛ کمبوڈیا کی معیشت کے موضوع پر

سوربون یونیورسٹی میں ۱۹۵۰ کے عشرے میں لکھا ہوا اس کا مقالہ اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۶۷ میں غائب ہو گیا اور لال کھمیر کی سخت جدوجہد کے دوران، جو پہلے سیہانوک کے خلاف تھی اور پھر، جب امریکی جہازوں نے کمبوڈیا کے دیہی علاقے کو اپنی بمباری کا نشانہ بنایا تو اس کا رخ جنرل لون نول کی دائیں بازو کی حکومت کے خلاف ہو گیا، وہ جنگل میں رہا۔

کھیو سامپھان ۱۹۷۵ کے انقلاب کے بعد پول پاٹ کے ڈیموکریٹک کمپوچیا کے صدر کے طور پر نمودار ہوا۔ ۱۹۷۹ میں جب ویت نامی حملے کے باعث اس حکومت کا اقتدار ختم ہوا تو وہ باقی ارکان کے ساتھ فرار ہو کر تھائی سرحد پر لال کھمیر کے زیرِ کنٹرول علاقے میں چلا گیا۔

لال کھمیر کے ترجمان اور نمائندے کے طور پر اس نے ۱۹۸۸ کے بعد اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام کرائے جانے والے مذاکرات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے بعد، اس سال ہونے والے انتخابات سے چند ماہ قبل، جب لال کھمیر نے اقوام متحدہ کو سخت ملامت آمیز تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے امن معاہدے سے روگردانی کا اعلان کیا تب بھی اسی نے اپنے سیاسی گروہ کی ترجمانی کی۔ لال کھمیر کے ہتھکنڈوں سے ایسے کسی شخص کو بالکل تعجب نہیں ہوا جس نے کبھی اس کی قیادت کے ساتھ معاملہ کیا ہو؛ تعجب تو صرف اس بات پر ہوا کہ اقوام متحدہ کی فوج اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کس حد تک جانے کو تیار ہے۔ عملاً لال کھمیر کی قیادت کمبوڈیا میں اقوام متحدہ کی موجودگی کو اپنے فائدے میں استعمال کرنے اور امن معاہدے کو سبوتاژ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فوجی پوزیشن کو مضبوط بنانے میں کامیاب رہی۔

۱۹۹۱ اور ۱۹۹۲ میں، جب کھیو سامپھان دنیا بھر کے دورے کر رہا تھا اور اس کی خبریں اخباروں کے صفحۂ اول پر چھپ رہی تھیں، نوم پنھ میں صرف ایک شخص تھا جو اُس کی ہر سرگرمی کو ایسی دل چسپی کے ساتھ بغور دیکھ رہا تھا جس کی نوعیت مکمل طور پر سیاسی نہیں تھی: اُس کا اکیاس سالہ چھوٹا بھائی کھیو سنگ کھم۔

میں کھیو سنگ کھم سے ایک صبح اُس وقت ملا جب وہ کلاسیکی رقص کے اسکول کے دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا قد لمبا، ایک آنکھ مصنوعی اور بال بے ترتیب تھے۔ وہ فوراً بے تکلف ہو گیا۔ وہ اپنے خاندان کے بارے میں بات کرنے کا بھی شائق تھا اور فرانسیسی بولنے کا بھی۔ متعارف ہونے کے چند منٹ کے اندر اندر ہم دونوں اُس کے

چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ایک ڈیسک پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ہمارے ارد گرد فرانسیسی کی درسی کتابیں اور "پیرس میچ" نامی رسالے کے بے تحاشا پرانے شمارے بکھرے ہوئے تھے۔

کھیو سنگ کھم کے پیچھے کی اینٹوں کی دیوار رشتہ داروں اور مرحوم آباواجداد کی تصویروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں سب سے بڑی اس کے بھائی کھیو سامپھان کی کسی رسالے سے کاٹی ہوئی رنگین تصویر تھی جو ۱۹۹۱ میں امن معاہدے پر دستخط ہونے کے فوراً بعد کھینچی گئی تھی۔ تصویر میں اُسے کمبوڈیا کے تمام بڑے دھڑوں کے لیڈروں کے ساتھ کھڑا دکھایا گیا ہے: شہزادہ سیہانوک، سنٹرسٹ کھمیر پیپلز نیشنل لبریشن فرنٹ کا لیڈر سون سَن، اور "ریاست کمبوڈیا" کا نمائندہ ہُن سین۔ اس تصویر میں ہر ایک کے چہرے پر مسکراہٹ ہے اور تسکین، بھائی چارے اور امید پرستی کا تاثر، اور سب سے زیادہ کھیو سامپھان کے چہرے پر۔

کھیو سنگ کھم ۱۹۵۰ میں بہت چھوٹا تھا جب اس کا بھائی لیسے سیسوواتھ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وظیفہ حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس روانہ ہوا۔ آٹھ سال بعد جب وہ سوربون سے ڈاکٹریٹ حاصل کر کے واپس آیا تو کھیو سنگ کھم کی عمر چودہ سال تھی، اور بڑے بھائی کو لینے کے لیے پوچینتانگ ایرپورٹ جانے کی یاد آج بھی اس کے ذہن میں تازہ ہے۔ "اُن دنوں ہم بہت غریب تھے،" وہ بولا، "اور امیر لوگوں کی طرح اس کے استقبال کے لیے پھولوں کے ہاروں اور تاج کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سب نے صرف گلے لگا کر اس کا استقبال کیا اور ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔"

اُس زمانے کے کمبوڈیا میں فرانس سے حاصل کی گئی ڈاکٹریٹ کی سند اونچے درجے کی سرکاری ملازمت یعنی ملک کے مراعات یافتہ طبقے میں یقینی داخلہ پانے کی ضمانت تھی۔ اس کی ماں بھی اپنے اور اپنے خاندان کے لیے اس سے کم کسی بات پر راضی نہ تھی۔ وہ زندگی بھر افلاس سے لڑتی چلی آئی تھی؛ اس کا شوہر، جو مجسٹریٹ تھا، بہت جلد چل بسا تھا اور اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑ گیا تھا جن کی اسے تنہا پرورش کرنی پڑی تھی۔ لیکن جب اس کی التجاؤں کے باوجود اس کے بیٹے نے اعلیٰ ملازمتوں کی تمام پیش کشیں مسترد کر دیں تو اسے ایک بار پھر گھر کا خرچ چلانے کے لیے سبزیاں بیچنے کا کام شروع کرنا پڑا۔ کھیو سنگ کھم کو اب تک یاد ہے کہ کس طرح اس کا پیارا بھائی ـــــ سوربون سے سند پا کر آیا ہوا ذہین ماہرِ اقتصادیات ـــــ اپنی ماں کے ساتھ اکڑوں بیٹھا

اسے سبزی کا خوانچہ لگانے میں مدد دے رہا تھا۔

اس دوران کھیو سامپھان نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کیا، بائیں بازو کا ایک بااثر جریدہ جاری کیا اور رفتہ رفتہ ایک نمایاں سیاسی مقام حاصل کر لیا۔ وہ مختصر عرصے کے لیے سہانوک کی کابینہ میں بھی شامل رہا، اور اس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ خاندان کی حالت میں کچھ بہتری آئی۔

اور تب ۱۹۶۷ کا وہ دن آیا جب وہ جنگل میں غائب ہو گیا۔

کھیو سنگ کھم کو وہ دن اچھی طرح یاد ہے: یہ سوموار تھا، اپریل ۱۹۶۷ کی ۲۴ تاریخ۔ اس کی ماں نے ساڑھے سات بجے رات کا کھانا لگایا، اور دونوں ماں بیٹے کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھیو سامپھان کا انتظار کرنے لگے: وہ اکثر اسی وقت گھر لوٹتا تھا۔ وہ رات گیارہ بجے تک کھانا کھائے بغیر وہاں بیٹھے اس کی راہ دیکھتے رہے اور ان کے کان ہر چاپ، ہر آہٹ پر لگے رہے۔ پھر اس کی ماں بار گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ساری رات روتی رہی، "کسی ایسے بچے کی طرح جو اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہو۔"

پہلے پہل انھوں نے خیال کیا کہ کھیو سامپھان گرفتار ہو گیا ہے۔ ان کا یہ خیال ایسا بے بنیاد بھی نہ تھا کیوں کہ دو روز پہلے شہزادہ سہانوک نے ایک تقریر میں کھیو سامپھان اور اس کے دو قریبی دوستوں، ہُو نیم اور ہاؤ یو آن کی (جو آپس میں بھائی بھی تھے) مذمت کی تھی۔ لیکن کسی گرفتاری کا اعلان نہ کیا گیا، اور نہ اگلے روز کوئی خبر آئی۔

کھیو سنگ کھم پر گویا آسیب سوار ہو گیا: وہ اس بات پر یقین نہ کر سکتا تھا کہ اس کا بھائی جس کی وہ پرستش کرتا تھا، اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر جا سکتا ہے! اُن دنوں وہی خاندان کا واحد سہارا تھا۔ وہ اُس کی تلاش میں پورے ملک میں گھومتا پھرا اور دوستوں اور رشتے داروں سے دریافت کرتا رہا کہ شاید ان کے پاس اُس کی کوئی خبر ہو۔ کوئی اسے کچھ نہ بتا سکا: یہ تو انھیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اُس شام جب کھیو سامپھان کا کھانے پر انتظار کیا جا رہا تھا، اسے ایک کسان کی بیل گاڑی میں چھپا کر شہر سے باہر لے جایا گیا تھا۔

آٹھ سال بعد، ۱۹۷۵ میں، جب لال کھمیر کے کارکنوں کے پہلے دستے نوم پنھ میں داخل ہوئے تو کھیو سنگ کھم دوڑتا ہوا ان سے جا ٹکرایا اور چلانے لگا: "میرا بھائی کھیو سامپھان ہے۔ وہ تمھارا لیڈر ہے!" انھوں نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی پاگل ہو۔ "انقلاب رشتے داروں کو نہیں

پہچانتا،" انھوں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ اسے بھی اس کی بیوی اور بچوں کے ساتھ شہر سے باہر نکالا گیا اور دوسرے لوگوں کی طرح پیدل چلا کر اس کے کام کی جگہ تک پہنچایا گیا۔

۱۹۷۹ میں، جب ویت نامی حملے کے باعث پول پاٹ کی حکومت ختم ہوئی، شہر سے نکالے جانے والے بیشتر دوسرے لوگوں کی طرح کھیو سنگ گھم بھی آخرکار دوبارہ نوم پنہ پہنچا۔ اس نے ایک کارخانے میں کام شروع کیا لیکن جلد ہی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ فرانسیسی زبان جانتا ہے اور انقلاب سے پہلے اخبار نویس کے طور پر کام کر چکا ہے۔ نئی حکومت نے اس سے رابطہ قائم کر کے اسے اخبار نویس کے طور پر کام شروع کرنے کی دعوت دی۔ اس نے انکار کر دیا؛ وہ کسی قسم کا سمجھوتا کرنے یا حکومت کے ساتھ وابستہ ہونے کو تیار نہ تھا۔ اس کے بجائے اس نے کچھ عرصے تک محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ساتھ ریسٹورر کے طور پر کام کیا اور پھر فائن آرٹس کے اسکول میں استاد کے طور پر ملازمت کر لی۔

"اس لیے وہ مجھے اب بھی مشتبہ سمجھتے ہیں،" وہ ایک ترش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اب تک۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسی جگہ رہ رہا ہوں، جب کہ ملک میں ہر شخص مال دار ہو رہا ہے۔"

اس نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا؛ وہ اپنے الگ تھلگ کر دیے جانے کے خیال پر مبہم سے انداز میں خوش ہوتا معلوم ہو رہا تھا، اور سمجھتا تھا کہ اسے بھی اسی ویرانے کی حدوں میں دھکیلا جا رہا ہے جس نے برسوں پہلے اس کے بھائی کو نگل لیا تھا۔ اسے غالباً یہ خیال نہ آیا تھا کہ کرۂ ارض پر کوئی اور ملک ایسا نہیں ہو گا جہاں قتلِ عام کی شائق کسی حکومت کے سربراہوں میں شامل کسی شخص کے بھائی کو بعد میں آنے والی حکومت بیچ بچا کر ملازمت کی پیش کش کرے۔

مجھے کھیو سنگ گھم اچھا لگا۔ مجھے اس کا تُند، چھوٹے بھائیوں کا سا انداز بھی اچھا لگا۔ اس کی خاطر میں نے خواہش کی کہ کاش اس کی ماں ابھی زندہ ہوتی ـــــ وہ پُرعزم عمر رسیدہ عورت جس نے یہ احساس ہونے پر کہ اس کا بڑا بیٹا کسی شرمندگی کے بغیر اپنے گھر والوں کو اپنے آدرش واد کی بھینٹ چڑھانے پر تُلا ہوا ہے، اپنی چٹائی بچھا کر پھر سبزیاں بیچنی شروع کر دی تھیں۔ وہ، گر آج زندہ ہوتی تو کھیو سنگ گھم کو کچھ گھریلو سچائیوں سے آشنا کرا سکتی تھی۔

Scanned with CamScanner

۱۱

فرانس سے واپسی پر کھیو سامپھان اپنے طالبعلمی کے دنوں کا بہت کم تذکرہ کرتا تھا۔ البتہ اس کی سنائی ایک کہانی اس کے چھوٹے بھائی کے ذہن پر نقش ہو گئی۔ یہ اس کے پرانے دوست باؤ یو آن کے بارے میں تھی۔

باؤ یو آن انتہا پسندانہ سیاست سے اُسی زمانے میں متعارف ہوا تھا جب کھیو سامپھان اور پول پاٹ اس سے آشنا ہوئے؛ وہ سب پیرس میں ایک ہی سٹڈی گروپ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ کے عشرے میں انھوں نے نوم پنھ میں ساتھ ساتھ پارٹی کے لیے کام کیا اور ۱۹۷۰ کے عشرے کے اولیں دشوار برسوں میں ساتھ ساتھ لڑے جب حالات نہایت نامساعد تھے اور ہزاروں ٹن بم ان کے آس پاس گر رہے تھے۔ کھیو سامپھان اور باؤ یو آن اتنے قریبی ساتھی تھے کہ انھیں، تیسرے ساتھی ہُو نِم سمیت، ایک اجتماعی لیجنڈ کی حیثیت حاصل ہو گئی اور "تین بھوت" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

ایک بار پیرس میں کمبوڈین باشندوں کی ایک محفل میں باؤ یو آن نے شہزادہ سہانوک کی حکومت کی بدعنوانی اور زرپرستی کی مذمت میں تقریر کی۔ اس کی باتیں ایک سرکاری اہلکار تک پہنچیں اور اس کے کچھ روز بعد اس کا سرکاری وظیفہ ایک سال کے لیے معطل کر دیا گیا۔ کھیو سامپھان کو باؤ یو آن کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔

دونوں دوست گزر بسر کرنے کے لیے روٹیاں فروخت کرنے لگے۔ وہ دن میں پڑھتے اور رات میں گلی گلی گھوم کر فرانس کی مخصوص لمبی روٹیاں بیچا کرتے۔ اس سے جو کچھ یافت ہوتی وہ ان کے رہنے کھانے اور کتابیں خریدنے میں خرچ ہوتی؛ جو روٹیاں بک نہ پاتیں انھیں وہ خود کھا لیتے۔ یہ پیسے کمانے کا بہت دشوار طریقہ تھا، کھیو سامپھان نے اپنے چھوٹے بھائی کو بتایا، لیکن اس سے عجیب قسم کی مسرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ رات کو دیر گئے لیمپوں سے روشن اُن گلیوں میں ساتھ ساتھ چلتے اور باتیں کرتے ہوئے، کھیو سامپھان اور باؤ یو آن کسی طرح روح کی اُس تاریکی سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتے جس نے پیرس میں ان پر غلبہ پا لیا تھا۔ وہ رات بھر چلتے رہتے، خوشبودار خستہ روٹیاں اپنے کاندھوں پر رکھے، کیفوں اور ریستورانوں کی کھڑکیوں میں

جاسکتے، اپنی زندگیوں اور اپنے مستقبل کی باتیں کرتے۔

جب انقلاب شروع ہوا تو ہاؤ یوآن سب سے پہلے مارے جانے والوں میں شامل تھا۔ اُس کے معتدل خیالات مگر اس گروپ کے نہایت شدت پسندانہ، اجتماعیت پرست نظریے سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ لال کھمیر کے اقتدار پر قابض ہونے کے چند ماہ بعد، اگست ۱۹۷۵ میں، اس نے ایک ہجوم سے خطاب کیا اور شہر خالی کرنے کی پالیسی پر کھل کر تنقید کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جلسے کے ختم ہونے پر اسے پارٹی کی قیادت کے حکم پر قتل کر دیا گیا۔ ہُو نِم نے کچھ عرصے تک وزیر اطلاعات کے طور پر خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۰ اپریل ۱۹۷۷ کو اسے اور اس کی بیوی کو "تفتیشی مرکز ایس ٹوئنٹی ون" میں لے جایا گیا، جو نوم پنہ کے مضافات میں واقع تول سلینگ کے عقوبت خانے کا نام تھا۔ اسے کئی مہینے بعد، سی آئی اے کے ایجنٹ سے لے کر ویت نامی جاسوس تک سب کچھ ہونے کا اعتراف کرانے کے بعد، ختم کر دیا گیا۔

تب کھیو سامپھان سربراہِ ریاست تھا۔ مانا جاتا ہے کہ پارٹی کی اُس زمانے کی تطہیر (purges) کی منصوبہ بندی میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

کھیو سامپھان اور پول پاٹ کے لیے ہاؤ یوآن، ہُو نِم اور ہزاروں دوسرے افراد کی اموات، جنھیں عقوبت خانوں اور سزائے موت کے میدانوں میں ٹھکانے لگایا گیا، اور ان کے آدرش وار اور نظریہ پرستی کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں تھا بلکہ وہ تو ان اموات کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت سمجھتے تھے۔ ان کے اقتدار کے نفاذ کے عمل میں دہشت کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ محض ان کی جبر کی مشینری ہی کا اٹوٹ حصہ نہ تھا بلکہ اس اخلاقی نظام کا بھی لازمی جز تھا جس پر انھوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی؛ یہ وہ عنصر تھا جسے ایک نہایت پیش گویانہ خلاقیت کے حامل ڈراما نگار بُشنر (Buchner) نے (پول پاٹ کے پسندیدہ کردار) روبسپیئر کی زبان سے ادا کیے جانے والے اس مکالمے میں ظاہر کیا تھا: 'خیر دہشت ہے، اور دہشت خیر' — یہ الفاظ بیسویں صدی کی قبر کے کتبے کے طور پر بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۱۲

جو لوگ ۱۹۸۰ میں نوم پنہ میں تھے وہ بتاتے ہیں کہ تب وہاں حیاتِ نو کا سا ایک لمحہ آیا تھا۔ یہ لمحہ ایک خاموش، معمولی سے موقعے پر پیش آیا: ایک فیسٹول کے موقعے پر جہاں انقلاب کے بعد سے پہلی بار کلاسیکی کمبوڈین موسیقی اور رقص کا ایک مظاہرہ پیش کیا گیا۔

اس فیسٹول کے لیے ملک بھر سے رقاص اور سازندے نوم پنہ پہنچے تھے۔ پرونگ چھیئنگ بھی، جسے ملک کے بہترین رقاصوں اور کوریوگرافروں میں شمار کیا جاتا ہے، ان میں شامل تھا: وہ کمپونگ تھوم سے سفر کر کے پہنچا تھا جہاں اس نے پول پاٹ کے ڈیموکریٹک کمپوچیا کے خاتمے کے بعد ایک چھوٹا سا طائفہ تیار کرنے میں حصہ لیا تھا۔ وہ اپنے بچپن میں نوم پنہ کے محل میں تربیت حاصل کر چکا تھا اور اس نے رامائن کے کردار ہنومان کا کردار ادا کرنے میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی، اور یہ کردار کمبوڈین رقص کے شاندار ترین عناصر میں سے ایک ہے۔ یہ تربیت پرونگ چھیئنگ کے زندہ رہنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھی: مسخرے پن اور ماتم کے فن میں اس کی مہارت کے باعث مزدور کیمپ میں اس سے تفتیش کرنے والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک ان پڑھ اور پاگل شخص ہے۔

فیسٹول میں انقلاب کے بعد سے پہلی بار اس کی ملاقات اپنے ساتھ تربیت حاصل کرنے والوں اور اپنے استادوں سے ہوئی۔ "ہم ایک دوسرے سے مل کر روئے اور ہنسے اور پھر اور لوگوں کو ڈھونڈنے لگے جو زندہ رہ گئے تھے۔ ہم کسی جانے پہچانے شخص کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگاتے: تو تم زندہ ہو! اور پھر اس سے مل کر کسی مرنے والے کی یاد میں رونے لگتے۔"

رقص کے مظاہرے کی تیاری کے دوران رقاصوں کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا: موسیقی کے سازوں اور رقص میں استعمال ہونے والے لباسوں اور مکھوٹوں کی بہت بڑی تعداد انقلاب کے دنوں میں تلف ہو گئی تھی۔ انھیں رقص کے لیے ادھر اُدھر سے چیزیں مہیا کرنی پڑیں: شاندار ریشم اور زربفت کی جگہ انھیں سرکاری کارخانے کی تیار کی ہوئی پتلی چھینٹ سے کام چلانا پڑا۔ تھیٹر البتہ نسبتاً بہتر حالت میں تھا، لیکن بجلی کی سپلائی خراب ہونے کے باعث روشنی بہت مدھم اور ناقابلِ اعتبار تھی۔

لیکن فیسٹول شروع ہونے کے دن لوگ بے تحاشا تعداد میں تھیٹر پر جمع ہو گئے۔ اٹلی سے آئی ہوئی ایک کیتھولک امدادی کارکن اونیستا کارپینے ان مٹھی بھر غیر ملکیوں میں شامل تھی جو ان دنوں نوم پنہ میں رہ رہے تھے۔ وہ لوگوں کے اس ردعمل پر حیران رہ گئی: شہر نہایت خستہ حالت میں تھا؛ ہر طرف ملبے کے ڈھیر تھے؛ ملبہ کھڑکیوں سے باہر آ رہا تھا، فٹ پاتھوں پر بکھرا ہوا تھا؛ شہر کی سڑکوں پر جا بجا تباہ شدہ کاریں پڑی تھیں؛ رقم مفقود تھی اور خوراک بہت کم — "میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ ایسی صورتِ حال میں لوگ موسیقی اور رقص پر توجہ دیں گے۔" لیکن تھیٹر کھچا کھچ بھر چکا تھا اور لوگ تھے کہ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اندر سخت گرمی تھی۔

ایوا مسلیویک، جو ایک کویکر امدادی مشن قائم کرنے کی غرض سے حال ہی میں وہاں پہنچی تھی، رقص اور موسیقی کے اس مظاہرے میں موجود تھی۔ جب پہلا سازندہ اسٹیج پر نمودار ہوا تو اسے اپنے چاروں طرف سے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد جب رقاص اپنے بھدے، جلدی میں تیار کیے گئے لباسوں میں اسٹیج پر آئے تو سب لوگ ایک دم رونے لگے — بوڑھے، جوان، سپاہی، بچے۔ "تم ان کے آنسوؤں میں سے کشتی پر سوار ہو کر نکل سکتے تھے۔"

جو لوگ اس کے برابر میں بیٹھے تھے، بولے: "ہمارا خیال تھا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، کہ اب ہم اپنی موسیقی کبھی نہ سن سکیں گے، اپنا رقص کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔" ان کے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ لوگوں نے رقص کا پورا مظاہرہ روتے ہوئے دیکھا۔

یہ ایک طرح کا نیا جنم تھا: ایک ایسا لمحہ جب زندہ بچ نکلنے کے ملال اور زندہ ہونے کی مسرت میں تمیز کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

**

انتخاب

نجیب محفوظ

کا ناول

شادیانے

(پہلا حصہ)

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

آئندہ صفحات میں مصر کے معروف ادیب نجیب محفوظ کے ناول افراح القبہ کے اردو ترجمے کا پہلا حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ترجمے کا دوسرا اور آخری حصہ اگلے شمارے میں شامل ہوگا۔ یہ ترجمہ، جسے اردو میں شادیانے کا عنوان دیا گیا ہے، ناول کے انگریزی ترجمے کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے جو Wedding Song کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۸۴ میں شائع ہوا۔ تاہم، اردو ترجمہ کرتے ہوئے ناول کے اصل عربی متن کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ناول کے عنوان کی تھوڑی سی وضاحت کر دینا مناسب ہوگا۔ افراح القبہ کا لغوی مفہوم کسی بزرگ کے مزار پر برپا کیا جانے والا شادی کا جشن ہے۔ لیکن اس ناول میں پیش آنے والے واقعات کا محلِ وقوع شہر قاہرہ ہے جہاں یہ اصطلاح ایک مخصوص معنی رکھتی ہے۔ "القبہ" خدیوِ مصر کے سرکاری محلات میں سے ایک کا نام تھا اور خود نجیب محفوظ کی وضاحت کے مطابق خدیو کے خاندان کی شادیوں کی خاص بات وہ جلوس تھے جن میں لوگ گاتے اور رقص کرتے چلتے تھے۔ ان جلوسوں میں گائے جانے والے گیتوں کو رفتہ رفتہ افراح القبہ سمجھا جانے لگا۔

نجیب محفوظ کو عربی زبان کے نمایاں ترین ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شہرت کی اصل بنیاد ان کے طویل ناول ہیں جو قاہرہ کی زندگی کی پیچیدگی اور رنگینی کو نہایت تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن مختصر ناولوں اور کہانیوں میں بھی اس منفرد فکشن نگار کی فنی مشاقی اور انسانی نفسیات سے گہری شناسائی اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ "شادیانے" بھی اس کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ نجیب محفوظ کے پچیس سے زائد ناول اور کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، اور ان میں موضوعات، اسلوب اور نقطۂ نظر کا تنوع ملتا ہے، لیکن جس موضوع سے نجیب محفوظ کو ہمیشہ شدید دلچسپی رہی ہے وہ 'وقت' اور اس کے اثر سے انسانی زندگی میں آنے والی حیران کن تبدیلی ہے۔ اس ناول میں بھی، جو عربی میں پہلی بار ۱۹۸۱ میں شائع ہوا، پڑھنے والے کی توجہ وقت کے بہاؤ پر مرکوز ہوتی ہے جو محبت کو نفرت میں، حسن کو بدصورتی میں، وفاداری کو خیانت میں اور آدرش پسندی کو بدعنوانی میں بدل دیتا ہے اور اپنا انمٹ نشان کہانی کے تمام کرداروں پر چھوڑ جاتا ہے، اور یہاں تک کہ اس قدیم مکان پر بھی جو ان کرداروں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ نجیب محفوظ نے کہانی کو چار کرداروں کی زبانی بیان کیا ہے اور اس مقصد کے لیے اندرونی خودکلامی کی تکنیک نہایت کامیابی سے اختیار کر کے ان میں سے ہر ایک کی انفرادی شخصیت اور نقطۂ نظر کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کی اس ساخت سے یہ نکتہ بھی بڑی خوبی سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح واقعات کی مختلف تفصیلیں لوگوں پر جدا جدا اثر ڈالتی ہیں اور یوں نہ صرف ان کے انفرادی نقطۂ نظر کی تشکیل کرتی ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے خدوخال کو متعین کرتی ہیں۔

اس سے قبل آج کے شمارہ ۲ (سرما ۱۹۹۰) میں نجیب محفوظ کی ایک کہانی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

طارق رمضان

ستمبر۔ طلوعِ خریف۔ تیاری اور ریہرسل کا مہینا۔ میٹنگ کے کمرے کے سکوت میں، جہاں بند دریچوں اور گرے ہوئے پردوں کے باعث ایرکنڈیشنر کی زن زناہٹ کے سوا کوئی آہٹ نہیں پہنچ سکتی، ہمارے ہدایت کار سالم العجرودی کی آواز اچانک بلند ہوتی ہے اور خیالات اور الفاظ بکھیرتی چلی جاتی ہے، جیسے ہماری پُرتوجہ خاموشی کی درازوں میں سے تیز ہوا کی مانند گزرتی ہو۔ مکالمہ پڑھنے سے پہلے اس کی نگاہ اُس اداکار یا اداکارہ کو مستعد کر دیتی ہے جسے کبھی یہ مکالمہ ادا کرنا ہے۔ مردانہ یا نسوانی کردار کے مطابق کبھی ملائم اور کبھی کرخت آواز میں، تُند حقیقت سے بھرے ڈرامے کے مناظر ہماری نظروں کے سامنے سُرعت سے بنتے اور مٹتے ہیں، اور ہم ان کی سفاک بے باکی اور لپک دینے والے چیلنج سے مغلوب سے ہو جاتے ہیں۔

ایک مستطیل میز کے سرے پر، جس پر سبز کپڑا منڈھا ہے، ہمارا پروڈیوسر سرحان الہلالی مورچا سنبھالے بیٹھا ہے اور ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کی نگرانی کرنے میں ہمہ تن مشغول ہے۔ اس کے سپاٹ چہرے پر چمکتی ہوئی عقابی آنکھیں ہم پر جمی ہوئی ہیں، جب کہ ہم سب گردنیں لمبی کر کے العجرودی کی سمت نگراں ہیں۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ ایک دبیز سگار کے دائرے سے چپکے ہوئے ہیں۔ اس کی شدتِ انہماک کے باعث کوئی فرد نہ اس تسلسل کو توڑنے کی ہمت کر سکتا ہے نہ کسی تبصرے کی۔ وہ اس قدر ٹھنڈے پن کے ساتھ ہماری متوقع شرمندگی سے تجاہل برت رہا ہے کہ ہم خود اسے نظرانداز کرنے پر مجبور ہیں۔ کیا اس آدمی کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ پڑھی جانے والی تحریر کے اصل معنی کیا ہیں؟

میری نظروں کے سامنے سفاکی اور وحشت کے مناظر گزر رہے ہیں۔ یہ تناؤ ختم کرنے کے لیے میں کسی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کمرے میں بھرے دھوئیں کے گاڑھے بادل میں مَیں خود

Scanned with CamScanner

کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ایک قسم کے خوف نے آ لیا ہے۔ اس گھبراہٹ کے دورے پر قابو پانے کے لیے میں کبھی کمرے کے عقب میں رکھی رعب دار میز پر نظریں جما دیتا ہوں اور کبھی دیوار پر آویزاں تصویروں کو یکسوئی سے تکنے لگتا ہوں ـــ دُرّیہ سانپ کے ساتھ قلوپطرہ کے روپ میں خودکشی کرتی ہوئی، اسماعیل انشونی کے کردار میں سیزر کی لاش پر تقریر کرتا ہوا ـــ مگر میرے ذہن میں پھانسی کا پھندا جھول رہا ہے۔ میرے اندر شیاطین تلملا رہے ہیں۔

سالم العبرودی نے آخرکار "پردہ گرتا ہے" کے الفاظ کہے اور کمرے میں موجود ہر فرد نے حیران و پریشان نظروں سے سرحان الہلالی کی جانب دیکھا جو کہہ رہا تھا:

"کہیے، آپ لوگوں کی اس ڈرامے کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

ہماری تھیٹر کمپنی کی اسٹار دُرّیہ نے مسکرا کر کہا:

"اب سمجھ میں آیا کہ مصنف اس موقعے پر کیوں نہیں آیا۔"

"مصنف!" میں نے ہمت کر کے کہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ قیامت آ چکی ہے۔ "وہ مجرم ہے۔ ہمیں اس کو فوراً عدالت کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

"بکواس مت کرو، طارق!" سرحان الہلالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اپنے دماغ سے یہ خرافات فوراً نکال دو۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم ایک اداکار ہو۔"

میں احتجاج میں کچھ کہنے کو ہوا مگر الہلالی نے جھنجلاتے ہوئے مجھے خاموش کر دیا۔ "بس، ایک کلمہ بھی نہیں!" پھر وہ سالم سے مخاطب ہو گیا جو بُدبُدا رہا تھا، "بہت پریشان کن ڈراما ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھنے والوں پر اس کا اثر کیا ہو گا۔"

"میں نے تو اسے قبول کر لیا ہے اور میں مطمئن ہوں۔

"لیکن کیا اس کی شدت حد سے تجاوز نہیں کر جاتی؟"

تھیٹر کمپنی کا دوسرا اسٹار سماعیل شدت لہجے میں بولا:

"میرا کردار تو نہایت مکروہ ہے۔"

الہلالی نے کہا:

"دیکھو، مثالی انسان سے بڑھ کر کوئی سفاک نہیں ہوتا۔ دنیا بھر میں سارے خون خرابے کا

ذمے دار کون ہے؟ یہی مثالی انسان۔ تمہارا کردار نہایت اعلیٰ جہت میں المناک ہے۔"

"مگر بچے کے قتل سے تو دیکھنے والوں کی ہیرو سے ہم دردی بالکل ختم ہو جائے گی،" سالم العبودی نے اعتراض کیا۔

"فی الحال ہم تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ بچے کا قتل حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ عباس یونس نے مجھے نہ صرف یہ ڈراما قبول کرنے کے لیے قائل کر لیا بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری تھیئٹر کمپنی کی پوری تاریخ میں شاندار ترین کامیابی حاصل کرے گا۔"

"سچ کہتے ہو،" تھیئٹر کے تبصرہ نگار فواد شلبی نے کہا۔ "مگر بچے والا سین نکالنا پڑے گا،" اس نے اضافہ کیا۔

"مگر یہ ڈراما نہیں ہے!" میں نے چلا کر کہا۔ "یہ تو اعترافِ جرم ہے! یہ حقیقت ہے۔ یہ سب کردار ہم لوگوں کے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے!" الہلالی نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ میں اتنا بھی نہیں سمجھوں گا؟ میں نے اس میں تمہیں بھی پہچان لیا اور اپنے آپ کو بھی۔ مگر ڈراما دیکھنے والوں کو ان باتوں کا کیا پتا؟"

"یہ خبر پھیلے بغیر نہیں رہے گی۔"

"بلا سے پھیل جائے! نقصان صرف مصنف کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے تو ڈرامے کی کامیابی یقینی ہے۔ کیوں فواد؟"

"سو فی صد!"

"اور اب،" الہلالی نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا، "ہم پر لازم ہے کہ ہم اسے نہایت نفاست اور اہتمام کے ساتھ اسٹیج پر پیش کریں۔"

"یقیناً! یہ تو لازمی بات ہے۔"

"مگر ناظرین،" العبودی بڑبڑایا۔ "اُن کا ردِ عمل کیا ہو گا؟"

"وہ میرا ذمہ ہے،" الہلالی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ہم فوراً تیاریاں شروع کرتے ہیں۔"

میٹنگ ختم ہو گئی۔ مگر میں تنہائی میں الہلالی سے دو باتیں کرنے کے لیے رک گیا۔ وہ میرا

Scanned with CamScanner

پرانا دوست ہے۔ کبھی ہم پڑوسی بھی تھے۔ اسی بُوتے پر میں اسے معاملہ عدالت تک پہنچانے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری تلملاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے سمجھایا، 'تمھارے لیے یہ ایک نادر موقع ہے کہ اپنی اصل زندگی کے تجربے کو جیوں کا توں اسٹیج پر پیش کر دو۔"

"عباس یونس ڈراما نگار نہیں بلکہ مجرم ہے!"

"اور یہ ایسا موقع ہے کہ تم ایک اہم اداکار بن سکتے ہو۔ زندگی بھر چھوٹے موٹے کردار ادا کرتے رہے ہو۔"

"یہ صاف جرم کا اقرار ہے سرحان۔ آخر ہم کیسے ایک قاتل کو بچ کر نکل جانے دیں؟"

"طارق، ڈراما بے حد شاندار ہے۔ اسے دیکھنے بے شمار لوگ آئیں گے۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے!"

میرا دل غصّے اور تلخی سے بھر گیا۔ ماضی کے غم اپنے تمام پچھتاووں اور ناکامیوں سمیت میرے ذہن پر بادل کی طرح چھا گئے۔ اور پھر مجھے ایک خیال آیا: اب مجھے اپنے پرانے دشمن سے انتقام لینے کا موقع ملا ہے۔

***

"تمھیں یہ سب کیوں کر معلوم ہوا؟"

"معاف کرنا، ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

***

'پھر کیا ارادہ ہے؟' سرحان الہلالی نے پوچھا۔

'اوّل و آخر میرا مقصد یہ ہے کہ قاتل کیفرِ کردار کو پہنچے۔"

"بہتر ہوگا کہ تمھارا اوّل و آخر مقصد یہ ہو کہ تم اپنا پارٹ یاد کرو۔"

میں نے مان لیا "میں اس موقعے کو گنواؤں گا نہیں۔"

***

وہ نعش... میں نے جب دیکھی تھی تو مجھ پر احساسِ شکست ایسے غالب آ گیا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، گویا زندگی میں پہلی بار کوئی نعش دیکھ رہا ہوں۔ سب لوگ حیران رہ گئے تھے۔ یہ غم نہ تھا۔ نہ پچھتاوا تھا۔ یہ محض ایک وقتی جنون کا دورہ تھا۔ دوسرے عزاداروں کے پُرحقارت تاثر میری آنسو بھری آنکھوں میں پانی کے سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے اور میں ان کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مبادا میرا رونا ہسٹیریائی قہقہوں میں بدل جائے۔

***

بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے مجھ پر کس قدر شدید مالیخولیائی اداسی طاری تھی۔ وہ سب، مرد عورتیں اور بچے... وہ گرد و غبار اور شور... باب الشعریہ میں... میں برسوں سے وہاں نہیں گیا تھا۔ یہ پاکی اور ناپاکی کا محلہ... خریف کے سفید آسمان تلے جہاں کی ہر چیز حقارت اور غم میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہاں کی یادیں... جب میں تحیہ کو پہلی بار یہاں لایا تھا۔ وہ بشاشت سے میرے بازو میں بازو ڈالے ہوئے تھی۔ وہ یادیں مجھے اُتنی ہی اذیت پہنچا رہی ہیں جتنی میری موجودہ حالت... اب جب کہ میں کیچڑ میں لوٹ رہا ہوں، امّ بانی کے پروں کے نیچے دبا ہوا۔ اوہ! لعنت ماضی اور حال پر۔ لعنت تھیوسٹر اور ان چھوٹے چھوٹے کرداروں پر۔ لعنت میرے ہیرو بننے کے خواب پر ـــــ پچاس سے اوپر کی اس عمر میں، اور اپنے دشمن کے لکھے ہوئے ڈرامے میں جو خوبی ہے۔ چلتے چلتے میں بجری فروشوں کے بازار کی تنگ، بل کھاتی گلی سے، اس کے قدیم، تقطرات میں ڈوبے صدر دروازے سے گزر گیا۔ دو نئی، ننگی بچی عمارتیں پیچھے رہ گئیں۔ اب سامنے وہی بیت القدیم تھا جس میں مقفل تاریک اور خوں آشام ماضی اب بھی باہر جھانک رہا تھا۔

ویسے یہاں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ نچلی منزل کے پہلے کمرے کو دکان میں تبدیل کر دیا گیا

ہے جہاں تربوز کے بیج بھونے اور بیچے جاتے ہیں۔ کرم یونس بیوی کے سامنے دکان داری کرنے کو تیار بیٹھا ہے۔ جبل نے ان دونوں کی کایا کلپ کر دی۔ دونوں کے چہروں پر مایوسی ہے۔ جس وقت ان کے بیٹے کا ستارہ عروج پر ہے، ان کی اپنی دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔

اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ بیوی بھی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ ان کی نگاہوں میں کسی قسم کی مروت تک نہیں۔ میں نے کرم کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ "طارق رمضان،" وہ کھرکھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہاں کیسے؟" مجھے اس سے بہتر استقبال کی توقع بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کے اکھڑپن سے صرفِ نظر کیا۔ علیہ یک دم کھڑی ہوئی، پھر واپس اپنے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ "زمین پر واپسی کے بعد پہلی ملاقات،" اس نے سرد مہری سے کہا۔ اس کے خدوخال میں اب تک ماضی کے جمال کی یاد سی باقی ہے اور ایسے عذاب سے گزرنے کے باوجود کرم یونس کے ہوش و حواس سلامت ہیں۔ یہ جوڑا ـــــ جس نے ایک قاتل مصنف کو جنم دیا!

ماحول کے تناؤ کو نارمل کرنے کے لیے میں نے کہا کہ دنیا مصائب کی آماج گاہ ہے اور میں خود گم کردہ منزل ہوں۔

"تم ایک ڈراونا خواب ہو،" کرم یونس نے کہا۔

"دوسروں سے بڑھ کر بُرا نہیں ہوں،" میں نے کہا۔ مجھ سے کسی نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا؛ گاہکوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس پر میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنے آنے کا مقصد ضرور پورا کروں گا۔

"کیا بات ہے؟" کرم یونس نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"بری خبر ہے۔"

"بری خبر کا اب ہمارے لیے کچھ مطلب نہیں۔"

"اچھا؟ چاہے وہ عباس یونس ہی کے بارے میں کیوں نہ ہو؟"

اس کی آنکھوں میں خوف جھلک آیا۔ "تو ہمیشہ اس سے دشمنی کرے گا۔" اس نے تھوکا۔ "آخری دم تک!"

"وہ سعادت مند اولاد ہے۔ جب میں نے تھیٹر میں کام پر واپس جانے سے انکار کر دیا تو اس نے یہ دکان کروا دی،" کرم نے کہا۔

"اور اس کا ڈراما بھی قبول کر لیا گیا ہے،" حلیمہ فخر سے بولی۔

"کل ہمیں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔"

"مجھے یقین ہے کہ بے حد شان دار ڈراما ہے۔"

"انتہائی ہولناک ہے۔ تمھیں اس کے بارے میں کچھ خبر بھی ہے؟"

نہیں تو۔

"وہ تمھیں کیسے بتاتا۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ اس لیے کہ یہ ڈراما اسی گھر کے بارے میں ہے۔ یہاں جو کالے کرتوت ہوئے اُن کا راز فاش کرتا ہے۔ یہاں ہونے والے قبیح جرم پر نئی روشنی ڈالتا ہے۔"

کرم اچانک فکرمند ہو گیا۔ "کیا مطلب؟" اس نے پوچھا۔

تم خود دیکھ لینا۔ ہم بھی دیکھیں گے۔ اس نے ہر چیز دکھائی ہے — ہر بات۔ سنو گے؟"

"کیا جیل والی بات بھی؟"

"جیل بھی۔ تہیہ کی موت بھی۔ یہ بھی دکھایا ہے کہ پولیس سے تمھاری مخبری کس نے کی۔ اور یہ بھی کہ تہیہ اپنی موت نہیں مری تھی، اسے قتل کیا گیا تھا۔"

"کیا بک رہے ہو!"

ہاں ہاں۔ عباس نے قتل کیا تھا۔ ڈرامے میں جو شخص عباس کا کردار ادا کر رہا ہے وہی تہیہ کو قتل کرتا ہے۔"

بکواس مت کر!" حلیمہ اچانک غصے میں زور سے چلائی۔ "تُو عباس کا عدو ہے!"

"میں اُس کا شکار ہوں، اور تم بھی۔"

"تو... تو کیا وہ ڈراما نہیں ہے؟" کرم عباس نے کہا۔

"اس ڈرامے سے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ تمھاری مخبری کس نے کی اور تہیہ کو قتل کس نے کیا۔"

"بکواس... خرافات!"

"عباس بتائے گا کہ یہ کیا بک رہا ہے،" علیمہ نے کہا۔

"جاؤ جاؤ، خود جا کر ڈراما دیکھ لو۔"

"او مخبوط الحواس دیوانے! نفرت نے تجھے اندھا کر دیا ہے۔"

"نفرت نے نہیں، اس مکروہ جرم نے۔"

"گو خود جرم سے کم تو نہیں۔ یہ تو محض ایک ڈراما ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔"

"پاگل! خبطی! میرا بیٹا بے وقوف ضرور ہے مگر نہ وہ خائن ہے نہ قاتل۔"

"وہ خائن ہے اور قاتل ہے۔ وہ بے وقوف بالکل نہیں ہے۔"

"تم یہی سمجھنا چاہتے ہو، ہے نا؟"

"تحیہ کے قاتل کو سزا ملنی چاہیے۔"

"وہی نفرت... وہی حقارت! تحیہ جب تمہارے پاس تھی تو تم نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟"

"میں اس سے عشق کرتا تھا۔ یہی کافی تھا۔"

"ارے ایک آوارہ لفنگا کیا عشق کرے گا!"

"اری بڑھیا! تیرے خاوند اور بیٹے سے بہتر آدمی ہوں میں!" میں نے چیخ کر کہا۔

"اچھا تم چاہتے کیا ہو؟" کرم غرایا۔ نفرت اور غصے سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ایک پیاستر کے بیج دے دو۔"

"دور دفع!"

***

جب میں عورتوں اور بچوں کے انبوہ کو کاٹتا ہوا لوٹ رہا تھا تو میرے خیالات ڈرامے ہی پر مرکوز تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عباس نے اپنے ماں باپ کو ڈرامے کا پلاٹ نہیں بتایا۔ یہ اس کے جرم کا ایک اور ثبوت تھا۔ لیکن جب کسی کو خواب میں بھی اس پر شک نہیں تھا تو آخر اس

خوفناک راز کو فاش کرنے کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی؟ کسی بھی قیمت پر کامیابی کی حسرت میں؟ میں نے قیاس دوڑایا۔ تو کیا اسے پھانسی کے بدلے شہرت مل جائے گی؟

***

"طارق، اب میں کیا کہوں۔ یہ قسمت کی بات ہے ___ نصیب کی بات!"

***

جس موڑ پر راستا شارع الجیش سے جا ملتا تھا، وہاں سے میں بائیں جانب العتبہ کی طرف چل پڑا جہاں ایک گلی چھوڑ کر وہ کئی منزلہ رہائشی عمارت تھی جو اب برسوں میں اندھیری، چیچک زدہ اور نہایت تنگ پڑ گئی ہے۔

تحیہ، تجھے اپنے کیے کی سزا تو بھگتنی ہی تھی۔ گر تیرا قاتل وہی ہے جس کے لیے تو نے مجھے چھوڑا تھا تو پھر تیری کرنی کا پھل تجھے ملا۔ کس قدر بھیڑ ہے! اب لوگ ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیں گے۔ اُم ہانی نہ ہوتی تو میں تو بالکل سڑک پر آ جاتا۔ عباس، تیرے عروج کی انتہا بس پھانسی کا پھندا ہی ہو گی۔ اور میں؟ میرا واحد طرۂ امتیاز میری قوتِ مردمی رہ گئی ہے۔ ورنہ تو میری ہزیمت دائمی ہے۔ ایک تیسرے درجے کے اداکار کی زندگی کا بھی کیا کوئی مطلب ہو سکتا ہے؟

گزرے ہوئے اچھے زمانے میں شہوت ہی میری استاد تھی۔ شہوت ہی نے مجھے زمانہ ساز، گرگِ باراں دیدہ کی سی میٹھی میٹھی باتیں کرنا سکھایا۔ ہمارے معاشقے نے اسٹیج کے عقب میں جنم لیا جب دوسرے اداکار اسٹیج پر راسپوتین کے قتل کی سازش کر رہے تھے۔

"تحیہ، تمھیں اسٹار ہونا چاہیے تھا، میری طرح دوسرے درجے کی اداکار نہیں۔"

"سچ مچ، طارق؟ مبالغہ تو نہیں کر رہے؟"

"بالکل نہیں۔ میں تجربے سے کہہ رہا ہوں۔"

"تجربے سے؟ یا پسندیدگی سے؟"

Scanned with CamScanner

"اوں ہوں! میری پرکھ پر تو محبت بھی اثر نہیں ڈال رہی۔"

"محبت؟"

آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ ہم دونوں اکٹھے شارعِ جلال پر جا رہے تھے۔ ہمیں شدید سردی کا کچھ احساس نہ تھا۔ دونوں اپنے خوابوں کی گرمی کے نشے میں تھے۔

"ہاں، محبت،" میں نے کہا۔ "کیا ہم یہ ٹیکسی پکڑیں؟"

"اب مجھے گھر پہنچنا چاہیے۔"

"کیا اکیلے ہی؟"

"میرے چھوٹے سے فلیٹ میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"شارع الجیش پر۔"

"پھر تو ہم پڑوسی ہیں۔ میرا کمرہ باب الشعریہ پر ہے۔ کرم یونسی کے مکان میں۔"

"وہ؟ پردے کے پیچھے سے اداکاروں کو ڈائیلاگ بتانے والا؟"

"ہاں۔ تو اب تم مجھے اپنے گھر بلا رہی ہو یا میں تمہیں اپنے کمرے میں لے چلوں؟"

"اور کرم اور حلیمہ کیا کہیں گے؟"

میں ہنسا۔ وہ مسکرائی۔ "کیا ان کے گھر میں کوئی اور نہیں؟"

"ان کا ایک ہی بچہ ہے۔ وہ تو ابھی پڑھ رہا ہے۔"

وہ حسین تھی۔ اس کا ایک فلیٹ بھی تھا۔ اور اس کی تنخواہ میرے جتنی تھی۔

***

رہبر سل کے دفتر میں سرحان العلائی نے آخر مجھے کیوں بلا بھیجا ہے؟

دھوپ کی گرم روشنی میں، کانفرنس میز پر جھکے ہوئے، مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر اس نے کہنا شروع کر دیا:

"تم دو مرتبہ رہبر سل سے خیر حاضر رہے ہو طارق؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"دوستی اور کام کو گڈمڈ مت کرو۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تمہاری وجہ سے عباس روپوش ہو گیا ہے؟"

"شاید وہ راز فاش ہونے کی وجہ سے بھاگ گیا۔"

"کیا تم اب بھی ان احمقانہ خیالات سے چمٹے ہوئے ہو؟"

"وہ خونی ہے۔ اس میں کوئی شک ہی نہیں۔"

"یہ ایک ڈراما ہے۔ اور تم اداکار ہو۔ وکیلِ نیابت نہیں ہو۔"

"لیکن وہ قاتل ہے۔ یہ بات تم بھی میری طرح خوب جانتے ہو۔"

"نفرت نے تمہاری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

"مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"ابھی تمہاری عشق میں ناکامی کا علاج نہیں ہوا؟"

"ان ریہرسلوں سے ہم ایک قاتل کو کامیاب بنا رہے ہیں۔"

"کامیابی ہماری ہوگی۔ اور تمہیں برسوں بعد شہرت پانے کا موقع مل رہا ہے۔"

"سرحان... پلیز... زندگی..."

"بس بس بس! زندگی کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ یہ فلسفہ میرے سامنے جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر رات اسٹیج پر یہی سب کچھ سنتا ہوں، اور اس سے اب مجھے متلی ہونے لگی ہے۔ ذرا اپنی صحت کو تو دیکھو۔ سیکس، منشیات اور غلط قسم کی خوراک نے تمہارا ناس کر رکھا ہے۔ اس شیدہ والے ڈرامے میں تم نے امام کا کردار نشے میں ادا کیا اور اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوئے۔"

"اس بات کا صرف تم کو علم ہے۔"

"غلط! سامنے کی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک سے زیادہ ہوسٹوں کو تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی۔ اب تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں...."

میں نے گھبرا کر کہا، "زندگی بھر کی دوستی کو یوں تو خاک میں نہ ملاؤ۔"

"اور تم نے ایک آیت بھی غلط پڑھی تھی۔ یہ غلطی ناقابلِ معافی ہے۔"

Scanned with CamScanner

"مگر ہوا تو کچھ نہیں۔"

"دیکھو میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم پر کیا بھوت سوار ہو گیا ہے؟ یہ کیا جاسوسی کرتے پھر رہے ہو! ٹھیک سے اپنا پارٹ یاد کرو، زندگی میں ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔" میں کمرے سے نکلنے لگا تو اس نے اضافہ کیا:

"اور ام ہانی سے ذرا بہتر سلوک کرو تو اچھا رہے گا۔ اگر اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا تو تمہارا حال بیچ بیچ برا ہو جائے گا۔"

وہ میری ہی عمر کی ہے، کم بخت، اور اتنی عقل نہیں کہ میری شکر گزار ہو۔ تمیہ میں کے سامنے ہی مری تھی اور اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ اور میں ہر رات ناکام عاشق کا کردار ادا کرنے پر، ہر رات اس کی لاش پر رونے پر مجبور ہوں۔ کیوں کہ وہ پچھتائے بغیر مری، میرے بارے میں سوچے بغیر، یہ جانے بغیر کہ اسے قتل کیا گیا ہے، اسے اُس آدمی نے قتل کیا ہے جو ڈرامے میں خودکشی کرتا ہے اور اصل زندگی میں جس کو پھانسی لگنی چاہیے۔

اور اب اس جرم سے بیک وقت ایک مصنف اور ایک اداکار جنم لے رہے ہیں۔

***

"کیا تمیہ نہیں آئی؟"

"نہیں۔"

"آج اسے تھیٹر میں بھی نہیں دیکھا۔"

"وہ تھیٹر نہیں جا رہی۔"

"کیا مطلب، عباس؟"

"طارق صاحب، معاف کیجیے گا، تمیہ نہ یہاں آ رہی ہے اور نہ تھیٹر جا رہی ہے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟"

"معاف کیجیے گا، ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

"کیا؟"

Scanned with CamScanner

"ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"حرام زادے! تو پاگل ہو گیا ہے! یہ کیا بک رہا ہے؟"

"سمجھ سے کام لیں۔ ہم آپ کے ساتھ عزت کا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ براہِ مہربانی..."

میں نے اسے طمانچا مارا تھا اور اچانک وہ نفرت سے چیتے کی طرح غرایا تھا۔ اس نے مجھے گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک طاقت ور نوجوان تھا، حالاں کہ اس کی ایک آنکھ میں نقص تھا۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔

کرم بدنس اور حلیمہ چیختے چلاتے دوڑے آئے تھے۔ "ہائیں ہائیں! کیا ہوا؟"

"یہ کیا حماقت ہے!" میں چیخا تھا۔ "یہ کوئی مذاق ہے! اماں کا لاڈلا تحیہ سے شادی کرنے والا ہے!"

"تحیہ؟" حلیمہ بیٹے پر پھٹ پڑی تھی۔ "یہ کیا جنون ہے؟ تم سے دس برس بڑی ہے وہ!"

عباس خاموش رہا۔

"یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے؟" میں نے چیخ کر کہا تھا۔ "میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

"اب تم اور بھی حالات مت بگاڑو،" حلیمہ چلائی تھی۔

"میں اس گھر کو اور اس کے تمام رہنے والوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دوں گا،" میں چیخا تھا۔

"اپنا سامان سمیٹو اور یہاں سے چلے جاؤ،" حلیمہ نے خاموشی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم سب بھاڑ میں جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا تھا اور غصے میں آندھی کی طرح اس گھر سے نکل آیا تھا۔

***

ٹوٹا ہوا، شکست خوردہ، اور میں اس وقت جب میں انتہائی پستی میں تھا، میرے قلب میں محبت کا شعلہ مشتعل ہو گیا۔ یہ سچ ہے کہ میں تحیہ کو اپنی ملکیت، پرانے جوتے کی طرح اپنا مطیع سمجھنے لگا تھا۔ میں اُسے جھڑکتا تھا، اس کی توہین کرتا تھا، اسے مارتا تھا۔ لیکن میں تصور بھی نہیں کر

سکتا تھا کہ وہ میرے بغیر رہ سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے جدا رہنے پر وہ خودکشی کو ترجیح دے گی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اگر اس نے اتنی مکاری اور سادگی سے مجھے چھوڑ دیا تو میرا زندگی سے اعتبار اٹھ جائے گا، میرا اعتماد، میرا احساسِ ملکیت، سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ سکون کی جگہ مجھ پر محبت کی صورت میں ایک جنون طاری ہو گیا ـــــ جنون، جو وجود کے کسی تیرہ و تار سیاہ خانے سے نکل آیا تھا، برسوں کی نیند سے اچانک بیدار ہو گیا تھا اور اب اپنی مرغوب غذا کی تلاش میں بلبلا رہا تھا۔

جب میرے مسلسل گھنٹی بجانے کی آواز پر وہ دریچے میں آئی تو اس کی نگاہوں میں الجھن تھی، جیسے وہ متذبذب ہو۔ مگر ان میں کوئی لتجا نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں زندگی کے اس بحران کا سامنا کرنے کے لیے تیار نظر آ رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی باہمت، اطاعت سے آزاد اور ایک حیاتِ نو کی منتظر ایک نئی شخصیت کسی سرحد کو پار کرتی ہوئی ایسے عالم میں داخل ہو رہی ہے جہاں ناگہاں شدید قوت کے اظہار کا واضح امکان ہے۔

"دروازہ کھولو، ثمیہ،" میں نے اسے رضامند کرنے کی کوشش کی۔

"اب تم سب کچھ جانتے ہو۔"

"کیا مجھے باہر ہی کھڑا رکھو گی؟ یوں اجنبی کی طرح؟"

"طارق، اب میں کیا کہوں! شاید ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔ یہ ہماری قسمت ہے۔"

"یہ خبث ہے، جنون ہے۔"

"مجھے خود تم کو بتا دینا چاہیے تھا۔"

"مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ دروازہ کھولو!"

"نہیں۔ میں تم سے شرافت سے پیش آ رہی ہوں۔"

"گھورندی ہے!"

"ٹھیک ہے، تو پھر خدا حافظ۔"

"میں تمھیں چھوڑوں گا تو نہیں!"

"ہم فوراً شادی کر رہے ہیں۔"

"ایک طالب علم سے؟ جنون... کانا..."

"قسمت آزمائی ہوں۔"

"دروازہ کھول، جنوزا!"

"نہیں۔ ہمارا تعلق ختم ہوا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میرے بغیر تجھے محبت کہیں نہیں ملے گی۔"

"ہم اس طرح زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔"

"تم سی ہاس کو تو نہیں پہنچ گئی تھیں کہ یہ حماقت کر ڈالی۔"

"خدا کے لیے! اب ہم دوستوں کی طرح رہیں گے۔"

"مایوسی میں تم سے غلطی ہو گئی۔"

"نہیں۔"

مجھے خبر ہے تم جیسی عورتوں پر اس طرح کے دورے پڑتے ہیں۔

"اللہ تجھے معاف کرے!"

"اے جنوزا! تو بدل کب گئی؟"

"تیرے حق میں میں نے کوئی خطا نہیں کی ہے۔"

"تو عرصے سے کذب میں رہتی آئی ہے۔"

"مذمت کیے جاؤ۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

تجھ جیسی رنڈی کوئی دوسری نہ ہوگی۔

اس نے زور سے دریچہ بند کر دیا۔

***

کچھ عرصے تک تو میں کرم یونس کے گھر ہی میں رہتا رہا۔ عباس یونس چلا گیا تھا۔ اس نے کوئٹہ میں باپ والی ملازمت کر لی تھی۔ کرم یونس کو مکان سے ہونے والی آمدنی کے بعد اس

ملازمت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گھر کے ماحول میں کشیدگی تھی۔ سرحان البحیری نے مجھے مجھے کلیجے میں لے جا کر سرگوشی میں کہا:

"ہمارے لطف میں خلل مت ڈالو۔ عقل سے کام لو۔ ایک اشارے پر ام ہانی تمہیں مل جائے گی، یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ اور اس کی تنخواہ زہرہ سے دگنی ہے۔"

البحیری عورتوں کا تو دیوانہ ہے لیکن محبت سے ناواقف۔ اس نے ایک دو بار زہرہ کے ساتھ بھی ہم بستری کی تھی لیکن اسے جنسی تعلق اور دلم کے رشتے کی کیا خبر! ہم بستری تو وہ یوں طلب یا مسترد کرتا ہے گویا یہ اس کے روزمرہ ادارتی معمول کا حصہ ہو۔ جب اسے ضرورت ہوتی ہے تو طورآشت پر رکھ کر پیش کر دی جاتی ہے۔ مجھے اپنے بارے میں اس کے خلوص پر شک نہیں ہے۔ اس نے اپنے تھیٹر میں مجھے کئی موقعے دیے جن سے فائدہ نہ اٹھانے میں میرا ہی قصور تھا۔ لیکن اب اسے یقین ہے کہ عباس کے ڈرامے میں میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس لیے جب بی نے بتایا کہ وہ ام ہانی سے اشارتاً ذکر کر چکا ہے کہ میں اس کے پاس واپس آجاؤں گا تو میں کمپنی کی اس خیاطہ کے پاس چلا گیا! کسی تلخ جذباتی تجربے کو فراموش کرنے کی خاطر نہیں بلکہ زیادہ تر اپنی تنہائی سے فرار حاصل کرنے اور اپنی افسوس ناک معاشی حالت سنبھالنے کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں زہرہ کی شادی کی ناکامی کی توقع کر رہا تھا۔ اس کا ہمیشہ کسی نہ کسی سے علاقہ رہا تھا اور اس کی تنخواہ بھی بہت کم تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ محبت تو وہ، میری غربت کے باوجود، میرے سوا کسی سے نہیں کر سکتی۔ بظاہر تو اس نے میری توقع کے برعکس عمل کیا اور مرتے دم تک اپنی شادی برقرار رکھی... ڈرامے میں یہ دکھایا گیا تھا کہ بسترِ مرگ پر اس نے ایک غیر ملکی کے ہاتھ جسم فروشی کا اعتراف کیا جس پر شوہر نے دوا کے بجائے اسپرین کھلا کر اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ میرے تمام شکوک درست تھے۔ یہ شخص جس کی خیال پرستی نے ہم سب کو حیران کر رکھا تھا، اس نے زہرہ کو قتل کر دیا۔ یہ شخص... اگر میرے بس میں ہو... تو ضرور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچایا جائے... پھانسی! بس پھانسی پر لٹکایا جائے۔

***

Scanned with CamScanner

مجھے کس فائدے کی امید تھی؟ میں عباس کے روبرو تھا، اس فلیٹ میں جو کبھی تمہیں کا تھا۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کے بعد، دکان میں اس کے ماں باپ سے ملنے کے دوسرے دن۔ تو اب یہ مصنف ہے... درجنوں ڈرامے مسترد ہونے کے بعد آخرکار مصنف! یہ قلم باز کاذب، جو بلا جھجک حقیقت کا سرقہ کرتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ حیران مت ہو! ماضی تو ماضی ہے۔ مگر اس کے اثرات اب تمہاری وجہ سے دور دور تک محسوس ہوں گے۔ لیلیٰ نے ہماری صلح کرادی تھی اور ایک دن ہم نے مصافحہ بھی کیا تھا۔ لیکن جو قلب میں تھا سو تو قلب ہی میں رہا۔ اس کے پڑھنے کے کمرے میں ـــ فلیٹ میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک برآمدہ تھا ـــ ہم بددلی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، حتیٰ کہ میں نے کہا:

"بے شک تم سوچ رہے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

امید ہے کہ خیر سے آئے ہو گے۔"

"تمہارے ڈرامے پر مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

شکریہ،" اس نے نیم دلی سے کہا۔

"کل سے ریہرسل شروع ہو رہی ہے۔"

"پروڈیوسر تو بہت پُرجوش ہے۔"

"مگر ہدایت کار نہیں۔"

"وہ کیا کہتا ہے؟"

"ہیرو نہایت مکروہ ہے۔ اسے لوگ پسند نہیں کریں گے۔"

تیوری پر بل ڈال کر اس نے کندھے جھٹکے۔

"تم ڈرامے کی ریڈنگ پر کیوں نہیں آئے؟"

"میری مرضی۔"

"تمہیں خیال نہیں آیا کہ ڈرامے میں جو کچھ دکھایا گیا ہے اس سے لوگ تم پر شک کر سکتے ہیں؟"

"کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔"

"لوگ واقعی یہ سمجھیں گے کہ تم قاتل اور اپنے ماں باپ کے خائن ہو۔"

"کیا بکواس ہے! ... خیر، میری بلا سے۔"
میں بے قابو ہو کر پھٹ پڑا۔
"تم ایک اعترافی قاتل ہو۔"
اس نے میری طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا:
"اور تم ایک کیڑے ہو، دائمی اور ابدی!"
"تم اپنا دفاع کیوں کر کرو گے؟"
"مجھ پر کوئی الزام ہی نہیں تو دفاع کا کیا سوال۔"
"الزام لگایا جائے گا، تیری توقع سے قبل۔"
"تم احمق ہو۔"
میں یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، "وہ تو واقعی قتل ہونے کے لائق تھی۔ لیکن تجھے بھی پھانسی پر لٹکنا چاہیے۔"

***

دوسرے دن ریہرسل پر الہلالی کے غضب کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا پروڈیوسر طیش میں طوفان کی مثل ہو جاتا ہے۔
"تم... تم... دس برس کے چھوکرے کی سی حرکتیں کر رہے ہو،" اس نے چیخ کر کہا۔
"احمق! اتنی حماقتیں نہ کرتے تو اچھے اداکار بن سکتے تھے۔ مگر تم تو وکیل نیابت بننے پر مصر ہو۔ عباس یونس کے گھر کیوں گئے تھے؟"
کیا اس حرامی نے میری شکایت کی ہے؟ خیر، یہ طوفان ٹل جائے تو کچھ کہوں گا۔
"تم اپنے کردار کو کبھی گرفت میں نہیں لا سکو گے،" اس نے کہا۔ "عباس یونس کے بجائے اس بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟"
"آج تو پہلا ہی دن ہے،" میں بڑبڑایا۔ "یہ بات بھی اسی قدر اہم ہے کہ مجرم کو مستحق سزا ملے۔"

"ہم میں سے کون ہے جسے کسی نہ کسی جرم میں جیل نہیں جانا چاہیے؟"

"مگر ہم قتل کی حد تک تو نہیں گئے۔"

"کون جانے! تحیہ... اگر وہ واقعی قتل ہوئی ہے تو اس کے کئی مشترک قاتل ہیں۔ اور ان میں اول نمبر پر تم ہو۔"

"وہ تمہارے دفاع کا مستحق نہیں ہے۔"

"میں تو اسے ملزم نہیں گردانتا۔ تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی ایک ثبوت بھی ہے؟"

"یہ ڈراما۔"

اس نے مسکرا اڑاتے ہوئے کہا، "ہر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی الزام ہوتا ہے۔ لیکن عدالت میں دوسری قسم کے ثبوتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ڈرامے میں وہ خودکشی کر لیتا ہے۔"

"بالکل! اور حقیقت میں اس نے خودکشی نہیں کی۔ ہماری خوش نصیبی سے! اب وہ ہمارے لیے کچھ اور بھی لکھے گا۔"

"وہ ایک سطر نہیں لکھ سکتا۔ اور نہ کبھی ایک سطر بھی لکھے گا۔ تم جانتے ہو ماضی میں اس نے تمہیں کیسے ڈرامے لکھ کر دیے۔"

"طارق رمضان، اس قدر اکتا دینے والے مت بنو۔ اپنے کام پر توجہ دو اور اس موقعے سے فائدہ اٹھاؤ، کیوں کہ یہ دوبارہ نہیں آئے گا۔"

***

اس قاتل کے ڈرامے کی ریہرسل کرتے ہوئے میں تحیہ کے ساتھ گزاری زندگی کو دوبارہ جیتا ہوں۔ ہبری فروشوں کی گلی کے سامنے وہ بیت القدیم... میرا کمرہ جہاں ہم نے محبت کی... خیانت کا انکشاف... جنازے پر میری آہ و بکا...

سالم المبرودی کہتا ہے، "جیسی تمثیل اس بار کر رہے ہو پہلے کبھی نہیں کی۔ لیکن جو لکھ کر دیا گیا ہے بس اتنا ہی کرو۔"

Scanned with CamScanner

"میں وہ دُہرا رہا ہوں جو ابھی ابھی کہا گیا۔
اس نے ہنس کر کہا، "اصل زندگی کو بھلادو اور ڈرامے میں سانس لو۔"
"آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ڈرامے میں تبدیلی کرنے کا اختیار ہے۔"
"میں نے ضروری تقاضے کے مطابق کاٹا ہے۔ بچے والا حصّہ۔"
"میری ایک تجویز ہے۔"
العبرودی اس بات پر خوش نظر نہیں آیا۔ پھر بھی میں نے کہہ ہی دیا:
"ہیروئن مرتے وقت اپنے قدیم عاشق کو طلب کرے۔"
"کون سا عاشق؟ ڈرامے میں ہر کردار اس کا عاشق رہ چکا ہے۔"
"میرا مطلب ہے وہ عاشق جس کا کردار میں ادا کر رہا ہوں۔ وہ اس سے ملنے آتا ہے، ہیروئن اپنی خیانت پر نادم ہوتی ہے اور اس کی آغوش میں مر جاتی ہے۔"
"اس تبدیلی کے لیے لازم ہوگا کہ ان کرداروں کی شخصیتوں میں اور زوجین کے باہمی رشتے میں بڑا تغیر لایا جائے۔"
"لیکن...."
"تم ایک نیا ڈراما بنا رہے ہو۔ اس ڈرامے میں ہیروئن اپنے قدیم عاشق کو یکسر فراموش کر دیتی ہے۔"
"غیر ممکن اور غیر فطری!"
"میں نے کہا ہے کہ زندگی کو بھلا کر ڈرامے پر غور کرو۔ یا کوئی نیا ڈراما خود ہی لکھ ڈالو۔ آج کل بازار میں سستے جذباتی ڈراموں کی بہتات ہے۔"
"آپ نے بھی تو بچے والا حصہ حذف کر دیا۔
"وہ بالکل الگ بات ہے۔ ڈرامے کی بنیادی کہانی سے اس کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ علاوہ ازیں، ایک معصوم بچے کا قتل ہیرو کو دیکھنے والوں کی ہمدردی سے محروم کر دیتا۔"
"اور زوجہ کا قتل؟"
"سنو، دیکھنے والوں میں سے سیکڑوں خود اپنی زوجاؤں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

***

یہ کرم یونس تو نہیں؟ یقیناً وہی ہے۔ پروڈیوسر کے کمرے سے برآمد ہو رہا ہے۔ ڈراما شروع ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ کیفے ٹیریا کے دروازے کے پاس میں اور تھیوسٹر کی اشارڈ دُریہ ہاتھوں میں قہوے کے فنجان لیے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ وہ اپنے پرانے سوٹ میں اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے سیاہ پُل اوور کے کالر نے اس کی گردن کو ٹھوڑی تک ڈھانپ رکھا تھا۔

"تھیوسٹر میں خوش آمدید!" میں نے کہا۔

وہ غصے سے غرایا، "ہٹ جاؤ میرے راستے سے!" اور دُریہ کو گردن کے اشارے سے سلام کرتا گزر گیا۔

دُریہ نے بڑھتی ہوئی مسکائی پر اپنی گفتگو منقطع کر کے کہا:

"یقیناً عباس کی اچانک پُراسرار روپوشی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوگا۔"

"وہ مجرم ہے اسی لیے چھپ گیا ہے۔"

دُریہ مسکرا کر بولی:

"اس نے کوئی قتل نہیں کیا۔ اور نہ خودکشی کی ہے۔"

"خودکشی نہیں کی ہوگی۔ مگر وہ پھانسی پر ضرور لٹکے گا۔"

"سن ۷۳ کی فتح کے بعد،" دُریہ نے موضوع پر واپس آتے ہوئے کہا، "لوگوں کو بہتر زندگی ملنی چاہیے تھی۔"

"بہتر زندگی صرف بدکاروں کو مل سکتی ہے۔ اب تو پورا ملک قحبہ خانہ بن گیا ہے۔ پولیس نے صرف کرم یونس کے گھر کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ تو وہی کچھ کر رہا تھا جو ہر شخص کر رہا ہے۔"

دُریہ نے ہنس کر کہا:

"اس دور میں جنسی زندگی پوری قوم کا محبوب مشغلہ بن چکی ہے۔"

"میں بدکاری میں اس طرح غرق ہوں کہ میرے خاندان والے مجھے اپنا کہنے سے منحرف ہو چکے ہیں۔"

"وائے ناکامی... بے چارہ شخص! بھلا اب ام ہانی کے سوا کیا چارہ ہے!"

***

افتتاح کی رات۔ دس اکتوبر۔ باہر ہوا میں لطافت ہے مگر اندر لگتا ہے بڑی گرما گرمی ہونے والی ہے۔ ڈراما دیکھنے والوں میں کرم اور حلیمہ، اسلالی، فواد شلبی سبھی ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں میں صرف میں ہی اسٹیج پر اس زندگی کی اداکاری کر رہا ہوں جو اس گھر میں گزری ہے۔

اسماعیل عباس کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس قدیم گھر کی زندگی اسٹیج پر اپنی تمام شرمناکیوں سمیت، بتدریج تم کے اضافے کے ساتھ دہرائی جا رہی ہے۔ ایک کے بعد ایک شرمناک واقعہ رونما ہو رہا ہے۔ پروڈیوسر حلیمہ کے گھر کی خواب گاہ میں جا گھسا ہے، اور بے حیائی کا یہ سلسلہ مخبری اور قتل کے نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار میری اداکاری کا تالیوں سے خیر مقدم ہو رہا ہے۔ کیا تحیہ اپنی قبر سے دیکھ رہی ہے؟ تالیوں کی گونج... دیکھنے والے یا سنگین سناٹے میں ہمہ تن ڈرامے میں غرق، یا بے اختیار تالیوں کا طوفان اٹھاتے ہوئے... بزدل اور مرم مصنف غائب ... کرم اور حلیمہ کیا محسوس کر رہے ہیں؟ آخری پردہ گرنے سے پہلے ان کے چہروں پر دو چار جھریوں کا یقیناً اضافہ ہو چکا ہو گا۔

پیش کش ختم ہونے کے بعد حسب معمول کیفے ٹیریا میں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ یہاں لوگوں کو میرے وجود کا احساس ہو رہا ہے۔ میری شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ تحیہ نے مجھے آدمی سے بڑھ کر کچھ بنا دیا ہے۔ ام ہانی کے چہرے پر فراخ تبسم ہمیشہ پھیلتے بل ڈاگ کی طرح کا ہو گیا ہے۔

سرحان البحیری نے کہا:

"میں نہ کہتا تھا!"

اور فواد شلبی بولا:

"ایک عظیم اداکار کا جنم ہوا ہے!"

اسماعیل کی کھسیانی مسکراہٹ سے اس کا حسد عیاں ہے۔ یہ میں ہوں جو ایک عاشق، ایک مجنون اور ایک قابلِ نفرت شخص کا پیچیدہ کردار ادا کر رہا ہوں۔ میں شور اور کونیاک سے پیٹ بھر رہا

ہوں۔ کونیاک اور کامرانی کا خمار ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو گیا کہ جب میں نے حلیمہ کو ام ہانی سے کراسنے پر لیٹے ہوئے لباس میں دیکھا تو ایک جام غیر حاضر مصنف کے نام بھی تجویز کر دیا۔

تقریباً صبح تین بجے تیں تھیٹر سے نکلا، ام ہانی اور فواد شلبی کے بازوؤں میں بازو حمائل کیے ہوئے۔

"چلو، شلبی نے کہا، قاہرہ کی سیر کریں۔ یہی واحد وقت ہے جب یہ شہر کچھ پُروقار معلوم ہو سکتا ہے۔"

ام ہانی نے کہا، "میرا گھر بہت دور ہے۔"

"تو میری کار جو ہے۔ مجھے کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں۔"

میں نے پوچھا:

"تم میرے بارے میں لکھو گے؟"

"یقیناً۔"

میں زور سے ہنس پڑا۔ چلتے چلتے اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہوں۔

"میں منشیہ البکری میں پیدا ہوا تھا۔ برابر برابر دو بنگلے تھے، ایک آلِ رمضان کا اور ایک آلِ ہلالی کا۔ میرے والد رمضان میجر جنرل تھے، پرانے وقتوں کے فوجی مراتب کے مطابق۔ اور ہلالی کے والد زمین دار تھے۔ میں بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ سرحان اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ میرا ایک بھائی وکیل ہے، ایک ہائی کورٹ کا جج ہے اور تیسرا انجینئر ہے۔ میری مختصر کہانی یہ ہے کہ ہمیں ہائی اسکول سے نکال دیا گیا تھا، مجھے اور سرحان کو۔ ہم نے قحبہ خانوں، مے خانوں اور منشیات کے سوا کوئی علم حاصل نہیں کیا۔ مجھے باپ سے ترکے میں کچھ نہ ملا۔ سرحان ستر ایکڑ زمین کا وارث بنا۔ رعب جمانے اور عورتوں کا شوق پورا کرنے کے لیے اس نے تھیٹر کمپنی قائم کر لی۔ اداکاروں میں تیں بھی شامل ہو گیا۔ میرے بھائیوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ تنخواہ بہت کم تھی۔ قرض بہت زیادہ تھا۔ اگر عورتوں کی مدد نہ ہوتی تو..."

ام ہانی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

فواد نے سوال کیا:

Scanned with CamScanner

"تم سیاست سے قودل چسپی رکھتے ہو گے؟"

"میں زندگی کے سوا کسی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تم جانتے ہو کرم یونس کیسا انسان ہے؟ ہم دونوں توام ہیں، روحانی اعتبار سے۔ لوگ کہتے ہیں اُس کی پرورش طوائف ماں نے کی تھی اس لیے وہ ایسا ہو گیا۔ مگر میں نے تو باعزت خاندان میں پرورش پائی ہے۔ پھر ہماری مماثلت کی تشریح کیسے کرو گے؟ ماحول فطری عناصر کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں باعزت ہونے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم میں اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ ہم صادق ہیں جبکہ دوسرے منافق ہیں۔"

ام بانی نے فواد سے مخاطب ہو کر کہا:

"کیا تم یہ سب بدبیان لکھ ڈالو گے؟"

میں نے کہا:

"فواد خود بھی ایسا ہی ہے۔"

"تم پکے حرامی ہو،" وہ خوشی سے چھلکتے لہجے میں بولی۔ "تمہارا خیال ہے دنیا میں کوئی بھی نیک نہیں؟"

"یقیناً ہے۔ مثلاً استاذ عباس یونس ـــــ ڈراما افراح القبہ کا مصنف! وہ اس قدر خیال پرست اور مثالی ہے کہ والدین تک کو جیل بھجوا دیا اور زوجہ اور بچے کو قتل کر دیا۔"

ام بانی فواد سے پوچھتی ہے:

تم کیا لکھو گے؟

"میں اس کی طرح مجنون نہیں ہوں،" فواد کہتا ہے اور ہمیں اپنی عیاشی کی طرف لے آتا ہے۔ ہم کار میں قلعے تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سڑک پر ہماری گلی کا موڑ آتا ہے اس سے آگے گاڑی کیچڑ اور اُبلتے ہوئے گٹروں کے باعث نہیں جا سکتی۔ ہم یہیں اتر جاتے ہیں۔ کریہہ بدبو سے میرا خمار رفع ہو گیا۔ کیا میری کامیابی برقرار رہ سکتی ہے؟ کیا میرے حالات بدل جائیں گے؟ کیا میں اس بدحال محلے سے نکل سکوں گا؟ اور اس پچاس سالہ بڑھیا کے چنگل سے جس کا وزن سو کلو ہے؟

میں نے اور تحیہ نے بیری فروشوں کے بازار والا بیت القدیم چھوڑ دیا تھا۔ ہم دونوں تھوسٹر سے واپس آ رہے تھے، سرد ہوا کے تھپیڑوں کا اکٹھے مقابلہ کرتے ہوئے۔ اس نے اپنے بدن کے

قوسوں کے گرد سیاہ کوٹ کس کر لپٹا ہوا تھا، اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ بدن بستر کے لیے بنا ہے، تھیسٹر کے لیے نہیں۔ ہم دونوں نے غلط پیشوں کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے کہا تھا:

"وہ لڑکا قہوے کے وقفے میں تمہیں بڑی بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔"

"عباس؟ وہ تو ابھی چھوٹا ہے۔"

"ایک دن بڑا ماہر دلال بنے گا۔"

"وہ بڑا مودب لڑکا ہے۔ اس گھر میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں اس کا کیا قصور؟ وہ ان سب باتوں سے بری ہے۔"

"کرم اور حلیمہ کا بیٹا! ایسے عجیب زمانوں میں وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ تمہیں کیا توقع ہے؟"

یہ تو مجھے اب پتا چلا ہے کہ میں اُس وقت ذرا بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔

***

سرحان الہلالی نے ہنس کر کہا تھا:

"میں نے عاشقِ حزیں کی صورت میں تمہارا کبھی تصور نہیں کیا تھا!"

"تمہارا کیا خیال تھا؟ کہ ایک دن ہم نہر سوئز پار کرنے کا مقابلہ جیت جائیں گے اور لاکھوں کما لیں گے؟"

"غریب تو وہ اب بھی تمہاری ہی طرح ہے۔"

"یہ اُسے بتاؤ ــــ براہِ مہربانی۔"

"اے مجنون! تھیسٹر چھوڑنے کا قصد تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ یہ تو شادی کرنے کا سر ہے۔"

"اُف! شیطان کے حوالے! میں پاگل سا ہو رہا ہوں۔"

"تم طیش میں ہو۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"ایمان سے!"

"شاطر کھلاڑی ہزیمت برداشت نہیں کر سکتا..."

'بات اس طرح نہیں ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ اب تم فی الفور امّ بانی کے پاس لوٹ جاؤ، کیوں کہ کوئی اور تمہارے اخراجات برداشت نہیں کرے گا۔"

میں نے کچھ تردد کے بعد کہا تھا:

"کبھی کبھی مجھے خدا پر تقریباً یقین آنے لگتا ہے۔"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا:

'طارق! یا ابنِ رمضان! جنون کی بھی حد ہوتی ہے۔"

***

"اطراح القبہ" نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہر رات کامرانی پہلے سے بڑھ کر مل رہی تھی۔ آخرکار سرحان الہلالی کو وہ ڈراما مل گیا تھا جو تھوسٹر کمپنی کو مالا مال کر دے گا۔ جو یومیہ معاوضہ وہ دینے کا اعلان کر رہا ہے اس سے روح و جسد بحال ہو رہے ہیں۔

فواد شبی نے مجھ سے پوچھا:

"اپنے بارے میں میری تحریر پسند آئی؟"

میں نے تکلف سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا:

"ربع قرن کے بعد تمہارے مجلّے میں میری تصویر شائع ہوئی ــــ آخرکار!"

"تم ترقی ہی کرتے جاؤ گے۔ ... اور ہاں، کیا تم جانتے ہو کہ مصنف روپوشی سے نمودار ہو گیا ہے؟"

"واقعی؟"

"وہ کل الہلالی کے گھر آیا تھا۔ جانتے ہو کیوں؟"

"ہوں؟"

"منافعہ میں سے اپنا حصہ طلب کرنے!"

میں نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ عمر احمد برحل کیفے کی میز کے عقب سے اچھل کر گرتے گرتے بچا۔

"ابنِ صیبر! ... اور السلالی نے کیا جواب دیا؟"

"اسے سو پاؤنڈ دے دیے۔"

"لاحول! وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔"

"عباس بے روزگار ہے اور آج کل ایک نئے ڈرامے پر کام کر رہا ہے۔"

"بدبخت جونک! وہ کبھی کوئی نئی شے نہیں لکھ سکتا۔"

"یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ تمہارے۔"

"کہاں جا چھپا تھا؟"

"یہ اس نے کسی کو نہیں بتایا۔"

"فواد، تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ مجرم نہیں؟"

"وہ تسیہ کو کیوں قتل کرتا؟"

"اس نے بےوفائی کا اعتراف جو کیا تھا۔"

وہ کندھے جھٹک کر خاموش رہا۔

***

جس وقت میں نے اس کی نعش عمارت کے دروازے سے اندر لائی جاتی ہوئی دیکھی تھی، میری انتڑیوں سے ایک ہولناک خلا ٹکراتا محسوس ہوا تھا۔ مجھے اپنا وجود مجرم میں تبدیل ہوتا ہوا لگا تھا۔ اور پھر لاعلمی ہی میں مجھے آہ و بکا کے دورے نے آ لیا تھا۔ میں چیخیں مار مار کر بین کر رہا تھا۔ میری آواز نے وہاں موجود ہر شخص کو متوجہ کر لیا تھا۔ میرے سوا کوئی اس طرح نہیں رو رہا تھا۔ عباس تک کی آنکھیں خشک تھیں۔

میں سرحان السلالی کی کار میں واپس آیا۔ "جب میں نے تمہاری بکا سنی،" السلالی نے کہا، "جب میں نے دیکھا کہ تم کیسے لگ رہے ہو تو.. خدا میرے گناہ معاف کرے! ... میری بڑھے

زور کی ہنسی نکلنے والی تھی۔"

"تعجب تو مجھے بھی ہوا،" میں نے کہا۔

"مجھے یاد نہیں کہ اس سے قبل میں نے تمہیں کبھی روتے ہوئے دیکھا ہو۔"

"ہر شہسوار یک بارزمیں بوس ہو جاتا ہے،" میں نے کہا تھا۔ "موت محبت اور ہزیمت کی یادیں لاتی ہے۔"

***

خبر شکاروں کے قہوہ خانے تک جا پہنچی جہاں میں ہر روز تھوسٹر جانے سے پہلے جاتا ہوں۔ میں نے سرحان الہلالی کے کمرے میں جا کر پوچھا:

"کیا یہ خبر صحیح ہے؟"

"ہاں،" اس نے محتاط انداز میں کہا۔ "عباس جلوان کے ایک ہاسٹل میں مقیم تھا... طویل عرصے سے غائب ہے... اس کے کمرے سے خودکشی کے عزم کا خط ملا ہے۔"

"لاش ملی؟"

"نہیں، اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔"

"خودکشی کی کوئی وجہ لکھی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے خودکشی کر لی ہے؟"

"آخر وہ اُس وقت روپوش کیوں ہو گیا جب اس کا ڈراما اس قدر کامیاب ہو رہا تھا؟"

ایک اُداس خاموشی کے وقفے کے بعد میں نے اُسے یہ پوچھتے سنا:

"وہ خودکشی کیوں کرے گا؟"

"جس وجہ سے ڈرامے کے ہیرو نے خودکشی کی۔"

"تم اس پر الہام لگانے پر مُصر ہو۔"

"میں تمہیں کوئی دوسرا سبب معلوم کرنے کا چیلنج دیتا ہوں۔"

فنکاروں اور تھیٹر والوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایسے حالات میں جو انتظامات کیے جاتے ہیں وہ سب کیے گئے، مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے بے پناہ سکون محسوس ہوا۔ میں نے خود سے کہا:

"اس ڈرامے کی کامیابی کی کوئی حد نہیں رہے گی۔"

کرم یونس

خریف ـــ موسم سرما کا نقیب۔ اس کی برودت کیوں کر برداشت کریں گے؟ تمام عمر مونگ پھلیاں، تربوز کے بیج اور مکئی کے دانے بیچتے گزری۔ اور اس عورت کے ساتھ گویا دوبارہ جیل میں ہوں۔ اس ملک میں تقریباً ہر نفس کو قید میں ڈالا جانا چاہیے۔ جیل کے لیے ہمارا ہی انتخاب کیوں؟ جو قانون اپنے ہی احترام کی نفی پر مبنی ہو وہ دیوانگی ہے۔ یہ سب نوجوان کیا کریں گے؟ ذرا ٹھہرو، یہ سب عمارتیں دھماکوں سے اُڑ جانے والی ہیں۔ جو تاریخ ملبہ بن جائے وہ افسوس ناک ہے۔ اور یہ عورت کسی خواب دیکھنے سے باز نہیں آئی۔ لیکن، یہ کیا! یہ کون ہے؟ ماضی کی کوئی بدروح؟ لانا تو کوئی زہر آلود خنجر! کیا چاہتا ہے خبیث؟ اے مسرات للارض کی دلدل!

میں حلیمہ سے مخاطب ہو کر غرّایا:

"دیکھو..."

دہشت۔ پھر اُس نے پوچھا:

"یہ ہمیں تہنیت دینے آیا ہے یا ملامت کرنے؟"

وہ چہرے پر کریہہ تبسم لیے کھڑا ہے ـــ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی ناک، بھاری جبڑے، قوی و عریض، کسی سؤر جیسا۔ اس کے ساتھ پہلے کی طرح سختی سے پیش آنا پڑے گا۔

"طارق رمضان! یہاں کیسے؟"

اور حلیمہ نے منفعل ہو کر کہا:

"زمین پر واپسی کے بعد ایک وفادار دوست سے پہلی ملاقات۔"

طارق نے کہا:

"دنیا مصائب کی آماج گاہ ہے اور میں خود گم کردہ منزل ہوں۔"

میں نے کہا، "تم ایک ڈراؤنا خواب ہو،" اور اس کی طرف سے رخ پھیر کر ایک کاؤبک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بُری خبر ہے،" وہ بولا۔

"ہمارے لیے بری خبر کا اب کچھ مطلب نہیں،" حلیمہ نے کہا۔

"اچھا؟ خواہ وہ عباس یوسس ہی کے بارے میں کیوں نہ ہو؟"

"وہ سعادت مند اولاد ہے،" میں نے غصے سے کہا۔ "جب میں نے تھیٹر میں کام پر واپس جانے سے انکار کر دیا تو اس نے یہ دکان کروا دی۔"

عورت نے اضافہ کیا:

"اور اس کا ڈراما بھی قبول کر لیا گیا ہے۔"

لیکن وہ اسی ڈرامے کے بارے میں کچھ کہنے آیا ہے۔ کیا حسد نے اسے دیوانہ کر دیا ہے؟ عباس کو کامران دیکھنے پر یہ موت کو ترجیح دے گا۔ بہت اچھا ہے، تو اس کا حسد بے شک اسے ہلاک کر ڈالے۔ یہی سارے فساد کی جڑ ہے، اصل بلا ہے۔ تجھے مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے! ہم ایک ہی نالی کے کیڑے ہیں۔

اس نے کہا:

"ڈراما اسی گھر کے بارے میں ہے، مع ایسے نئے جرائم کے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

کیا یہ ممکن ہے؟ عباس نے تو اس موضوع پر کبھی کچھ نہیں کہا۔ مگر وہ تو اس قدر مثالی ہے، اخلاق پرست!

میں نے کہا:

"کیا مطلب؟"

"اس نے ہر چیز دکھائی ہے ـــــ ہر بات۔ سنو گے؟"

یہ کیا کہہ رہا ہے؟ عباس ایسی گری ہوئی حرکت کیوں کرے گا؟

میں نے پوچھا:

"کیا جیل بھی؟"

"جمیل بھی۔ اور یہ بھی کہ تمہاری مخبری سی سے کی تھی، اور اسی نے تحیہ کو قتل کیا تھا..."

"کیا بکواس ہے!"

اور عورت نے کہا:

"تو عباس کا عدو ہے!"

مگر اتنا سن کر میرا قلب مضطرب ہو چکا تھا۔

"تو کیا یہ ڈراما نہیں ہے؟" میں نے کم زور آواز میں کہا۔

علیمہ نے کہا:

"عباس بتائے گا ساری بات...."

"خود ڈراما دیکھ لینا۔"

"نفرت نے تجھے اندھا کر دیا ہے۔"

"نفرت نے نہیں، جرم نے۔"

"جرم تو تیرے سوا کوئی اور نہیں۔"

"میرا بیٹا بےوقوف ضرور ہے مگر نہ خائن ہے نہ قاتل،" میں نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ چلایا، "تحیہ کے قاتل کو گرفتار ہونا چاہیے۔"

اس کے اور عورت کے درمیان بڑے زور سے جھگڑا ہونے لگا۔ آخرکار میں نے گالی دے کر اس سے پیچھا چھڑایا۔ مگر میرے خیالات پراگندہ ہو گئے تھے۔

***

میں شکوک کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طارق رمضان یہاں عباس کے بارے میں ایک بے بنیاد قصہ سنانے پہنچ جائے؟ وہ کینہ پرور تو ہے مگر احمق نہیں۔ بڑھتے ہوئے وسوسوں میں میں نے عورت کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس بیت القدیم میں ہم دو اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اگر عباس پر مصائب پڑنے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں نے کب

Scanned with CamScanner

کی اسے طلاق دے دی ہوتی۔ عباس اس تلخ زندگی میں واحد خوشگوار ذائقہ ہے! وہی تو اب میری زندگی کی واحد امید ہے۔

عورت بڑبڑائی:

"جھوٹ بول رہا تھا۔"

میں اس سے کہیں زیادہ پریشان تھا، یہاں تک کہ طارق کی طرف داری میں میں نے کہا:

"وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟"

"وہ عباس سے نفرت کرتا ہے۔"

"مگر ڈراما جو ہے..."

"اس کے بارے میں ہمیں کیا علم! جاؤ اور عباس سے پوچھو۔"

"ہاں میں اس کے پاس جاؤں گا۔"

"مگر تم تو بل بھی نہیں رہے۔"

میں اس سے خائف سا ہو گیا۔ وہ اس قدر ضدی اور ضدی ہے۔ میں نے کہا:

"عجلت کیا ہے؟"

"اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پیٹھ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔"

"اور اگر وہ اعتراف کرے؟"

"کیا مطلب؟"

"اگر وہ اعتراف کر لے کہ یہ ڈراما واقعی ایسا ہی ہے جیسا اس بدمعاش نے کہا۔"

"وہ ہر بات کی وضاحت کر دے گا۔"

"کیا پتا!"

"کیا قتل کرنے والا خود مشہور کرتا پھرتا ہے؟"

"کیا پتا!"

"تم جاؤ تو سہی!"

"جاؤں گا تو یقیناً۔"

"یا میں چلی جاؤں؟"

"تمہارے پاس مناسب لباس کہاں ہے،" میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "یاد... کہ ہماری سب صبح پونجی کیسے ضبط کر لی گئی۔ اور وہ کتا سراغ رساں مجھے کس طرح مارے چلا جا رہا تھا۔"

"مگر یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ ہمیں حال کی فکر کرنی ہے۔"

"بدمعاش کاذب!"

"عباس ہمارے طرزِ زندگی کی موافقت نہیں کرتا تھا۔ ایسا مثالی تھا کہ ابنِ حرام معلوم ہوتا تھا۔ میرا بیٹا تو نہیں... مگر وہ ہم سے وفادار رہا... ہمیشہ... اور وہ حمیہ کو قتل کیوں کرتا؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟"

"یوں ہی سوچ رہا ہوں۔"

"تم نے اس بدمعاش کے کہنے پر یقین کر لیا؟"

"یقین تو تمہیں بھی آ گیا ہے۔"

"عباس کیا کہتا ہے، ہمیں سننا چاہیے۔"

"درحقیقت میں نے یقین نہیں کیا ہے۔"

"کیا بذیان بک رہے ہو!"

"لعنت ہو تجھ پر!"

"تجھ سے ربط پیدا ہونے کے دن سے لعنت میں ہوں۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔"

"کبھی میں حسین تھی..."

"میرے سوا دوسرا کوئی تجھ پر راغب تھا؟"

"ہر کوئی ہمیشہ راغب تھا... وائے نصیب!"

"تمہارا باپ ڈاکیا تھا۔ میرا باپ تو اشمشرجی کی املاک پر دیوان تھا۔"

"یعنی خادم تھا۔"

"میں خاندانی آدمی ہوں۔"

"اور تمہاری ماں کون تھی؟"

"تجھ جیسی تھی۔"

خرافات بکنے والے... تم جانا ہی نہیں چاہتے۔"

"جب میری مرضی ہو گی تب جاؤں گا۔"

میں فکر میں پڑ گیا۔ لیکن... ہم پر جتنے مصائب ٹوٹ چکے ہیں ان سے بدتر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ میں اور یہ عورت... کوئی تصور بھی کر سکتا ہے کہ ہم پُر حرارت رغبت اور حسین خوابوں میں یک جا ہوئے تھے! ہمیں کیا ہو گیا؟ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ آج، عصر کے وقت... یہی مناسب رہے گا۔

***

مجھے علم نہیں کہ میر بیٹا کہاں رہتا ہے۔ شادی کرنے کے بعد وہ مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی خیریت بھی نہیں پوچھتے تھے۔ وہ ہماری زندگی کو حقارت سے دیکھتا تھا اور میں اُسے۔ جب وہ تمیہ کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا تو میں خوش ہوا کہ اب اس کی حقارت بھری نظریں نہیں دیکھوں گا۔ اور اب میں اس کی تلاش میں دوڑ رہا ہوں کہ اس کے سوا میری زندگی میں دوسری کوئی امید نہیں۔ جیل کے بعد اس نے ہم سے عزت کا سلوک کیا۔ وہ ہمیں کیوں کر جیل بھجوا سکتا تھا؟ اس کے دروازے پر کھڑے چوکیدار نے میرے پوچھنے پر کہا:

"چند گھنٹے قبل وہ ایک سوٹ کیس لے کر چلا گیا۔"

"کیا وہ کہیں سفر پر گیا ہے؟"

"اس نے کہا کہ وہ کچھ عرصہ باہر رہے گا۔"

"کیا پتا نہیں چھوڑا؟"

"نہیں۔"

میں پریشان ہو گیا۔ یہ واقعہ میری توقع کے خلاف تھا۔ کیا اسے اس بکواس کی خبر مل گئی؟ طارق کی لگائی ہوئی تہمتوں کی؟ میں نے سرحان الہلالی سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ شارع عماد الدین میں اپنے تھوسٹر میں اس نے مجھے فوراً اندر طلب کر لیا۔ اس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہنے لگا:

"ابّا .. میرے حالات موافق ہوتے تو میں تمہاری رہائی پر خود تمہارے گھر آتا۔"

"سرحان بے! یہ عذر قابلِ قبول نہیں۔"

وہ ہنسا۔ کوئی شے اسے شرم نہیں دلاتی۔ کہنے لگا:

"سچ ہے!"

"ہم طویل عشرے تک ساتھ رہے ہیں — ایک عمر کا ساتھ! اور میری گرفتاری سے قبل تک تم میرا گھر بھی استعمال کرتے رہے تھے۔"

"حق ہے کہ مجھ سے خطا ہوئی... قہوہ پیو گے؟"

"نہ قہوہ نہ چائے... میں تم سے اپنے بیٹے عباس کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔"

"اوہ، وہ ہونہار مصنف؟ اس کا ڈراما بے نظیر کامیابی حاصل کرے گا، اور کرم! کم سے کم تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کیسا محسوس ہو رہا ہوگا۔"

"بہت خوب! مگر وہ مجھے اپنے گھر نہیں ملا۔ دربان نے بتایا کہ وہ سوٹ کیس لے کر کہیں چلا گیا ہے۔"

"اس پر قلق کیوں کرتے ہو؟ وہ نیا ڈراما تصنیف کر رہا ہوگا... کسی پُرسکون جگہ۔"

"میں نے ڈرامے کے موضوع کے بارے میں کچھ باتیں سنی ہیں۔ میرے خیال میں اس کے چلے جانے کا تعلق اسی بات سے ہے۔"

"کرم! یہ ایک تصوراتی ڈراما ہے۔"

"اس کا دشمن طارق..."

اس نے بات قطع کر کے کہا:

"ڈراما محض ڈراما ہوتا ہے۔ ورنہ قانون کے رکھوالے نوے فیصد ڈراما نگاروں کو جیل میں ڈال دیتے۔"

"سچ سچ بتاؤ... تمہارا خیال کیا ہے؟"

"میں ان باتوں میں سنجیدہ نہیں کھپاتا۔ صرف ڈرامے کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ڈرامے میں جو بھی جرم ہوتا ہے وہ ڈرامے کے حق میں جاتا ہے۔"

"مگر کیا وہ اپنے والدین کی مخبری اور زوجہ کا قتل نہیں کرتا؟"

"یہی تو اچھی بات ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ عظیم المیہ ہے۔"

"لیکن تمہیں یقین نہیں کہ ایسا سچ مچ ہوا ہوگا۔"

"مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔"

"میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔"

سچ یہ ہے کہ ہمیں ایک عظیم ڈراما مل گیا ہے۔ اور میں، تم جانتے ہو، تھوسٹر کا مالک ہوں، وکیلِ نیابت نہیں ہوں۔"

"اور میں عذاب میں ہوں۔"

الطالی نے ہنس کر کہا:

"کیا بات کرتے ہو! تم اس سے کبھی محبت نہیں کرتے تھے۔"

"ماضی اور حال یکساں نہیں ہوتے۔ تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے!"

"ان باتوں سے خود کو تکلیف نہ دو، کرم۔ یہ خواہ مخواہ کے اوہام ہیں۔ تمہارے قریبی دوستوں کے سوا ان باتوں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو وہ اسے تھوسٹر کی حدود کے سوا کہیں نہیں دیکھیں گے۔ ویسے تم نے تھوسٹر میں اپنی ملازمت کیوں ترک کر دی تھی؟"

"شکریہ! عباس کے کہنے پر۔ اور یہ سوچ کر کہ تم راضی نہیں ہو۔ مگر اب میں ہرگز ماضی سے رجوع نہیں کرنا چاہتا۔"

الطالی ہنسا۔ پھر اس نے کہا:

"میں سمجھتا ہوں۔ اب تم اپنے مالک آپ ہو۔ دکان سے آمدنی بھی اچھی ہوتی ہوگی۔ لیکن اے عزیز! عباس کی جانب سے قلق مت کرو۔ وہ اپنا مقام بنا رہا ہے۔ مناسب وقت پر ظاہر ہو جائے گا۔"

ملاقات ختم ہوئی۔ میں نے رخصت لی اور تمام نوعِ بشر کے لیے دل میں حقارت لیے چلا آیا۔ نہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے نہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ عباس سے بھی نہیں۔

حالاں کہ میری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ خائن، قاتل! مگر اسے کیوں الزام دوں ـــ میں بھی تو اسی کی مثل ہوں۔ اس کا طلائی ملمع کھرچا گیا اور باپ والی موروثی اصلیت ظاہر ہو گئی ـــ وہ اصلیت جس کی آج کل پوجا ہوتی ہے۔ اصل ذات، بلا منافقت۔ ان کاذب اشعار کی کیا فضیلت ہے جو تھیٹروں اور معبدوں میں دُہرائے جاتے ہیں؟ مجھے جیل میں ڈال دیا گیا اور اہرام کے سارے راستے پر عصمت فروشی کے بے شمار اڈے ہیں۔ یہ کون؟ کیفے کے دروازے پر طارق کھڑا ہے۔ اس نے میری جانب اپنا غلیظ ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے رستے سے ہٹ جانے کے لیے کہا اور چلا آیا۔

***

میری کوئی خطا نہیں۔ کیا منشیات بڑے فیشن کی چیز نہیں تھیں؟ اور میں رسوم و قیود سے آزاد آدمی ٹھہرا ـــ اپنی جبلت سے مخلص... سبھی لوگ ایسے ہیں۔ بعد میں جو ہوا وہ بس قسمت کی بات تھی۔ حلیمہ کہتی تھی:

"صرف میری آمدنی تمھارے گھر اور بیٹے کے لیے کیوں کر کافی ہو سکتی ہے؟"

"تم جھگڑا کرنا چاہتی ہو؟ میں تیار ہوں۔"

"افیون نے تباہ کر دیا ہمیں۔"

"تو پھر؟"

"اور تمھارا بیٹا؟ ایسی ہونہار اولاد کی بہتر پرورش ہونی چاہیے..."

میری کوئی خطا نہیں۔ میری ماں نے مجھے سکھا دیا تھا کہ صحیح کیا ہے۔ حلیمہ کو سیدہ محترمہ کی تمثیل رچانے کا شوق ہے کہ اپنے ماضی کو فراموش کر سکے، مگر میں اپنے گھر بار میں منافقت کی اجازت نہیں دوں گا۔

میں نے الہلالی سے کہا تھا:

"اگر مناسب مکان ملنے میں کبھی دقت ہو تو میرا گھر موجود ہے۔"

اس نے بغور مجھے دیکھا تھا اور میں نے کہا تھا:

جین پاپ اشعرو میں۔ کوئی جن بھی شک نہیں کر سکے گا۔ "

میری کوئی خطا نہیں۔ اس بیت القدیم کو تو نئی زندگی مل گئی۔ گرد و غبار جھاڑا گیا۔ سب سے وسیع کمرہ جشنی آنے والوں کے استقبال کے لیے تیار کر دیا گیا۔ میں ان سب غیر منافق آزاد طبع لوگوں کا احترام کرتا تھا۔ الہلالی، المعرودی، شبلی، اسماعیل، طارق اور تمیہ۔ ایک کمرے کو ان کے طعام اور شراب و منشیات کا گودام بنا دیا گیا۔ علیمہ نے کاروبار خوب سنبھالا۔ منافق عورت! مجھے منافقین سے نفرت ہے۔ اب اس کی اصل فطرت خوب سامنے آئی۔ اب وہ ایک جدید مہمان خانے کی ماہر میزبان عورت کے مکمل روپ میں تھی ـــ جمیل و ذکی اور آزاد... مجھ سے بھی بڑھ کر۔ ۔ ایک قحبہ خانہ چلانے میں استاد! آسمان سے سونا برسنے لگا۔ لیکن میرا بیٹا مجھے کیوں ایسی متنفر نظروں سے دیکھتا تھا؟ تُو اولاد کس کی ہے؟ تیرا باپ کون ہے؟ تیری ماں کیسی ہے؟ تیری دادی کیسی تھی؟ ابنِ حرام! تُو تھیٹر اور ڈرامے کی اولاد ہے۔ اے منافقت میں پڑے ہوئے شیخ! اور علیمہ کہتی:

"حزن ہمارے بیٹے کو ہلاک کر رہا ہے۔"

"حزن سے کسی شیخ کو ہلاک ہونا ہی چاہیے۔"

"وہ ان حالات کو قبول نہیں کرتا۔"

"اور مجھے قبول کرنے کا کلہ بھی پسند نہیں۔"

"وہ ہمدردی کا مستحق ہے۔"

"قتل کا مستحق!"

وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا تو میرے دل سے اس کی پہلی سی محبت جاتی رہی۔

زندگی کو سمجھ... حقیقی دنیا میں رہ! شاذ و نادر ہی کوئی تیرے جیسے طعام کھاتا ہے۔ ہمسایوں پر نظر کر! آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے کیا تُو اس سے نابلد ہے؟ کیا تو نہیں سمجھتا؟ تُو ہے کون؟

وہ مجھے اجنبی نظروں سے دیکھتا جیسے وہ وقت کی دیوار سے پرے ہو۔ وہ کیا چاہتا تھا؟

میرا بیٹا سن! یہ گھر تیرے دادا نے بنایا تھا... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تیری دادی نے اسے حرام کاری کا گہوارہ بنا دیا۔ وہ نوجوان تھی، بیوہ تھی، اور تیری ماں سے مختلف نہ تھی۔ تیرا باپ حقیقت کی آغوش میں پروان چڑھا۔ میں تجھے سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

کیوں میں تجھ سے خوف کھاؤں؟ اگر تیری دادی جلد فوت نہ ہو جاتی تو اُس فوجی افسر سے شادی کر لیتی اور پھر یہ بیت القدیم اس کا نہ رہتا۔ اس کے مرنے کے بعد فوجی نے مجھے دبا کر رکھنا چاہا مگر میں نے مارپیٹ کرا کے نکال باہر کیا۔ اس نے مجھے پرانی والی فوج میں بھرتی کرانے کی کوشش کی مگر مکان میرا رہا۔ ام ہانی، میری ماں کی عزیزہ اور الہلالی کی وفاداری کی وساطت سے تھیٹر میں بطور پرامپٹر میرا تقرر ہوا۔ کسی دن میں یہ حقائق تمہارے سامنے رکھوں گا تاکہ تمہارا تعارف اپنی اصل سے ہو، بغیر جھوٹی متاوست کے... اپنے باپ کی مثل بن جاؤ، اور محبت ہمارا ملاپ کرا دے گی جیسا کہ تمہارے بچپن میں تھا۔ اپنی ماں کی منافقت سے گمراہ نہ ہو۔ کسی دن تم ہر بات سے واقف ہو جاؤ گے۔ کیا میں تجھ سے خوف کھاؤں، اے میرے ولد؟

***

دکان واپس آنے پر حلیمہ کے بے درپے سوالوں کا سامنا...

"اس نے تمہیں کیا بتایا؟"

"ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ ایک سوٹ کیس لے کر فلیٹ سے چلا گیا ہے.. کوئی نہیں جانتا کہ کہاں۔"

اس نے اپنے زانو پیٹتے ہوئے کہا:

"کوئی نہیں جانتا... اس نے ہمیں خبر کیوں نہ کی؟"

"تم سمجھتی ہو اسے ہماری فکر ہو گی؟"

"اس نے یہ دکان کروائی..."

"بس اتنا ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ہماری نسبت ایک ایسے ماضی سے ہے جسے فراموش کر دینا ہی بہتر ہے۔"

"تو میرے بیٹے کو نہیں سمجھتا! تمہیں الہلالی کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

میں اتنا عاجز آیا کہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ کہے جا رہی تھی:

"تم کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہو۔"

Scanned with CamScanner

میں نے چیخ کر کہا:

"میں تیرا سر پھاڑ دینا چاہتا ہوں۔"

"تم پھر افیون کھانے لگے ہو؟"

میں نے جواب دیا:

"آج کل تو صرف وزرا اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔" پھر میں نے کہا، "الہلالی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔"

اس نے قلق سے کہا:

"تم وہاں گئے تھے۔"

"اسے نہیں معلوم عباس کہاں ہے۔"

"میرا بیٹا چلا گیا؟ فلیٹ خالی کر کے؟"

"نہیں۔"

"وہ لوٹ آئے گا۔ کسی عورت کا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"تم جیسی عورت ایسا ہی سوچ سکتی ہے!"

اس نے چیخ کر کہا:

"تمہیں کیا پروا؟ تمہیں اپنے سوا کسی کی پروا نہیں..."

"میں ایک جیل سے نکل کر دوسری جیل میں آ گیا ہوں۔"

وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی:

"جیل کی کوٹھری میں تو میں رہ رہی ہوں۔"

اس کی رقت سے میرا غصہ اور بڑھا۔ اس عورت سے... میں کیوں کر محبت کرتا تھا؟

***

سُرخ کینے... دیواروں اور چھت پر گہرا سُرخ رنگ کیا ہوا ہے... میز پوش اور دبیز قالین بھی اسی رنگ کے... میں چمڑے کے ایک اونچے اسٹول پر بار میں عم احمد برجل کے پاس ایک

نوعمر عورت کے ساتھ بیٹھ گیا جس پر میں نے اوّل اوّل توجہ نہیں کی تھی۔ حسبِ معمول وہ میرے لیے چائے کا فنجان، سینڈوچ اور فاؤا کی پھلیاں لے آیا۔ اتفاقاً میری نظر اس کی جانب اٹھی اور میں اس کے شباب اور جمال سے مبہوت ہو کر رہ گیا میں سمجھ گیا کہ وہ، میری مثل، تھوسٹر کے ملازمین میں سے ہو گی کیوں کہ باہر سے کوئی آٹھ بجے سے پہلے تھوسٹر میں نہیں آتا۔ عم احمد اس سے پوچھ رہا تھا:

"آنسہ حلیمہ، کوئی نیا فلیٹ مل سکا؟"

اس نے شہد جیسی آواز میں جواب دیا:

"سونے کا ملنا زیادہ سہل ہو گا۔"

میں نے سحر زدہ ہو کر پوچھا:

"کیا آپ کو مکان کی تلاش ہے؟"

اس نے ایجاب میں سر کو جنبش دی اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ عم احمد نے ہمارا تعارف کرایا۔

"السید کرم یونس۔ یہ پراسپٹر ہیں۔ اور حلیمہ الکبش، تھوسٹر کی نئی کیشیئر۔"

میں نے حسبِ عادت بلا تکلف پوچھا:

"کیا شادی کر رہی ہو؟"

عم احمد نے اس کی طرف سے جواب دیا:

"یہ اپنی خالہ کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ وہ گھر بہت چھوٹا ہے اور آدمی زیادہ ہیں۔ اب چاہتی ہیں کہ ان کو علیحدہ چھوٹی سی جگہ رہنے کے لیے مل جائے۔ مگر کرایہ اور پگڑی کی رقم کی دشواری ہے۔"

"میرے پاس مکان ہے۔"

وہ پہلی مرتبہ التفات سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "واقعی؟"

"کافی بڑا مکان ہے اور دو منزلیں ہیں۔"

"ہر منزل پر علیحدہ مکان ہے؟"

"نہیں، وہ اس طرح تقسیم نہیں۔"

عم احمد نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ ایک منزل پر رہ سکتی ہے۔

"بالکل رہ سکتی ہے۔"

حلیمہ نے پوچھا:

"آپ کے گھر والوں کو تکلیف تو نہ ہو گی؟"

"میں اکیلا رہتا ہوں۔"

اس پر اس نے ابرو اُٹھا کر رخ پھیرا، اور مجھے اپنی نیت کے دفاع میں کہنا پڑا:

"تم اور تمہارے گھر والے بالکل سکون سے رہیں گے۔"

اس نے کوئی تبصرہ نہ کیا مگر عم احمد نے پوچھا:

"اور کرایہ کیا ہو گا؟"

"اس سے قبل کسی نے کرایے پر لیا نہیں، اور مجھ میں طمع نہیں۔"

"میں کرایہ دار لادوں؟" اس نے کہا۔

"نہیں، میں نہیں چاہتا۔ یہ میرا خاندانی مکان ہے اور اس کی اپنی یادیں ہیں۔ میں تو آپ کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ آخر ہم دونوں اسی تھوسٹر میں کام کرتے ہیں۔"

عم احمد برجل ہنسا۔

اس نے کہا:

"ہمیں سوچنے کا موقع دو۔"

آپا اٹھ کر رخصت ہوئی اور میں اس کی آرزو میں سلگنے لگا۔

***

اور اب یہ سامنے، کرسی پر جھکی ہوئی، بازو لپیٹے بیٹھی ہے۔ نگاہوں میں طیش۔ جبیں پر شکنوں کی گرہ، جیسے لعنت بھیجتی ہوئی... کیا اس تکرار کی زندگی سے تنہا رہنا بہتر نہ ہوتا؟ ماضی کی وہ جگمگاہٹ کہاں گئی؟ وہ جوششِ خمار؟ اس کی حنوط کردہ لاش دنیا کے کس کونے میں رکھی ہو گی؟

***

سُرخ کینے ٹیریا میں وہ مجھے جب بھی نظر آتی، میں خود سے کہتا، یہ لڑکی مجھے گرسنگی کی مانند اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ "میں اپنے پرانے مکان میں اس کی موجودگی کا تصور کرتا۔ مکان کیسے دوبارہ جوان ہو جائے گا، پُر حرارت بن جائے گا! میں تصور کرتا کہ وہ میری کہنہ خرابیوں کو شفا بخش دے گی۔

عم احمد برجل کیفے میں مجھے اور بھی ترغیب دیتا۔ ایک دن کہنے لگا:

"حلیمہ ماں کی طرف سے میری رشتے دار ہے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین ہے۔ الہلالی کے ہاں اسے میں نے ملازمت دلوائی ہے۔"

اسے بات جاری رکھنے پر اکسانے کے لیے میں نے کہا:

"بے شک، لڑکی تو بہترین ہے!"

"اس کی خالہ بھی طوبہ ہے۔ اور لڑکی بڑی نیک ہے .."

"اس میں کیا شک ہے!"

اس کا تبسم ایسا بہت افزا تھا کہ میری رغبت، جو پہلے ہی عروج پر تھی، اور بڑھ گئی۔ اپنے تخیل کا شکار ہو کر میں ایسے شیریں خوابوں میں ڈوب گیا جن کا تحمل کرتے رہنا دشوار تھا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا:

"یا عم احمد! میں صدقِ دل سے چاہتا ہوں کہ .."

میرے ادھورے جملے میں جو کچھ مضمر تھا وہ اسے سمجھ گیا اور خوش ہو کر بولا:

"بہت خوب! تمہارے لیے بہت چہار ہے گا۔"

"میری تنخواہ بہت کم ہے مگر میں ایک مکان کا مالک ہوں، اور اس زمانے میں یہ معمولی بات نہیں۔"

"سر پر چھت کا ہونا ظاہری عشرت سے بہتر ہے۔"

اور اسی ہفتے وہ مجھ سے یہ کہتے ہوئے ملا:

"مبارک ہو یا کرم!"

میں ایک ایسے دور میں داخل ہو گیا جہاں میں پرسکون شفاف بادلوں میں تیر رہا تھا... ایسے آنچل میں لپٹا ہوا تھا کہ جس کے ریشم میں نرم و ملائم خواب تھے اور شیریں ترین حقیقتیں تھیں۔ اس نے مجھے چڑے کی بنی ایک شیونگ کٹ تحفے میں دی تھی جس پر میں کسی بچے کی طرح خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے پر سرحان البلالی نے میری تنخواہ میں دو پاؤنڈ کا اضافہ کر دیا تھا۔ تھوسٹر کے لوگوں نے کیفے ٹیریا میں ہماری دعوت کی تھی اور ہمیں پھولوں اور مٹھائیوں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

***

یہ عورت سوچ کیا رہی ہے؟ ابھری ہوئی رگوں والے ہاتھ بے خیالی میں مکئی کے دانوں کی ڈھیری سے کھیل رہے ہیں۔ اس کے دماغ میں کوئی واحد خوش گوار خیال نہیں ہے۔ ہم اپنی جھنجھلاہٹ بس ایک دوسرے پر اتار سکتے ہیں۔ ہم اب بھی جیل کی کوٹھری ہی میں تو ہیں! صرف باہر پڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم کہیں اور ہیں ـــــ کوڑا جو ہوا سے منتشر ہو رہا ہے، جسے بے شمار بچوں کے پاؤں روندتے رہتے ہیں... یہ عورت سوچ کیا رہی ہے؟

***

شبِ رفاف؟ ہمسائے کی چھت پر مرغا بول رہا تھا۔ اس نے مجھے وہ حقیقت بتائی جس نے ہم دونوں کو یک لمحے کنویں میں دھکیل دیا جس میں تاریخ کے سوا ہر شے ڈوبنے لگی۔ میں حیران ہوا اور پھر اس طرح سُن ہو کر رہ گیا کہ اگر اس کی سسکیوں کی آواز سنائی نہ دے رہی ہوتی تو خود کو مُردہ سمجھتا۔ اس کی سسکیاں سب کچھ بتا رہی تھیں۔ اس نے روتے ہوئے کہا:

"میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"واقعی؟"

"مجھے چاہیے تھا کہ..."

"لیکن کیوں؟ ... بس اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر... میں تم سے محبت کرتی تھی..." اس نے دوسری مرتبہ کہا۔

میں اس کے راز سے واقف ہو گیا لیکن ابھی اُسے میرے رازوں کی خبر نہ تھی۔ اسے کیوں کر علم ہوتا کہ اس کے مرد کا بھی ایک ماضی ہے، ایک تاریخ ہے۔ یا یہ کہ وہ کیسی آزاد زندگی گزارتا رہا ہے۔ مجھے بہت زور کا دھچکا تو پہنچا تھا، مگر اس کے فریب نے مجھے زیادہ پریشان نہیں کیا تھا۔ اور وہ صدمہ بھی حواس بحال ہونے پر حماقت معلوم ہونے لگا۔ میں نے بہادری سے اعلان کیا:

"ماضی کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔"

اس نے بظاہر ممنونیت اور انکسار سے سر جھکا کر کہا تھا:

"یہ میرا نیا جنم ہے۔"

میں نے کسی منصف کی طرح کہا تھا، "احسن!"

مزید کچھ معلوم کرنے کی مجھے خواہش ہی نہ تھی۔ نہ میں ناراض تھا نہ خوش، مگر اس سے محبت کرتا تھا۔ میں اپنی نئی زندگی میں صادق حرارت کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

***

گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور ہم ایک دوسرے سے ایک کلمہ بھی نہیں کہتے۔ ہم سونگ پھلی کے خول میں دو دانوں کی طرح پڑے ہیں۔ ہر گاہک روزافزوں گرانی کا، اُبلتے ہوئے گٹروں کا، سرکاری راشن کی دکانوں پر تھکا دینے والی قطاروں کا شکوہ کرتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے تعزیت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ عورت کو دیکھ کر پوچھتے ہیں:

"یا ام عباس! اس قدر خاموش کیوں؟"

میرے سامنے کیا امید ہے؟ وہ کم سے کم عباس کی واپسی کی تو منتظر ہے۔

***

اس نے ازدواجی زندگی صادق حرارت کے ساتھ شروع کی تھی۔ اس نے مجھے اپنے حمل کے بارے میں بتایا تو میں شروع میں خوش نہیں ہوا تھا، مگر وہ ایک وقتی بات تھی۔
عباس جب بچہ تھا تو میں اس سے عشق کرتا تھا۔ اور پھر ہر شے بدل گئی۔ وہ طارق رمضان تھا جس نے ایک دن مجھ سے کہا تھا:
"ہیملٹ کا رول مشکل ہے۔ کیوں نہ اسے چائے کے فنجان میں گھول دیں۔"
یہی اس جنونی راستے پر پہلا قدم تھا۔ کسی شے کی پروا نہ کرنے والا شخص دھوکا کھا گیا۔ وقت کے ساتھ حیات کے سارے چشمے خشک ہو گئے اور مسرت کا گلا گھٹ گیا۔ حلیمہ کہتی:
"کیا تم یہی چاہتے ہو کہ ساری کمائی اس زہر میں اُڑا دو اور میں زندگی کا تنہا مقابلہ کروں؟"
اس کی آواز اب مجھے اُبلتے ہوئے گٹر کی طرح قبیح لگنے لگی تھی۔ ہم دو بے برگ درختوں کی طرح ہو گئے تھے۔ بیت القدیم کے دروازے پر بھوک دستک دے رہی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے یہ کہتے ہوئے اطمینان محسوس کیا تھا:
"انجام بخیر ہو گا!"
کیا کہہ رہے ہو؟
"شرقی کمرے کو ہم تفریح گاہ بنا دیں گے۔"
"کیوں؟"
"وہ لوگ ہر رات آئیں گے۔ اب غربت کی فکر نہیں رہے گی۔"
اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں خیر نہ تھا۔ اس لیے میں نے کہا:
الہلالی، العبرودی، شلبی، اسماعیل وغیرہ... تم جانتی ہی ہو۔ لیکن کوئی ایسا انتظام کرنا پڑے گا کہ یہ ہر روز آئیں۔"
"اس میں بہت خطرہ ہے۔"
"بہت ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے۔ منافع تصور سے بعید ہو گا۔"
"کیا یہ کافی نہیں کہ طارق اور تم یہاں مقیم ہیں؟ ہم انتہائی پستی میں گر رہے ہیں۔"
"ہم بلندیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر تو اور تیرا بیٹا خاموش رہیں تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

"میرا بیٹا فرشتہ ہے۔ میں اس کی جانب سے فکر مند ہوں۔"

"لعنت تیرے بیٹے پر... باپ کی مخالفت کر کے تو دیکھے! تو اپنے احمقانہ خیالوں سے اسے مت بگاڑ!"

وہ ماں گئی مگر ناخوشی کے ساتھ۔ کیا وہ اپنی شبِ زفاف بھول گئی تھی؟ عجیب بات ہے، لوگ ہر وقت حکومت کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور خود اپنے اوپر قیود عائد کرتے رہتے ہیں۔

***

لو، وہ اپنی مہم سے واپس آ رہی ہے۔ اگر گھر میں اس کی خدمت کی ضرورت نہ ہوتی تو میں دعا مانگتا کہ وہ کبھی نہ پلٹے۔ اس کے چہرے پر مایوسی ہے۔ میں وجہ نہیں پوچھتا۔ اس نے خود ہی کہا:

"فلیٹ میں ابھی تک تالا لگا ہوا ہے۔"

ایک گاہک کے آنے پر میں خوش ہوا کہ اس سے چھٹکارا نصیب ہوا۔ مگر اس کے جاتے ہی وہ مجھ پر پھنکاری:

"کچھ کرو!"

میرا ذہن اس کے ساتھ نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حکومت اس بات پر ہمیں جیل میں کیوں کر ڈال سکتی جو وہ خود کھلے بندوں کرتی ہے؟ کیا حکومت خود قمار خانے نہیں چلاتی؟ کیا حکومت نے اپنے مہمانوں کے لیے قحبہ خانے قائم نہیں کر رکھے؟ مجھے اس بات پر تعجب نہیں۔ مجھے تو صرف اس ظالمانہ منافقت پر طیش ہے۔ عورت زیادہ اونچی آواز میں کہتی ہے:

"ہدایت کار کے پاس دوبارہ جاؤ!"

میں نے طنزیہ کہا:

"تم خود چلی جاؤ نا! تم اس سے زیادہ قریب رہی ہو!"

"اللہ تیری ماں پر رحم کرے،" اس نے نفرت سے کہا۔

کم سے کم وہ تیری طرح منافق نہیں تھی۔"

اس نے کاندھے جھٹکے۔ پھر آہ بھر کر کہا:

"تمہیں اپنے بیٹے سے محبت نہیں... تم نے کبھی اس سے محبت نہیں کی۔"

"میں منافقوں سے محبت نہیں کرتا۔ مگر اس سے کب انکار ہے کہ اس نے ہماری مدد کی تھی۔"

وہ مجھ سے رخ پھیر کر بیٹھ گئی اور بڑبڑائی:

"اے عباس! تو کہاں ہے؟"

***

سرحان الہلالی کہاں ہے؟ وہ اٹھ کر باہر گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا۔ یہ ممکن نہیں کہ غسل خانے میں سو جائے۔ جوا زوروں پر چل رہا تھا۔ ہر بازی کے بعد میں اپنا حصہ سمیٹ رہا تھا۔ حلیمہ کہاں ہے؟ کیا اب حلیمہ کا شراب پیش کرنے کا وقت نہیں؟ کہاں گئی؟ میں نے پوچھا:

"ہدایت کار کہاں ہے؟"

سب تاش کے پتوں میں منہمک تھے۔ مجھے کسی نے جواب نہ دیا۔ کیا طارق نے مجھے تمسخر سے دیکھا تھا؟ حلیمہ کو اب شراب لے کر آنا چاہیے۔

"حلیمہ!"

کوئی جواب نہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر نہیں جا سکتا، ورنہ میری چوری ہو جائے گی۔

حلیمہ! میں نے زور سے آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی۔

"کہاں تھیں تم؟"

"میری آنکھ لگ گئی تھی۔"

"کچھ پینے کے لیے پیش کرو۔ میرے آنے تک میری جگہ سنبھالنا۔"

میں قمار بازی کے کمرے سے نکلا۔ سیڑھیوں کے نیچے عباس کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا:

"اس وقت تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی...."
"مسٹر جان الہلال کو تو نہیں دیکھا؟"
"وہ چلا گیا۔"
"کس وقت؟"
"تھوڑی دیر پہلے.... مجھے ٹھیک سے وقت معلوم نہیں۔"
"تمھاری ماں اس سے ملی تھی؟"
"معلوم نہیں۔"

وہ کیوں چلا گیا؟ ... میرا بیٹا مجھے ایسی خاموش، مایوس نظروں سے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کئی باتیں مجھے عجیب لگ رہی ہیں۔ میں اور کچھ بھی سہی مگر غافل نہیں ہوں۔ جب گھر میں سگار کے ٹوٹوں اور خالی گلاسوں کے سوا کچھ بھی نہ رہ گیا تو میں نے عورت پر ایک طویل، الزام لگاتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے سامنا کرنے پر مجبور کیا۔

"میرے پیٹھ پیچھے کیا ہوتا رہا ہے؟"
حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے میرے سوال کو نظرانداز کر دیا۔
"کیا عباس نے دیکھا تھا؟"
اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی خاموشی نے میرے غیظ کو بھڑکایا۔ میں نے کہا:
"اسی نے تمھیں ملازمت دی تھی۔"
حلیمہ نے غصے سے زمین پر پیر پٹخے۔ میں نے تمسخر سے کہا:
"ہر شے کی ایک قیمت ہوتی ہے، میں تو اتنا جانتا ہوں۔ ویسے تم اس قابل نہیں ہو کہ تم پر حسد کیا جائے۔"
پیر پٹختے ہوئے، کمرے میں جاتے جاتے اس نے کہا:
"تو کیڑوں کی طرح احقر ہے!"
میں نے قہقہہ لگا کر کہا:
"بس ایک کیڑے سے ذرا کم!"

Scanned with CamScanner

***

وہ دوبارہ باہر سے واپس آئی ہے۔ اے خدا، اس کے عذاب اور جنون کو اور بھی بڑھ۔
دکان میں میرے مقابل کھڑے ہو کر اس نے کہا:
"فواد شلبی بالکل مطمئن ہے۔"
"کیا ملاقات کی تھی؟"
"اداکاروں کے قہوہ خانے میں۔"
"اسے کیوں کر علم ہوا؟"
"اس نے کہا یہ مصنف کی عجیب سی خواہش ہے۔ وہ مناسب وقت پر ظاہر ہو جائے گا۔ اور وہ نیا ڈراما بھی لکھ رہا ہے۔"
"ایک بدحال مجنونہ سے تسلی کے دو حرف کہہ دیے!"
وہ کرسی گھسیٹ کر دکان کے آخری کونے میں جا بیٹھی اور آپ ہی آپ کہنے لگی:
"اللہ کی رضا ہوتی تو میرا نصیب اُجلا ہوتا۔ لیکن اس نے مجھے ایک سفلہ آدمی کے حوالے کر دیا۔"
میں نے تمسخر سے کہا:
"یہی جزا ہے رنڈی کے ساتھ شادی کرنے والوں کی۔"
"اللہ تیری ماں پر رحم کرے۔ عباس واپس آجائے تو میں اسی کے ساتھ رہوں گی۔"
"تو عباس مجھ پر رحمت کر کے آجائے!"
"کون تصور کر سکتا ہے کہ تم اس کے باپ ہو!"
"جو لڑکا اپنی زوجہ کو قتل کر دے اور والدین کو جیل بھجوا دے وہ میرا بیٹا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے!"
"وہ فرشتہ ہے، اور میری تربیت کی وجہ سے۔"
میری تمنا ہے کہ وہ بول بول کر اپنے آپ کو ایک شکنجے میں کس لے۔ اس پولیس والے نے میری گردن پر جو کرائے کا باتھ مارا تھا... وہ گھونسا جس سے میری ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

اس چھاپے نے کسی زلزلے کی مانند سب کچھ ڈھا دیا تھا۔ حتیٰ کہ سرحان البطلی بھی اس قدر خوف زدہ تھا کہ کھڑا تو آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اور وہ سارا مال جس کے لیے ہم نے اپنا سودا کر لیا تھا۔۔ تمام ضبط! یا الہی! وہ کیسی قیامت تھی!

***

راہداری میں یہ کیسا شیطان کا رقص ہو رہا ہے؟ کمرے سے نکل کر دیکھا تو طارق اور عباس گتھم گتھا ہیں۔ حلیمہ چیخ رہی ہے۔ میں نے چلا کر پوچھا:

"یہ کیا ہنگامہ ہے؟"

طارق چلایا:

"کیا حماقت ہے! اماں کا لاڈلا تم سے شادی کرنے چلا ہے!"

ہر بات مضحکہ خیز لگ رہی تھی ــــ بالکل عجیب۔ ابھی ابھی لی ہوئی نشہ آور دوا کے چڑھتے خمار سے عجیب طرح متصادم... حلیمہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی:

"اے مجنون! یہ تجھ سے دس سال عمر میں بڑی ہے!"

طارق اس قدر غیظ سے چیخ پکار کر رہا تھا کہ اس کا تھوک ہر سمت اُڑ رہا تھا۔ حلیمہ نے زور سے کہا:

"اب تم معاملے کو اور بھی مت الجھاؤ۔"

طارق نے چیخ کر کہا، "میں اس گھر کو اور اس کے تمام رہنے والوں کو برباد کر دوں گا!"

جو کچھ غصہ مجھے آ سکتا تھا وہ دب چکا تھا۔ میں صرف حقارت اور لاتعلقی محسوس کر سکتا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے حلیمہ نے طارق سے کہا:

"اپنے کپڑے اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میرے پیٹھ پیچھے... " وہ چیخا، "اس ناپاک گھر میں..."

میں نے اتنی پُرسکون آواز میں کہا کہ اس شور و شغب میں اپنی آواز مجھے خود عجیب لگی:

"یہ تیرے ہی وجود کے باعث تو ناپاک ہے!"

Scanned with CamScanner

اس نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ مگر حلیمہ نے عباس سے کہا:

"جو یہ کہہ رہا ہے کیا سچ ہے؟"

ماں کا لاڈلا اس پر کہتا ہے:

"ہم نے طے کر لیا ہے کہ..."

میں نے نہایت نخوت اور لاتعلقی سے پوچھا:

"ہم سے مشورہ کرنے کی زحمت کیوں نہ فرمائی؟"

کوئی جواب نہ پا کر میں نے پھر کہا:

"کیا ایک تنخواہ گھر اور میاں بیوی کے لیے کافی ہو گی؟"

"میں تھوسٹر میں آپ کی جگہ نوکری کر لوں گا۔"

"مصنف سے پراسپٹر؟"

"ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔"

حلیمہ نے تشنج کے عالم میں کہا:

"میرے بیٹے کو جنون ہو گیا ہے۔" پھر وہ طارق سے مخاطب ہوئی، "اور اب تم بھی دیوانے پن کی باتیں مت کرو!"

وہ دھمکیاں دینے لگا۔ اس پر حلیمہ نے کہا:

"اس گھر سے نکل جاؤ!"

جاتے جاتے وہ چلایا:

"میں قیامت تک نہیں جاؤں گا!"

طارق رخصت ہوتا ہے۔ اب مکان میں یہ عظیم خاندان باقی بچتا ہے۔ میں نہایت کینے سے لطف لیتے ہوئے یک سے دوسرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حلیمہ نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"اس کا تو کوئی تعارف ہی نہیں ماسوا اس کے کہ فلاں یا فلاں کی داشتہ ہے..."

میں نے قہقہہ لگا کر کہا:

"ایسی باتیں تیری ماں خوب جانتی ہے۔ غور سے سُن اور سمجھ!"

حلیمہ التماس کرنے لگی:

"تمہارا باپ، تمہیں علم ہے، کسی کار کا نہیں۔ تم ہی ہماری واحد امید ہے..."

عباس نے کہا:

"ہم نئی زندگی شروع کر رہے ہیں..."

میں نے ہنس کر پوچھا:

"اتنے عرصے تم ہمیں مثالی ہونے کا دھوکا کیوں دیتے رہے؟"

عباس باہر چلا گیا اور حلیمہ آہ و بکا کرنے لگی۔ میں دل کی گہرائیوں سے عباس کے چلے جانے کے خیال سے خوش تھا۔ اس طرح اس کے اور اس کی سوتیلی ماں کے مابین میرے خلاف بنے ہوئے متحدہ محاذ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ ہر بات پر معترض ہی تو رہتا تھا۔ میں اس سے عاجز آ چکا تھا۔ یہ چلا جائے تو مکان پُرامن اور بے عداوت ہو جائے گا۔ کبھی کبھی مجھے اس سے خوف تک محسوس ہوتا تھا۔ میرے لیے وہ ایسے الفاظ اور اعمال کی تجسیم تھا جن کے لیے میرے دل میں حقارت اور تنفر کے سوا کچھ نہ تھا۔ حلیمہ اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔

"میں اکیلی ہوں... اکیلی..."

"اکیلی؟ تصنع ترک کر! تو مجھ سے کیوں کر مختلف ہے؟ ایک ہی ہماری جڑ... ایک ہی زندگی... ایک ہی منزلِ مقصود..."

اس نے مجھے شدید کراہت اور حقارت بھری نظروں سے گھورا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میرا تمسخرانہ قہقہہ اس کا تعاقب کرتا رہا۔

***

میں نے مونگ پھلیوں، تربوز کے بیجوں اور مکئی کے دانوں پر نظر ڈالی جو کاؤنٹر کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ڈبیریوں میں پڑے تھے۔ کس قسم کی زندگی ہے یہ جس میں کوئی سرور نہیں... یہ دھویں اور کراہت بھرا ماحول... اس کا بیٹا واپس آ جائے تو اسے نئی زندگی دینے کے لیے کافی ہو گا۔

Scanned with CamScanner

***

اُس دن میں بڑا بشاش بشاش محسوس کر رہا تھا، جب کہ حلیمہ پژمردگی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سرحان الہلالی پوچھ رہا تھا:

"طارق اور تحیہ کہاں ہیں؟"

سالم العجرودی نے کہا:

"کھلاڑی کم پڑ رہے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا:

مزے دار خبریں ہیں، سرحان بے! میرے مجنون بیٹے نے تحیہ سے شادی کر لی ہے۔

سیر پر بیٹھے سب لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اسماعیل نے کہا:

ظاہر ہو کہ تمہارا بیٹا حقیقت میں فنکار ہے۔

اور الہلالی نے کہا، وہ کم سن لڑکا!

شبلی بولا، اس موسم کی یادگار شادی!

اسماعیل نے کہا:

تو اب طارق تو مجنونِ لیلیٰ کی طرح صحرا میں پھر رہا ہوگا۔

سب لوگ دوبارہ ہنس پڑے۔

سرحان نے حلیمہ کو غور سے دیکھا اور کہا:

مگر حلیمہ اس نغمہ شادی میں کیوں شریک نہیں؟

حلیمہ نے جام تیار کرتے ہوئے کہا:

"حلیمہ ماتم میں ہے!"

سالم العجرودی نے کہا:

کون جانے اسے وہ مسرت مل گئی ہو جو ہمارے ہاتھ نہیں آتی۔

میں زور سے ہنسا۔ حلیمہ نے تلخی سے کہا:

[illegible]

[illegible]

[illegible] گے گا؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible] کے بغیر، سکون و شفقت سے کاروبار کر رہا تھا۔

* * *

[illegible]

[illegible]

Scanned with CamScanner

[illegible]

[illegible] کہیں تمہیں [illegible]

[illegible] واپسی کا سفر [illegible] تمہیں میرے وجود میں ایک [illegible] گوشہ سے تو اس کھنڈر پہ [illegible]

[illegible] تمہیں وہ [illegible] جواب موجود نہیں [illegible] جواب نہیں رہی۔

[illegible]

[illegible] آنکھوں میں [illegible] کیا معلوم [illegible]؟

[illegible]

[illegible]

تمہیں [illegible] دعوت ہی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]؟

[illegible]؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کون کہتا ہے؟

میرا دل کہتا ہے۔

***

[illegible]

[illegible]

Scanned with CamScanner

علیمہ نے کہا:

"لیکن مجھے مصنف نظر نہیں آ رہا۔"

سرحان السلالی نے کہا:

"وہ نہیں آیا، لیکن میں نے تمہیں کچھ اطلاعات دے دی ہیں۔"

تو وہ سرحان السلالی سے مل کر اطلاعات بھی حاصل کر چکی ہے؟ ہم وقت سے پہلے آ گئے تھے، اس لیے عم احمد برجل سے ملنے چلے گئے۔ اس نے تھیٹر کے خرچ پر ہمیں چائے کا قہوہ اور سونٹروچ پیش کیے۔ پھر ہنس کر بولا:

"ماضی کی طرح!"

ہم نے نہ کچھ کہا نہ مسکرائے۔ پردہ اٹھنے کے مناسب وقت پر ہم صف اول میں بیٹھ گئے۔ تھیٹر کامل بھرا ہوا تھا۔ علیمہ نے کہا:

"ڈراما کامیاب ہوا ہے۔"

میں نے جواب دیا:

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کم سے کم ایک ہفتہ گزر لے۔"

بظاہر لاتعلقی کے باوجود میرے اعصاب کشیدہ ہیں۔ آہ! اس تھیٹر کا میرے لیے کیا مطلب ہو سکتا ہے، جب کہ میرے لیے حیات ہی کوئی معنی نہیں رکھتی... پردہ اٹھ رہا ہے، وہ رہا ہمارا گھر... ہمارا ہی گھر ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ یہ المجرودی کا فیصلہ ہوگا یا عباس کا؟ باپ، ماں اور بیٹا... قمار و شراب کا اڈا... اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خیانت اور جرم سے بہت بڑھ کر ہے۔ ماں سے قابو رنڈی ہے ___ مدایت کار، پروڈیوسر، ناقد اور طارق رمضان کے ساتھ اس کے تعلقات یکے بعد دیگرے تواتر سے سامنے آ رہے ہیں۔ میں فوراً علیمہ پر نظر ڈالتا ہوں۔ شرم اور غصے سے اس کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔ کیا جہنم کا سماں ہے! اپنے بارے میں اپنے بیٹے کی رائے کا لطف اٹھا! اپنی ماں اور اپنے باپ کے بارے میں اس کے خیالات واضح ہیں۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ اس کے پرسکون سر میں ایسے خیالات پوشیدہ ہیں؟ مگر یہ بہت اچھا ہے کہ وہ اپنی ماں کے بارے میں اس طرح سوچتا تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ اس کی رائے کا علم ہو گیا۔ یہ ڈراما اس کا مجھ سے انتقام ہے ___ جو کچھ میں ہوں، اس کی سزا۔ مگر فضیحت کے اس لمحے میں ماں بیٹے پر ایک عجب فتح مندی کا

احساس ہو رہا ہے، جو میرے بدترین دشمن ہیں۔ وہ مجھے نہیں سمجھتا۔ وہ مجھے اس طرح پیش کر رہا ہے گویا میں پستی کی طرف گر گیا ___ حقیقت کا سامنا نہ کرتے ہوئے پست ہو گیا۔ میں یہ نہیں ہوں اے علی! میرا کوئی مرتبہ ہی نہ تھا جس سے گرتا۔ میں تو آزاد و بے قیود ہی پڑا ہوا تھا، منافقوں کا مشاہدہ کرتا اور ان سے سبق سیکھتا ہوا۔ یہی بات ہے جو تو نہیں سمجھ سکتا۔ اور تیری کامیابی کا راز یہی ہے کہ تو دیکھنے والوں کے کذب اور منافقت کے جذبات کو اُبھار رہا ہے، ان کے ساتھ تملق سے پیش آ رہا ہے۔ میں تجھ پر اور تیرے ابدی ابہام پر تھوکتا ہوں۔

تالیوں کی زوردار گونج سے تھیٹر کی چھت اڑی جا رہی ہے۔

آخری پردہ گرنے کے بعد قدیم رسم کے مطابق کیفے ٹیریا میں پارٹی دی جا رہی تھی۔ ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ میں نے حلیمہ سے پوچھا:

"کیا ہم بھی شریک ہوں؟"

"کیوں۔ شریک ہوں؟" اس نے کہا۔

اس سے کچھ حاصل نہیں حلیمہ، کہ تو ان باتوں سے بالا ہے۔ تیرے پاس وہ چیزیں نہیں جو میرے پاس ہیں۔ وہ کہتی ہے:

"آخر میں خودکشی کی ضرورت نہیں تھی۔"

میں نے غیظ میں کہا:

"ایک قاتل کا اور کیا انجام ہوتا؟"

"اس سے ناظرین کی بڑی ہمدردی ملی۔"

سرحان الہلالی بلند آواز میں اعلان کر رہا ہے:

"میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ ڈراما ناکام نہیں ہو گا۔"

سب لوگ جام ٹکرا رہے ہیں اور پی رہے ہیں۔

سالم العجرودی نے کہا، "ڈراما پُر تشدد تو ہے لیکن بے شک نہایت موثر!"

فؤاد شلبی کہتا ہے، "اس ڈرامے سے عوام کو اپنے روزمرہ مصائب کا خیال آتا ہے۔ مگر یہ سب بہت یاس انگیز..."

الہلالی ہنس کر بولا "یاس انگیز؟"

[illegible] نئی نسل [illegible] ہیں۔ لوگوں کی تمام [illegible] ایک [illegible] تھی۔

[illegible] ہو، [illegible] دیکھو۔ السلالی نے کہا۔ یہ تو نئی نسل سے [illegible] رابطہ [illegible] کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

"نئی نسل؟ یعنی اس دور کی ناجائز اولاد؟"

السلالی قہقہہ لگا کر بولا، اللہ ہر حرامی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے! پھر طارق رمضان سے مخاطب ہو کر اس نے اپنا جام بلند کیا۔

ایک عظیم اداکار کی دریافت کے نام ــــ جس کی عمر پچاس سے اوپر ہے!"

اور جو تیل کے کنوؤں کی دریافت سے زیادہ اہم ہے! فواد شلبی نے کہا۔

السلالی ہماری طرف مڑا، مگر میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے گلاس بلند کرتے ہوئے کہا:

"غیر حاضر مصنف کے نام!"

تحسین و آفرین کی صدائیں طوفانِ مے نوشی میں منقلب ہو گئیں ــــ سب تھیٹر کے حساب میں! میں اس جزئیات میں گھل مل رہا ہوں، ہر مرد، ہر عورت کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کے تدبر سے [illegible] حاصل کر رہا ہوں۔ پھر جمیل لفظ ہمارے نصیب میں کیوں آئی؟ اے فاسق احباب [illegible] میرے نام پر جام ٹکراؤ! میں تمہاری صادق علامت ہوں۔

ہم اپنے بیت القدیمہ میں فجر کے وقت پہنچے۔ سونے کی چنداں خواہش نہ تھی۔ ہم نے بڑے کمرے کے آتش دان میں کوئلے سلگائے۔ کمرے کی بالائی دیوار پر ایک اسپولی [illegible] آویزاں تھی۔ میں اور علیمہ بیٹھ گئے، جیسے باہمی نفرت کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے ہم ساتھ رہنا چاہتے ہوں۔ گفتگو کا آغاز ہم دونوں میں سے کون کرے گا؟ ہمارے لیے ایک دوسرے سے باتیں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ ہم ہر وقت اپنے اپنے دفاع پر تیار رہتے ہیں۔

میں نے پوچھا:

"ڈراما پسند آیا؟"

"بے حد [illegible]"

"اور ڈرامے کا موضوع؟"

[illegible] سوال نے [illegible] اس نے جس سے پوری عمر تھیٹر میں گزار دی۔

[illegible] تو ہمیشہ دھوکا ہی دیتے ہیں؟ [illegible] سے مطلب کے بارے میں [illegible]

جانا تھا

میں نے اعتماد سے سوچ تو نہیں [illegible]۔

"اس میں حقیقت سے بڑھ کر حقائق ہیں۔

"مثال کے طور پر... اس میں میرا جو کردار دکھایا گیا ہے اس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں۔"

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ناراض ہوئی مگر پھر بھی کہے گئی:

"یہ تو ایک تصوراتی تخلیق ہے۔"

"اور سب کردار بالکل ایسے جیسا ہم انھیں اصل زندگی میں جانتے ہیں؟"

مصنف آزاد ہوتا ہے، حقیقت میں تخیل کہاں شامل کرے کہاں نہ کرے... اور اس پلاٹ میں تو بالکل نئی باتیں ہیں۔"

اس نے تمہارا کردار ایسا کیوں دکھایا؟

یہ تو وہ جانے۔

میرا خیال تھا وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تمہارا احترام کرتا ہے۔

اس نے یقین سے کہا۔

اس میں کیا شک ہے۔

لیکن تمہاری جھنجھلاہٹ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔

"میں جانتی ہوں تو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

تم نے طارق کے ساتھ بھی [illegible] انہیں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی اتنا گر سکتا ہے

اپنے خیالوں کی غلاظت مہربانی کر کے میرے سر پر مت [illegible]۔

یہ تمہاری تحریر کی چھپی ہوئی [illegible] تو ہم زیادہ [illegible]۔

و [illegible] سچ [illegible] ہے کہ ڈرامے میں تمہیں [illegible] سے بہت بہتر دکھایا گیا ہے۔ اس سے [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] تخیل استعمال کیا۔

اس بات پر [illegible] زور سے [illegible] کہنے لگی:

"آہستہ! جو کی صلوٰۃ سے لوٹنے والے سنیں گے!"

"تو کیا ہو گا؟ یہ تمہاری عجیب و غریب اولاد... ماں باپ کو جیل بھجوا دیا۔"

"تمہیں کسی کی دیانت کا کیسے یقین آ سکتا ہے؟ تمہارا تو اپنا ہی طریقہ ہے زندگی گزارنے کا!"

"مگر وہ اس قدر مثالی بنتا تھا۔ اسی بات پر میرا خون کھولتا تھا۔"

"وہ بہت اچھا لڑکا ہے — ایک مشہور مصنف... میرا بیٹا!"

بظاہر تو یہ صورتِ حال سے خوش نظر آ رہی ہے۔ میں نے کہا:

"میں تو بس اس کی سخاکی کی داد دیتا ہوں۔"

"وہ واپس آ جائے۔ میں اس لعین گھر کو چھوڑ کر اسی کے ساتھ رہوں گی۔"

"جس کا ہر کمرہ ہمارے ماضی کے کارناموں کا شاہد ہے؟"

وہ چلی گئی۔ میں اکیلا بیٹھا آتش دان پر ہاتھ تاپتا رہا۔ میں اپنے باپ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ بھی ان منافقین میں سے ایک تھا؟ وہ جلد قصۂ اجل بن گیا، اور میری ماں فاسقہ ہو گئی۔ میں نے اسی کے سانچے میں پرورش پائی، شیطان کے سوتگوں کے سامنے ہیں۔ لیکن عباس! تُو ایک کالی بھیڑ ہے۔ میں کس قدر بیزار ہوں — لمبی گردن والی بوتل میں بند جن کی طرح جو جنبش نہ کر پا رہا ہو۔

***

شفقت و اہتمام سے میں ڈرامے کی کامیابی کا مشاہدہ کرتا رہا — اس توقع کے ساتھ کہ مصنف کوئی نیا ڈراما لے کر نمودار ہو جائے گا، اور یہ کہ اس کی کامیابی میری اکتا دینے والی زندگی کا راستا بدل دے گی۔ عباس کی خیر خبر پوچھنے میں اکثر تھیٹر جاتا رہتا ہوں۔ ایک صبح میرے داخل ہوتے ہی کرم احمد برجل دوڑتا ہوا آیا اور مجھے خالی کیفے ٹیریا میں لے گیا۔ اس کے چہرے پر قلق دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی بری خبر ہے۔ وہ کہنے لگا:

"کرم، میں تمہارے پاس آنے ہی والا تھا..."

Scanned with CamScanner

میں نے پوچھا:

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"عباس..."

"کیا ہوا اُسے؟ جلدی بولو یا عم احمد..."

"وہ حلوان والے ہاسٹل سے غائب ہو گیا ہے اور پیچھے ایک عجیب پیغام چھوڑ گیا ہے..."

"کیا پیغام؟... بتانا نہیں چاہتے؟"

"کہ وہ... خودکشی کر رہا ہے..."

میرا دل ڈوب گیا ـــ کسی بھی انسان کے دل کی طرح۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے کہا:

"کیا لاش مل گئی؟"

"نہیں،" وہ حُزن سے بولا۔ "مگر تلاش جاری ہے۔"

"آہ! شاید... کون جانے... لیکن اگر خودکشی کرنے والا نہ ہوتا تو یہ پیغام کیوں چھوڑتا؟"

الفاظ میرے منہ سے نکل رہے ہیں مگر خیالات منتشر ہیں۔

عم احمد نے کہا، جیسے یہ باب اس کے لیے بند ہو گیا:

"تمھارا رب تم پر رحم کرے!"

"مجھے حلوان جانا چاہیے۔"

"سُرحان الہلالی پہلے ہی جا چکے ہیں۔"

ایک پُرآلام، لاحاصل سفر... عباس غائب ہو چکا ہے ـــ پہلے ایک بار اور اب دوسری بار۔ خودکشی کا حتمی ثبوت صرف لاش سے مل سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے خودکشی کا پکا ارادہ نہ کر لیا ہوتا تو کیا وہ خط لکھتا؟

اور الہلالی سوچتے ہوئے کہتا ہے:

"اگر وہ سچ مچ خودکشی کرنا چاہتا تھا تو اپنے کمرے ہی میں کیوں نہ کر لی؟"

"تمھیں اس کے ارادے کی سنجیدگی پر شک ہے؟"

"ہاں ـــ مجھے شک ہے!"

میں شام سے پہلے گھر نہیں لوٹا۔ حسیبہ گھر میں نہیں تھی۔ [illegible] وہ حسیبہ سے [illegible]
[illegible] کی وجہ معلوم کرنے حسیبہ گئی ہوئی۔ شام دکان بند کر کے [illegible] بیٹھ کر اس
کا انتظار کرنے لگا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنے پر وہ آئی۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی تھی۔ کچھ لمحے
ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اس نے چیخ ماری۔

نہیں ۔وہ چاہے بھی تو خودکشی نہیں کرے گا... نہیں کر سکتا وہ خودکشی.. یہ ناممکن ہے!

صوفے پر گرتے ہوئے وہ اپنے رخساروں پر زور زور سے طمانچے مار کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

[illegible]

گابریل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

(آج، شمارہ ۷، بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تحریر اور ایک اہم مضمون
"کولمبیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مصری نقادوں کے مضامین
ادبی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سعدی مانشن، بلاک ۱۵، گلستان جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات　　قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری پلازہ، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نفیسہ شاہ

قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری پلازہ، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

VISA

بین الاقوامی سطح پر
اردو کے قارئین کے لئے

خوشخبری

اردو زبان کی تاریخ میں پہلی بار
اب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو زبان کے شائقین
اپنی من پسند علمی ادبی اور اسلامی کتابیں
فضلی بک سپر مارکیٹ سے براہ راست اپنے پتے پر حاصل کر سکتے ہیں۔

طریقہ کار نہایت آسان: آپ مندرجہ ذیل کسی بھی رابطے کے ذریعہ ہمیں مطلوبہ کتب کے بارے میں لکھیے ہم آپ کو فوری طور پر کتب کی مجموعی رقم اور ان کے متعلق ڈاک کے خرچ سے مجموعی قیمت حاصل کر کے آپ کو ارسال کر دیں گے۔ آپ کی رقم ملتے ہی کتب ارسال کر دی جائیں گی۔

Fazlee
BOOK SUPERMARKET
RETAILERS • WHOLESALERS • DISTRIBUTORS

رابطہ کیجئے بذریعہ انٹرنیٹ : fazlee@tarique.khi.sdnpk.undp.org

رابطہ کیجئے بذریعہ فیکس : 0092-21-2633887

رابطہ کیجئے بذریعہ فون : 0092-21-2633853

رابطہ کیجئے بذریعہ خط : 4, Mama Parsi Building, Urdu Bazar, Karachi-74200 Pakistan.

The Annual of Urdu Studies

Editor:
Muhammad Umar Memon

Associate Editor:
G. A. Chaussee

Published by:
University of Wisconsin-Madison
Center for South Asia
1220 Linden Drive
Madison, WI 53706, USA.
Fax: 608/265-3538
Internet: mumemon@facstaff.wisc.edu
chaussee@students.wisc.edu

Number 11 (1996)
is available in Pakistan

Special price : Rs 500

Please call or write to:
aaj ki kitabain
A-16, Safari Heights
Block 15, Gulistan-e-Jauhar,
Karachi 75290.
Phone: 8113474
e-mail: aai@biruni.erum.com.pk

Scanned with CamScanner

قیمت: ۷۵ روپے

آج کی کتابیں
سی-۱۷، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰